

محی الدین نواب کے تصانیف دوہرا کرنے والوں کی دانتان

اجازت

محی الدین نواب

محی الدین نواب کے نشر قلم سے دو محبت کرنے والوں کی داستان

اجازت

محی الدین نواب

ایف آئی پی بلیشرز اینڈ ڈسٹریبیوٹرز

چوک میوہ، ہسپتال نسبت روڈ لاہور
فون: ۷۷۳۸۵۳

اعتماد اشاعت۔ محمد سلیم دھانی

بار اول۔ ۱۹۹۹ء

مطبع۔ یو این ڈی پرنٹرز لاہور

قیمت۔ ۱۵۰/- روپے

دیباچہ

بھلے وقتوں کی بات ہے جب ایک ملک سے کسی دوسرے ملک میں جانے کے لئے فاس تردد کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ لوگ آسانی سے ایک سے دوسرے ملک آ سکتے تھے۔ وہ تجارت بھی کرتے اور محنت مزدوری بھی۔ انسانی آبادی کے پھیلنے کے نتیجے میں مسائل میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ترقی پذیر ممالک میں روزگار کے مواقع کم اور ملوث انتہائی گھیل ہونے کی وجہ سے ان ممالک کے لوگوں نے ترقی یافتہ ممالک کا رخ کرنا شروع کر دیا جہاں روزگار کے مواقع وافر اور معاوضے بھی پرکشش تھے۔ یہ رجحان اتنا بھارتیہ دیکھو بیرون ملک جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کی اس یلغار پر ہونے کے لئے ترقی یافتہ ممالک نے اپنے امیگریشن قوانین میں سختیاں کر کے اس ہمارے آگے بندھا دینے کی کوشش کی۔

یہاں سے لوگوں نے انسانی فطرت کے عین مطابق چور و دواڑے ڈھونڈنے شروع کر دیئے اور غیر قانونی طریقوں سے ان ممالک میں داخل ہونے لگے اور چوری چھپے وہاں محنت مزدوری کرنے لگے۔ غیر قانونی ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کے لئے مسائل بنی مسائل کھڑے ہو گئے۔

محمد الدین نواب نے ان ہی تارکین وطن کے مسائل کے پس منظر میں یہ خوبصورت کہانی لکھی ہے جو روزی کی تلاش میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر سات سمندر پار جاتے ہیں۔ ہوں تو نواب صاحب نے معاشرے کے ہر موضوع پر لکھا ہے اور خوب لکھا ہے لیکن امیگریشن قوانین اور غیر قانونی تارکین وطن کے بارے میں جس انداز سے لکھا ہے یہ انہی کا خاصا ہے۔ اپنی روایت کے مطابق اپنے نثر قلم سے کٹ دار تحریر لکھی ہے۔

اشاکش ۱۔

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، ارجو بازار

لاہور۔ فون: ۳۲۴۳۱۳

ISBN 969-8429-42-5

یہ ایک ایسے پاکستانی کی کہانی ہے جو غیر قانونی طور پر انگلینڈ میں مقیم ہے۔ اسے پاکستان میں ایک لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے اور بڑی مصیبتوں کے بعد ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ یہ ایک الگ اختتامی دلچسپ کہانی ہے۔ شادی کے بعد وہ اپنی بیوی کو انگلینڈ بلا چاہتا ہے مگر امیگریشن قوانین آڑے آتے ہیں کیونکہ وہ خود وہاں غیر قانونی طور پر رہا ہے۔ پھر وہ اپنے دوست کے کاغذات پر اپنی بیوی کو دوست کی بیوی ظاہر کر کے انگلینڈ لیتا ہے۔ یہاں سے کہانی سمیت سنسنی خیز ہو جاتی ہے جب اس کے دوست کی نیت خراب ہو جاتی ہے اور وہ اس کی بیوی پر قبضہ جمالیاتا ہے۔ دونوں کے درمیان اس کشمکش کو بڑا خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

ہو سکتا ہے ”اجازت“ پڑھنے والے بہت سے لوگوں کو اس میں اپنا چہرہ نظر آ جائے گی کیونکہ یہ ہمارے ارد گرد پھیلے ہوئے لوگوں کی کہانی ہے۔ بچے موضوع اور کہانی کے اعتبار سے محی الدین نواب کا یہ ایک منفرد ناول ہے۔

ادارہ

انسان کی زندگی میں کبھی ایسا مقام بھی آتا ہے جہاں سے وہ گزر نہیں پاتا۔ اس مقام پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں ملتی۔ اگر وہ امیگریشن قوانین پر پورا اترے تو کسی ملک کی زمین پر قدم رکھنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ اگر تاپندیدہ رویہ اختیار کرے تو اپنے سماج میں بچا جگہ نہیں ملتی۔ اگر اس میں حسن و خوبی ہو پھر ایسے میں حسن نظر مل جائے تو کسی کے دل میں جگہ مل جاتی ہے۔ گویا کبھی کبھی جگہ بنانے کے لیے حسن سلوک حسن ذہانت اور حسن نظری ضرورت پیش آتی ہے۔

جیسی ایک جھگڑے سے رک گئی۔ وہ بچپیل میٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچھل کر اگلی میٹ کی پشت سے ٹکرایا پھر جھنبلا کر بولا۔ ”کیا مذاق ہے؟“

ڈرائیور نے پلٹ کر کہا۔ ”مذاق کے ڈبی“ اے والے کرتے ہیں، دو گھنٹے پہلے یہ راستہ صاف تھا۔ اب یورڈ لگا دیا گیا ہے کہ سڑک کی مرمت ہو رہی ہے۔“

بچپیل میٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے دوا اسکرین کے پار دیکھ کر پھر سوچا۔ ”کوئی سڑک مرمت کرنے والا نظر نہیں آ رہا ہے۔ راستہ صاف ہے۔“

ڈرائیور نے کہا۔ ”بھائی صاحب! میل دو میل، چار میل کے قافلے پر کہیں تو سڑک مرمت ہو رہی ہو گی۔“ سڑک بند ہے“ یا یورڈ میاں لگا دیا ہے۔ مجھے والے دو چار میل پہلے ہی خطرے کی گھنٹی بجادیتے ہیں۔“

نوجوان اب دوا اسکرین کے پار نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ کھڑکی کے پار چوڑیوں کی ایک دکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسنے شوق سے دیکھ رہا تھا جیسے اس کی نگاہیں نہیں دل بھی ادھر کھنچا جا رہا ہو۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”خدا کی پتلا، کتنی حسین ہے۔“

جیسی ڈرائیور نے ایک نظروں پر ڈالی۔ پھر اس کی نگاہوں کی سمت چوڑیوں کی دکان کی طرف دیکھا وہاں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا، البتہ اس کے نرم و نازک ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ دکان کے کاؤنٹر پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت اسے چوڑیاں پہنا رہی تھی۔

چوڑیاں، مشرقی عورت کا مترنم سنگھار ہیں، کلائیوں میں پہنچنے ہی دل کی طرح جیتے لگتی ہیں۔

پہننے وقت جب کلائی چوڑیوں میں داخل ہوتی ہے تو کلائی والی خابوں میں داخل ہونے لگتی ہے۔

وہ انجی کون ہو گا؟ کیا ہو گا؟ جو چوڑیوں والی کلائی کو تھامنے آئے گا۔ اے انجی! آج ہی جلد آ کے ذرا دیکھ لے۔ یہ دنیا کی پہلی اور آخری جھکڑی ہے جو میں نے تیرے نام سے پائی ہے۔

نوجوان پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگا، جیسی ڈرائیور دوسری طرف سے گھوم کر اس کے پاس آیا۔ پہلے جوان مسافر کو دیکھا اس کے بعد چوڑیوں کی دکان کی طرف دیکھا، پھر پوچھا ”آپ نے فرمایا تھا کہ لندن سے آ رہے ہیں؟“

نوجوان پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ صرف اسی لڑکی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ ڈرائیور نے کہا ”بھائی صاحب! یہ لندن نہیں کراچی ہے۔ پاکستان ہے۔ یہاں کسی عورت کو ویسے پھاڑ کر دیکھنا گناہ ہے“ جرم ہے۔“

اس نے اپنے سر سے ٹوپی اتاری پھر سمجھے سر کو اس کے سامنے جھکا دیا۔ نوجوان نے چونک کر پوچھا ”یہ کیا؟“

”یہ قدرتی عجیب پن نہیں ہے۔ نوجوانی میں ایک بار کسی کو چھیڑا تھا اب تک مجھا چلا آ رہا ہوں۔“

”میں چھیڑا نہیں چاہتا۔ صرف اس کا نام اور پتا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

”اوسے ارے“ یہ کیا غصہ کرنے جا رہے ہیں۔ نام پوچھنے پر دس پتا پوچھنے پر

”یہ دس کیا ہے؟“

”کوڑے۔ یہاں لڑکیوں کو چھیڑنے پر کوڑے لگتے ہیں۔“

”مگر وہاں تو ایسا نہیں ہوتا۔ آخر عورت بھی انسان ہے۔ جس طرح ہم کسی مرد سے باتیں کرتے ہیں اسی طرح کسی عورت سے بھی کر سکتے ہیں۔“

”اس سے پہلے کہ آپ باتیں کرنے کے قابل نہ رہیں میرا کرایہ ادا کر دیجئے۔ میں ڈکی سے سامان نکال دیتا ہوں۔“

وہ غصے میں پاؤں پٹختا ڈکی کی طرف گلیا۔ پھر اسے کھولتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا تو نوجوان وہاں سے غائب تھا۔ چوڑیوں کی دکان پر پہنچ گیا تھا۔ اس لڑکی کے چہرے کھڑا ہو گیا تھا۔ مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے فٹ پاتھ پر سے گزر رہے تھے۔ اس دکان میں بھی چند عورتیں چوڑیاں پسند کر رہی تھیں۔ اگرچہ وہ مغربی ماحول سے آیا تھا تاہم ایک مشرقی لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے پچھپکا رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے؟ کس طرح مخاطب کرے؟ وہ چوڑیاں پہن چکی تھی۔ کاؤنٹر کے پاس سے پھٹنے لگی۔ اچانک اپنے روبرو ایک انجی کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے سسے ہوئے انداز میں ساکت رہ گئی۔

سسے ہوئے صحن میں غصہ کی جاذبیت تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں دشت سے یوں پھیل گئی تھیں جیسے شکاری کے سامنے پہنچنے ہی ہونی چوڑیاں بھول گئی ہو۔

مسافرات کو راستہ بھولتے ہیں۔ وہ دن کو راستہ بھول رہی تھی۔ اچانک کوئی سامنے آ جائے تو بڑی محبت سے ڈر لگتا ہے، کہیں یہ وہی تو نہیں جو میرا راستہ بدلے آیا ہو؟

کوئی انجی راستہ بدلے آئے تو پہلی بار یقیناً ڈر لگتا ہے۔ اس نے خوفزدہ ہو کر پیچ ماری۔ ”ڈولما بھائی؟“

دوسرے کاؤنٹر پر سے ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے پلٹ کر لڑکی کو دیکھا پھر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”لا حول ولا قوۃ یہ سالیان جب دولہا کتنی ہیں تو بھائی کیوں کتنی ہیں؟“

ایک ادیز عمر کی عورت تیزی سے چلتے ہوئے لڑکی کے پاس آئی۔ پھر بولی۔ ”کیا بات ہے موت؟“

مونا کا خوف قدرے کم ہو گیا تھا۔ وہ ہچکچا رہی تھی۔ اپنی بہن کی طرف بڑھتے ہوئے بولی ”آپا! اوہ۔ وہ میرا مطلب یہ ہے یہ..... یہ.....“

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا کہنا چاہیے؟ وہ کیوں بیچ بڑی تھی؟ جانے اس اجنبی کو کیا سمجھ بیٹھی تھی۔ اس کی آپا نے پوچھا۔ ”کیوں بھی کیا بات ہے؟“

اس ادیز عمر کے شخص نے بھی قریب آ کر پوچھا۔ ”ہاں کیا بات ہے؟ دیکھو مسٹر! یہ دونوں ہمیں ہیں۔ میں ان میں سے ایک کا دولہا اور دوسری کا بھائی ہوں۔ عجیب رشتہ ہے۔ بہر حال آپ فرمائیے؟“

”جی میں لندن سے آیا ہوں۔“

”لندن سے تو پوسٹ کارڈ بھی آ جاتا ہے۔ آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟“

”میں اسی محلے میں رہتا ہوں۔ اپنی گلی اور گھر کا راستہ بھول گیا ہوں۔ پتا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

دکان کے باہر سے عیسائی ڈرائیور نے بیچ کر کہا۔ ”ادھیان صاحب! میں کہہ رہا ہوں، لگتی گلی میں آپ کا مکان ہے۔ سلمان اٹھائیں اور چلے جائیں۔ شکر کریں مجھ جیسا ایماندار عیسائی دلال مل گیا ورنہ آپ ادھر عشق فرماتے جاتے ادھر آپ کا سلمان خائب ہو جاتا۔“

مونا فوراً ہی اپنی آپا کے پیچھے چلی گئی۔ سوائے نظروں سے اجنبی کو دیکھنے لگی۔ سمجھتا چاہتی تھی، عشق کا تعلق کس سے ہے۔ یہ بات ڈرائیور کس کے لیے کہہ رہا ہے؟

ادھر یہ پریشان ہو گیا تھا اس نے ہچکچاتے ہوئے معذرت طلب نظروں سے مونا کی بہن اور بہنوں کو دیکھا، پھر لپکتا ہوا دکان کے باہر آیا۔ ڈرائیور کے بازو کو پکڑ کر جھجھوڑتے ہوئے بولا۔ ”کیوں بھائی، پھوڑ رہے ہو۔ ذرا انتظار نہیں کر سکتے۔ میں ویٹنگ چارجر ادا کروں گا۔“

”میرا بازو تو چھوڑو۔ لڑکی دیکھ رہی ہے۔“

اس نے جلدی سے بازو چھوڑ کر مونا کی طرف دیکھا۔ وہ دکان کے اندر ابھی تک آپا کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی اور اسے دیکھ رہی تھی۔ کیا بڑی بڑی کنوڑا سی آنکھیں تھیں۔ دور ہی سے دل میں گھر گھرتی تھیں۔ اس کے بہنوں نے دکان کے باہر آ کر پوچھا۔ ”کیوں میاں! یہ کیا بات ہوئی؟ یہ ڈرائیور تمہارا پتا جانتا ہے تم اگلی گلی میں رہتے ہو اور ہم سے پتا پانچنے آئے تھے۔“

”وہ بات اصل میں یہ ہے کہ میں آپ کا پتا پوچھ رہا تھا۔“

”میرا پتا؟“

”جی ہاں، لندن میں کسی لڑکی سے بات کی جائے تو وہ برا نہیں مانتی بلکہ اپنا پتا بھی بتا دیتی ہے۔ میں تو آپ کا پتا پوچھ رہا ہوں۔“

وہ ادھر پائیں کر رہا تھا، ادھر مونا کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی شرمیلی ادا میں جانے اس کے لیے تھیں مگر اجنبی کی جان لے رہی تھیں۔ ایسی ادا میں اس نے مغربی ماحول میں نہیں دیکھی تھیں۔ وہ اپنی آپا کے پیچھے چھپ بھی رہی تھی اور چور نظروں سے دیکھتی جی جاتی تھی۔ شرانے کا عجیب انداز تھا۔ جیسے اجنبی سے کوئی نات نہ ہو مگر چور نظروں کا رشتہ ہو۔

اس کا بہنوں کہہ رہا تھا۔ ”میاں صاحبزادے! میں آج کل کے نوجوانوں کو خوب بہکتا ہوں۔ لندن سے آئے ہو سیدھے گھر جاؤ۔ کسی اور کا پتا پوچھو گے تو گھر تک نہیں پہنچ پائو گے۔“

وہ اپنی بہن کا بازو تھام کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے دکان سے باہر آئی اپنے بہنوں کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ نوجوان نے کہا۔ ”میں آپ کے شرمیں اجنبی ہوں۔ اگر آپ سے کچھ پوچھتا ہوں تو جواب دیتا آپ کا فرض ہے۔ ایک چھوٹا سا سوال ہے۔ کیا کسی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا کسی سے تعارف حاصل کرنا جرم ہے؟“

”لندن سے تم پہلے نہیں آئے ہو۔ میاں سینکڑوں آتے ہیں۔ خود میرے دوست کا بھائی لندن میں رہتا ہے۔“

نوجوان نے چونک کر پوچھا۔ ”کون رہتا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ وہاں سے میرے کتنے

ہی دوستوں نے اپنے رشتہ داروں کو سلام بھیجا ہے۔ مجھے ان تک سلام پہنچانا ہے۔ آپ کے دوست کے بھائی کا نام کیا ہے؟

”تم اسے نہیں جانتے اور وہ ہمیں کیا سلام بھیجے گا جب سے بھائی کا انتقال ہوا ہے اس نے ہمیں بھی بھلا دیا ہے۔ اس کے ماں باپ نے خواہ مخواہ اس کا نام مروت خاں رکھا۔ اس کا نام بے مروت ہونا چاہیے۔“

”مروت؟“ نوجوان نے اپنی ایک ہتھیلی پر دوسری ہتھیلی سے زور دار تلی بجاتے ہوئے کہا۔ ”بہنی مروت خاں تو بریے فورڈ میں میرے ساتھ ہی رہتا ہے اور آپ کا جو نقش کھینچتا ہے ہو ہو آپ دیسے ہی ہیں۔ کیا نام بتایا تھا اس نے آپ کا ٹھہریے میں یاد کرتے ہیں۔“

وہ اپنی کینٹی پرائنگی رکھ کر سوچنے لگا۔ کن انٹیموں سے موناکو دیکھنے لگا۔ وہ پھر اپنے آپ کے پیچھے چھپنے لگی۔ اس نے کہا۔ ”مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔ کہنے تو ابھی ٹیکسی کی ڈکر سے اپنا سلمان نکال کر اس میں سے نوٹ بک نکالوں اور آپ کا نام پتاؤں؟“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا نام خلیل احمد ہے۔ اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو اس نے یقیناً میرے نام کوئی خط بھیجا ہو گا۔“

”بالکل یاد آ گیا واقعی آپ کا نام خلیل احمد ہے۔ اس نے صرف خط ہی نہیں بلکہ تحفے بھی بھیجے ہیں۔ آپ نے تو میری مشکل آسان کر دی۔ اب مجھے دوسروں سے آپ کے گھر کا پتہ پوچھنا نہیں پڑے گا۔ آپ ہی بتادیں۔“

”ہمارا پتہ کیا ہے۔ وہ سڑک کے آس پاس دوسری گلی میں دسواں مکان ہے۔ پورا محلہ خلیل احمد کو جانتا ہے جس سے پوچھو گے وہ ہمارے گھر پہنچا دے گا۔“

نوجوان نے موناکو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بس سمجھ لو کہ میں پہنچ گیا۔“

موناکو نے اپنی آپا کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”چلے۔“

آپا نے اپنے میلاں کے بازو کو تھام کر کہا۔ ”چلے۔“

خلیل احمد نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خرو آنا۔ میں انتظار کروں گا۔“

نوجوان نے الدوا کی انداز میں ہاتھ ہلایا مگر وہ موناکو کو دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ وہ جاری تھی۔ دور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ایک تک کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ پھریوں لگا جیسے آس پاس کی دنیا کم ہو گئی ہو۔ صرف وہی وہ ہو۔ اس کے راستے میں پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی ہوں۔ موناکو کی چال میں شاعرانہ حسن تھا۔ اس کے قدم یوں اٹھ رہے تھے جیسے باوصا کی ہتیلی پر پاؤں رکھ کر چل رہی ہو۔

محبت ایسے ہی سحر پھونکتی ہے۔ ساری دنیا کو نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے۔ اپنے اور اس کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

پھولوں کی راہ گزر ڈھواں ڈھواں سی تھی۔ وہ آگے جا رہی تھی۔ اس کا آنچل اڑتا ہوا پیچھے کی طرف لہرا رہا تھا۔ جیسے اجنبی کو چھوڑنا نہ چاہتا ہو۔

وہ ایک قدم آگے بڑھتی تھی۔ پھر ایک ادائے ناز سے گھوم کر دیکھتی تھی۔ اپنی نگاہوں کا چارہ ڈالتی تھی پھر آگے بڑھ جاتی تھی۔

حالانکہ وہ بے چاری کب کی جا چکی تھی لیکن کسی کے جانے سے تصور نہیں جاتا۔ کھلی آنکھ کا سپنا رہ جاتا ہے۔

ٹیکسی ڈرور نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”بھائی صاحب! واپس آ جائیے۔ دیننگ چارجز دیتے جا رہے ہیں۔“

نوجوان نے چوٹ کر ڈرائیور کو دیکھا۔ پھر اس فٹ ہاتھ کی طرف دیکھا۔ جس پر سے گزرتے ہوئے ابھی موناکو تھی۔ اب وہ نہیں تھی۔ چاروں طرف ٹریفک کا شور تھا۔ گاڑیوں کے ہارن بج رہے تھے۔ کہیں قہقہے گونج رہے تھے کہیں زور زور سے باتیں کرتے ہوئے لوگ گزر رہے تھے۔ ہر طرف شور تھا ہنگامہ تھا۔ سب کچھ تھا مگر وہ نہیں تھی۔

یہ دنیا کتنی ہنگامہ پرور ہو گئی ہے۔ آنکھوں کے فریم میں نہ کسی تصویر کو رہنے دیتی۔ نہ تصور کو قائم رہنے دیتی ہے۔ اپنی بے پناہ آوازوں کے پھر مار کر تمام پنہوں کو پکنا پھوڑ کر دیتی ہے۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو سب کے لیے جیسے عید ہو گئی۔ بچے چاروں طرف سے دوڑتے ہوئے آئے۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ”بھائی جان آگئے۔“ کسی نے حج کر اعلان کیا۔ ”ماموں جان! ماموں جان!“ کوئی اس کے قدموں سے پٹ کر بولا۔ ”چچا جان آگئے۔“ ایک کمرے سے اس کی ماں بلائیں لیتی ہوئی نکلی۔ ”میں صدمے میں واری اے!“ میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔ اچانک اپنے آنے کی خوشیاں دو گے تو دل خوشی سے دھڑکنے بند ہو جائے گا۔“

لازم اس کا سامان اٹھائے اوپری منزل کی طرف جا رہے تھے۔ اس کی بڑی بہن زینے سے اترتی ہوئی بولی۔ ”ابھی چھت پر کوا کا کس کا کس کر رہا تھا۔ میں سمجھ گئی۔ ضرور میرا بیٹا آئے والا ہے۔“

زینے کی بلندی سے اس کے بہنوئی نے کلمہ ”کامران! تمہاری آپا اپنے شوہر کی بولی نہیں سمجھتی، کوئے کی سمجھ لیتی ہیں۔“

اس کے والد نے ایک کمرے سے نکلے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔ ”ارے کای! تم! اچانک کیسے آگئے۔ اپنے آنے کی اطلاع تو دی ہوئی۔ ہم اسٹیر پورٹ لینے آ جاتے۔“

”اوہ بیٹا! میں آپ لوگوں کو سر براہزدہ دینا چاہتا تھا۔ مئی بیچ تاجے میں اطلاع دے کر آتا تو اتنی زیادہ خوش حاصل ہوتی؟“

”ارے بیٹا! تم جیسے بھی آتے مگر میرے لیے خوشیاں ہی لے کر آتے۔“

باپ نے اس کے قریب آتے ہوئے کلمہ ”تم زندگی میں دوبارہ اچانک آئے ہوا جب پیدا ہوئے والے تھے تو ہم سمجھتے تھے ہمارے ہاں بیٹی ہو گی مگر تم اچانک بیٹا بن کر آ گئے۔“

بچ پوچھو تو اچانک آنے کی خوشی زیادہ ہوتی ہے۔ آج بھی ہو رہی ہے۔

بڑی بہن نے اپنی گود کے بچے کو دکھاتے ہوئے کلمہ ”دیکھو کای! کتنا پیارا پیارا۔“

بھانجا ہے تمہارا۔ اس کے لیے کیا لائے ہو؟“

ماں نے کلمہ ”چل ہٹ! ابھی میرا بیٹا آیا ہے اور بہن کا حق وصول کرنے کھڑی و

گئی۔ اب تو میں جب تک اپنے بیٹے کی شادی نہیں کروں گی، اس وقت تک واپس نہیں ہانے دوں گی۔“

”اوہ مئی آپ لوں سمجھ لیں کہ میں نے کر لی ہے۔“

”کیا؟“ سب نے اسے چونک کر دیکھا۔ باپ نے پوچھا۔ ”کیا دلائی ہے؟“

”پاکستانی ہے۔“

”تو نے وہاں کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کر لی اور ہمیں اطلاع نہیں دی۔“

”مئی وہاں نہیں کی ہے۔ اس بے چاری نے تو شاید کبھی انگلینڈ میں قدم بھی نہ دھکا ہو۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پاکستان میں ہے اور تم انگلینڈ میں پھر شادی کیسے ہوئی؟“

”باپ نے پوچھا۔ ”کیا ٹیلیفون کے ذریعے؟“

”اوہ نو بیٹا! آپ لوگوں کی شرکت کے بغیر بھلا میں شادی کر سکتا ہوں۔ شادی بیس ہوئی۔ ابھی تو میں اسے راضی کرنے والا ہوں۔“

ماں نے کاواری سے کلمہ ”کیا تیرے لیے لڑکیوں کی کمی ہے جو کسی کو راضی کرے گا کسی کی خوشامد کرے گا۔“

اس کے پیٹا نے کلمہ ”جب اس کے باپ نے تمہاری خوشامد کی تھی تو یہ کیوں نہ ہے۔“

مئی نے پیٹا کو گھور کر دیکھا۔ پھر کلمہ ”دیکھو بیٹا! شادی بھلے اپنی مرضی سے کرو لیکن

معاذ اللہ ہمارے برابر کا ہو! لڑکی لکھی پڑی نہ ہو کوئی بات نہیں مگر ہستی والی ہو۔ آخر

اتنا بڑا گھر کون سمجھائے گا۔“

”مئی! مگر سنبھالو! تو کسی گورنر کو رکھ لیجے دو چار ملازموں کا اضافہ کر لیجے۔“

میں شادی کروں گا اور وہ یہاں رہے گی تو کیا میں پولیس میں بیٹھاساں زندگی اسے خل

لکھتا رہوں گا۔ اوہ نومی! پہلے تو اسے راضی کرنا ہے۔ ابھی بنیاد پڑی نہیں اور ہم ہوائی

نکل بنا رہے ہیں۔“

وہ زینے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”میں غسل کرنے جا رہا ہوں۔ میرے لیے

اس نے دروازے پر دستک دی پھر انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ دستک دی۔ تیسری بار دستک دینا چاہتا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ غلیل احمد نظر آئے۔ اسے دیکھتے ہی بولے "آہ صاحبزادے تم آہی گئے۔"

"جی ہاں، اندر آ جاؤں؟"

اس نے اجازت حاصل کرتے ہوئے ذرا اندر کی طرف جھانک کر دیکھا۔ شاید مونا نظر آ جائے لیکن غلیل احمد باہر آ گئے اس کے ہاتھوں سے پیکٹ لپیٹے ہوئے بولے "اچھا تو مروت خان نے یہی تحفہ بھیجا ہے؟"

"جی ہاں، یہ آپ تینوں کے لیے ہے۔"

"کون تینوں؟"

"جی ایک تو آپ کے لیے دوسرا آپ کی بیگم صاحبہ کے لیے اور تیسرا مس مود کے لیے۔"

غلیل احمد نے چونک کر پوچھا "تیس میری سالی کا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے وہاں دکان میں کسی کو نام لیتے ہوئے سنا تھا۔"

"اچھا وہ مروت خان کا خط کہاں ہے؟"

"خط؟ وہ..... وہ تو کہیں گم ہو گیا۔"

"وہ کیسے گم ہو گیا؟ اب ہمیں کیسے معلوم ہو کہ مروت خان نے کیا بھیجا اور تم نے کیا چھپایا؟"

"اندر چلے، میں بتا دیتا ہوں۔"

وہ بار بار اندر کی طرف جھانک کر دیکھ رہا تھا لیکن وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ غلیل احمد نے کلمہ "تم ادھر کیا دیکھ رہے ہو۔" ادھر دیکھو اور جواب دو۔"

"جی اس پیکٹ میں آپ کے لیے ایک سوٹ ہیں۔ آپ کی بیگم صاحبہ کے لیے ساری ہے اور مس مونا کے لیے پرنو۔"

"اور؟ آگے بولو اور کیا ہے؟"

"جی، اور تو کچھ نہیں ہے۔"

"ہوں، تم غلیل احمد کو الوداع دے۔"

"کیا مطلب۔ میں نہیں سمجھا؟"

"میں سمجھتا ہوں۔ تم فرار ہو۔ امانت میں خیانت کرنے والے ہو۔ اس نے

ہمارے لیے ایک اسٹیرو کیٹ ریکارڈر بھیجا ہے۔"

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ اتنی بڑی چیز میں کیسے لاسکا ہوں دہلی سے۔"

"دنیا بھر کے لوگ لاتے ہیں۔ تم کیسے نہیں لاسکتے؟"

"جناب! مجھے ذاتی طور پر تحفہ دینا ہوتا تو میں یقیناً لے آتا لیکن مروت خان نے

ایسی کوئی چیز نہیں بھیجی ہے۔"

"بھئی ہے۔ ہمارے پاس نیلی گرام آیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ وہ ہمارے

ہاتھوں میں تھا، نام بھول رہا ہوں کیا نام بتایا تھا تم نے؟"

"مجھے کامران کہتے ہیں۔ پیار سے کالی کھاتا ہوں۔ آپ بھی مجھے پیار سے کالیں۔"

"میں مروت خان کا وہ ٹیلیگرام بڑے پیار سے ہمارے ماں باپ کے سامنے پیش

کروں گا اور کہوں گا، یہ لاکا امانت میں خیانت کرتا ہے۔ اس ٹیلیگرام میں صاف طور پر لکھا

ہے، مسٹر کامران کے ہاتھوں ایک اسٹیرو کیٹ ریکارڈر روانہ کیا جا رہا ہے۔ وصول

فرمائیں۔"

"آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ مجھ پر خواہ مخواہ الزام لگا رہے ہیں۔ کیا آپ مجھے وہ

ٹیلیگرام دکھاتے ہیں؟"

"ابھی دکھا سکتا ہوں۔ بیگم! ذرا وہ ٹیلیگرام لے کر آؤ۔"

مونا کی آنچا ایک کمرے سے نکلیں پھر دروازے کی طرف آتے ہوئے بولیں۔ "وہ

اب کہاں ہے۔ وہ تو گم ہو چکا ہے۔"

کامران نے کلمہ "آپ لوگوں نے پہلے تو مجھے نہیں بتایا تھا کہ مروت خان کا

ٹیلیگرام بھی آیا ہے اور اس میں کسی اسٹیرو کیٹ ریکارڈر کا بھی ذکر ہے۔"

"پہلے ٹیلیگرام نہیں آیا تھا۔ تم سے ملاقات کرنے کے بعد ہم گھر پہنچے تو وہ موصول

ہوا۔"

مونا کی آپانے کلد۔ ”ادھر ہم نے ٹیلیگرام پڑھا اور وہ گم ہو گیا۔“
 کامران نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ٹیلیگرام آیا۔ آپ لوگوں نے پڑھا اور وہ گم بھی ہو گیا۔“
 ”کیوں نہیں ہو سکتا۔ مروت خان نے ہمارے نام خط بھیجا تھا؟“
 ”جی ہاں بھیجا تھا۔“
 ”کیون وہ گم ہو گیا؟“
 ”جی ہاں گم ہو گیا۔“

مروت خان

اس نے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر بے بسی سے کلد۔ میں کیسے الزام دوں کہ مسٹر خلیل احمد جھوٹ بول رہے ہیں؟ اب کچھ میں آ رہا ہے کہ دو فرسٹ کلاس بمب نے ایک دوسرے کو جھوٹا نہیں کہہ سکتے۔“
 وہ بایوس ہو کر وہاں سے چلا آیا۔ اس کی والدہ نے پوچھا۔ ”تمام دن کہاں رہے؟ اتنے دنوں بعد آئے ہو۔ کچھ وقت ہمارے ساتھ بھی گزارو۔“
 ”آپ کے ساتھ اتنی زندگی گزار چکا ہوں۔ جس کے ساتھ گزارنا ہے اس کی عمر میں ہوں۔“

”آخر وہ ہے کون؟ کچھ بتایا کیوں نہیں؟“
 ”اگر میں بتا دوں اور وہ میری زندگی میں آنا پسند نہ کرے تو آپ کو بتانا بے سود ہو گا۔“

”وہ میرے بیٹے کو پسند نہیں کرے گی؟ تم ان کے گھر کا پتا بتاؤ۔ ہم کسی سے کم نہیں ہیں“ وہ ہمیں سات سلام کر کے لڑکی دیں گے۔“
 ”مجھے لڑکی والوں سے نہیں مانگنا ہے۔ لڑکی سے خود اسے مانگنا ہے۔“
 ”یہ کیا بات ہوئی؟“

”سیدھی سی بات ہے۔ میں یہاں سے لندن جاتا ہوں تو لندن والوں کی اجازت سے جاتا ہوں کیونکہ وہ ان کا ملک ہے ان کی زمین ہے۔ آپ کے گھر میں کوئی آتا ہے تو آپ کی اجازت سے آتا ہے۔ اس لیے کہ آپ اس گھر کی مالک ہیں۔ اسی طرح میں اس لڑکی کی زندگی میں جاؤں گا تو لڑکی کی مرضی سے جاؤں گا۔ اس کے ماں باپ کی مرضی سے نہیں۔“

وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ اس کے پیانے کلد۔ ”برخوردار! اجازت کی بات کر رہے ہو مگر یہ بھول رہے ہو کہ تم خود لندن کے قاعدہ شری نہیں ہو۔“
 وہ جاتے جاتے رک گیا۔ پلٹ کر بولا۔ ”انسان کا مطالبہ سیدھا اور سچا ہو تو اس نے سامنے رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ مجھے روزگار کی تلاش تھی اور میرے لیے لندن میں روزگار موجود تھا۔ مجھے اجازت ملنی چاہیے تھی۔ میں روزی کمانے کا حق رکھتا ہوں۔“

”جب تمہارے ہاتھوں سے خط گم ہو سکتا ہے تو ہمارے ہاتھوں سے ٹیلیگرام کیوں نہیں گم ہو سکتا؟ افسوس ہم نے سوچا تھا“ تم کسی عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ جب وہ خط اور تحفے لے کر آؤ گے تو ہم جنہیں گھر کے اندر لے جائیں گے۔ عزت سے بٹھائیں گے۔ مونا نے تمہارے لیے گرامر کم پکڑے تیار کیے تھے مگر افسوس۔“
 اس نے خوشامداند انداز میں خلیل احمد کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر کہا۔ ”آپ افسوس نہ کریں۔ میں لندن سے بہت سامان لے کر آیا ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھ سے بھول چوک ہو گئی ہو۔ میں اپنے سلمان میں تلاش کروں گا۔ مروت خان نے اسٹیریو کیسٹ ریکارڈر ضرور بھیجا ہو گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں، کل صبح تک آپ کا وہ ریکارڈر لے آؤں گا۔ آئیے ہم اندر چل کر اطمینان سے باتیں کریں۔“
 خلیل احمد نے ہاتھ بڑھا کر اس کا راستہ روکنے ہوئے کلد۔ ”ہرگز نہیں“ تم نے ہمارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ کل ہمارا ریکارڈر لے آؤ۔ تمہیں اندر آنے کی اجازت مل جائے گی۔ خدا حافظ۔“

یہ کہہ کر وہ دروازے کے اندر گیا۔ پھر اس نے ایک جھٹکے سے اسے بند کر دیا۔ کامران نے بند دروازے کو بے بسی سے دیکھا۔ پھر پلٹ کر بیڑا لے لگا۔ ”یہ کیا بات ہوئی؟ مروت خان کو مجھ پر الزام لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ آخر وہ مجھے کیسے جانتا ہے؟“
 یوں بیڑا دھرتے ہوئے اس نے ایک گہری سانس لی۔ پھر اہانت میں سر ہلا کر کہا۔ ”فیک اسی طرح جانتا ہو گا جس طرح میں اسے جانتا ہوں۔“

چونکہ باقاعدہ اجازت نہیں ملی اس لیے میں نے بے قاعدگی سے وہاں رہائش اختیار کر لی۔ اسی طرح میں کسی کی زندگی میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ کسی کو اپنا چاہتا ہوں تو یہ سیدھا اور سچا مطالبہ ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ اجازت ملنی چاہیے ورنہ.....“

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی می می نے پوچھ ل ”ورنہ کیا؟“

”ابھی تو کوشش جاری ہے ورنہ کاسوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دیکھا جائے گا۔“

وہ اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ دن گزر گیا۔ شام بھی گزر گئی۔ رات بھی گزرنے لگی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ”ایک دن یونی ضائع ہوا ہے۔ اب تیس دن میں انیس دن رہ جائیں گے۔ اگر مروت خان کے ٹیکسٹ کے مطابق ایک اسٹیوڈیو کیسٹ ریکارڈر لے جاؤں گا تو کم بخت ظلیل احمد کے گیلکٹرام میں چھوٹا ریکارڈر نہیں بڑا ریکارڈر لکھا تھا اور اگر بڑا ریکارڈر لے جاؤں گا تو کسے گا اس کپنی اس کپنی کا لکھا ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا“ یہ چکر کب تک چلے گا دیے جب تک پتا رہے گا۔ مونا کا دیر تو ہوتا رہے۔ اتنی دور گیا۔ اتنے پاؤں پہلے لیکن اس کی من موہنی صورت نظر نہیں آئی۔“

اس رات نہ تو وہ کام کی باتیں سوچ سکا اور نہ ہی اطمینان سے سو سکا۔ زندگی میں پہلی بار پتا چلا کہ آدمی ان حالات میں سوچتے سوچتے سوتا ہے اور سوتے سوتے سوچتا چلا جاتا ہے اور اس طرح صبح ہو جاتی ہے۔

دوسری صبح وہ پھر مونا کے ہاں جانا چاہتا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسٹ ریکارڈر لے جانا چاہیے یا نہیں اتنے میں اس کی آپا نے کلمہ ”صاحب بھادر پھر سنوور کر کٹل رہے ہیں۔ صبح جائیں گے تو شام کو آئیں جیسے ہم سے کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔“

”یہ بات نہیں دراصل میں ایک رومانٹک چوہیشن میں الجھا ہوا ہوں۔ اگر میں اس سے لکھتا چاہوں تو نکل نہیں سکتا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہوں اور اگر الجھتا چاہوں تو ساری زندگی الجھتا ہی چلا جاؤں گا۔“

”چوہیشن کیا ہے۔ مجھے بتاؤ؟“

”بات یوں ہے کہ میں نے ایک لڑکی دیکھی۔ لڑکی کیا ہے طلسم ہو شرا ہے یعنی ہوش اڑا دینے والا جادو ہے میں اس کا نام اور پتا معلوم کرنا چاہتا تھا۔ پتہ چلا یہ لندن نہیں

لندن ہے۔ یہاں کسی لڑکی سے اس کا نام اور پتا پوچھائیں جا سکتا اس لیے میں نے اس نے ہنسنی کو ٹھپ کیا۔ وہ ڈیگیں مار رہا تھا کہ اس کے دوست کا بھائی لندن میں رہتا ہے۔ اس کا نام مروت خان ہے بس میں نے کہہ دیا کہ مروت خان میرا دوست ہے۔ میں اس کی طرف سے کچھ تھے کہ ان کے لیے لایا ہوں۔ یوں مجھے ان کا پتا معلوم ہو گیا۔“

آپا نے بکڑ کر کہا۔ ”اب سمجھی۔ وہ سوٹ نہیں‘ ساری اور پرفیوم لڑکی والوں کے ہاں لے گئے تھے۔ مفت کا مال تھا۔ انہوں نے قبول کر لیا ہو گا۔ یہاں بڑے بڑے نو سٹریٹ رہتے ہیں۔ لڑکی کی جھلک دکھاتے ہیں اور تمام عمر لڑکوں کو بے وقوف بنا کر ان سے دل بہتے رہتے ہیں۔ انہوں نے اس تھے کہ بعد کچھ اور بھی مجھ کو طلب کیا ہو گا۔“

”بتی ہاں آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”دلیات گھوم آنے سے عقل نہیں آتی۔ خردوار‘ اگر ایک پیسے کا بھی تحفہ لے جا لیا۔ مجھے ان کا پتا بتاؤ۔ میں وہ تھے وصول کر کے لائی ہوں۔“

”آپا! میں جھگڑا کرنے کے لیے نہیں۔ ان سے دوستی کرنے کے لیے آپ سے مدد رواں گ رہا ہوں۔“

اسی وقت مکان کے فچلے حصے سے اس کی می می کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ ”میں جھگڑا نہیں کروں گی تو کیا تم جیسوں کو اپنے سر پر بٹھاؤں گی۔“

لعجب خدا کا جنہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکا دلیات سے آیا ہے۔ چار پیسے کا لایا ہے تو لڑکی والے جال بچانے چلے آتے ہیں۔“

کامران نے حیرانی سے پوچھ ل ”یہ می میرے لیے کس سے لڑائی کر رہی ہیں؟“

وہ تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکلا۔ نیچے ڈرائنگ روم میں ظلیل احمد صوفے کے اس ٹوڑے ہوئے تھے۔ سامنے سینئر نیبل پر وہ بڑا سا پیکٹ رکھا ہوا تھا جو کامران تھے کے طور پر ان کے گھر لے گیا تھا۔ سینئر نیبل کے دوسری طرف کامران کی می اور پلا کھڑے ہوئے تھے۔ ظلیل احمد نے کلمہ ”آپ لوگ میری بات کو غلط رنگ دے رہے ہیں۔ کیا اس لیے کہ ہم غریب ہیں؟“

کامران کے پلٹانے کلمہ ”غریب ہی ایسی چالیں چلتے ہیں۔ میرے بیٹے کو پھانسنے کے

لے کوئی اور طریقہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا تھا؟
”اگر مجھے چاہتا ہوتا تو یہ تحائف واپس نہ کرتا۔“

”میں تو سب سے بڑی خوبی ہے کہ جال بھی بچھالیا اور جال نظر بھی نہ آیا۔ پہلے اتنا ساتھ نمونے کے طور پر منگوا کر بھانپ لیا کہ لڑکا لین دین میں کیسا ہے جب پتا چلا کہ فراخ دل ہے اور دوسرے دن وہ تمہیں کیسٹ ریکارڈ بھی لا کر دے گا تو اپنی شرافت کا ثبوت دینے چلے آئے۔ سوچا کیسٹ ریکارڈ لے کر کیا کرنا ہے۔ لڑکی اگر گھر میں آ جائے گی تو سارا گھر تہہہا ہو گا۔“

کامزن اوپری منزل سے دوڑتا ہوا، ”ڈینے سے اترتا ہوا کہنے لگا۔ ”پلیا آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں دیکھئے، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ طفیل صاحب ایسے نہیں ہیں۔ میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔“

اس کی می نے کلمہ ”ہمارے سامنے کا چھو کر ہمیں سمجھائے گا۔ اگر یہ حضرت اتنے سچے ہیں تو جھوٹ کیوں کہہ دیا کہ مراد خان نام کا کوئی شخص وہاں رہتا ہے؟“
طفیل احمد نے کلمہ ”میں نے آپ کے صاحبزادے کے جھوٹ کو پکڑنے کے لیے کہا تھا اور صاحبزادے نے کہہ دیا ہاں، کوئی مراد خان ہے۔ ان کا دوست ہے۔ ان کے ساتھ رہتا ہے۔ اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہو گا؟“

کامران کے پلینے کلمہ ”جب آپ نے اس کا جھوٹ وہیں پکڑ لیا تھا تو وہیں انکشاف کر دیتے آپ تجھے کا انتظار کیوں کرتے رہے؟“

”اس لیے کہ جو لڑکا میرے منہ پر مجھے یہی خوف بنا رہا تھا، وہ بیچہ پیچھے میری لڑکی کو بدنام کر سکتا ہے۔ میں ثبوت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ لڑکا تحفہ لے آئے گا تو اس تجھے کو تمہارے منہ پر مار دوں گا۔ میں نے اپنی شرافت کا ثبوت دے دیا لیکن شرافت ان کی سمجھ میں آتی ہے جو شریف ہوتے ہیں۔“

وہ پاؤں جھنجھے ہوئے چلے گئے۔ کامران نے ان کے پیچھے چلے ہوئے کلمہ ”قبلہ ذرا رک جائیے۔ دیکھئے میں میری اور پلیا کو سمجھاتا ہوں۔ آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ پلیز رک جائیے۔“

طفیل احمد نے دروازے کے پاس پہنچ کر کلمہ ”بس میاں صاحبزادے! میں نے یہاں آ کر تم لوگوں کی شرافت دیکھ لی۔ اگر واقعی شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہو تو آج سے میری گلی کا راستہ بھول جائو۔ کوئی مجبوری اور ہلے جائے تو تمہاری خاندانی شرافت کا واسطہ دے کر کہتا ہوں، نظرس جھکا کر گزرو۔ ورنہ آنکھیں نکال لوں گا۔“
یہ کہتے ہی وہ تیزی سے پلٹ کر غصے سے ٹٹٹٹا ہوا چلا گیا۔ کامران نے بے بسی سے انہیں جاتے ہوئے دیکھا پھر پریشان ہو کر کلمہ ”اوہ پلیا! یہ کیا ہو رہا ہے یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔“

”اتنے اچھے کہ یہ بھید نہ کھاتا تو ابھی تم بائچ دس ہزار کا کیسٹ ریکارڈ ان کے ہاں لے جاتے۔ آخر تم نے ان کی لڑکی میں کیا خوبی دیکھی ہے؟“
اس کی می نے کلمہ ”خوبی صرف ایک لڑکی میں نہیں ہوتی۔ ہزاروں خوبیوں والی ہزاروں لڑکیاں اس دنیا میں ہیں۔“

کامران نے ان کی طرف بڑھتے ہوئے کلمہ ”اور ہزاروں میں سے دل کسی ایک کو پسند کرتا ہے اور میں نے اسے پسند کر لیا ہے۔“

اس کی آپا نے کلمہ ”پسند آنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ پورا گھر اس پر لٹا دو۔ شادی سے پہلے یہ حال ہے تو شادی کے بعد کیا ہو گا؟“

”آپا! شادی کی بات تو پیچھے رہ گئی۔ ابھی تو مسئلہ یہ ہے کہ لڑکی والے شریف اور ایماندار ہیں یا نہیں۔ اس مسئلے میں می اور پلیا کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اسے دور کرنا چاہتا ہوں۔“

ہم تم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ حلال کے ایک دانے سے پوری ہانڈی کا پتا چل جاتا ہے۔ ہم نے اس ایک بے ایمان سے مل کر اس کے پورے خاندان کو سمجھ لیا ہے۔ تم ان کی دکالت نہ کرو۔“

اس نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا۔ پھر خود ہی منہ کو بند کر لیا۔ ایک طرف اس کے پلپاتے۔ دوسری طرف می تھیں۔ تیسری طرف آپا اور تینوں ہی اس کی باتوں کو سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ غصے سے پلٹ کر تیزی سے چلا ہوا باہر آ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں

آ رہا تھا، کیا کرے؟ کہاں جائے؟ قدم اٹھتے چلے جا رہے تھے۔ وہ ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں جا رہا تھا۔ دوسری سے نکل ایک شاہراہ کو پار کر رہا تھا۔ پھر وہ ایک گلی کے پاس پہنچ کر ٹھک گیا۔ دور بہت دور وہ مکان خبر دس نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی خلیل احمد کی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔ ”اگر تم میں خاندانی شرافت ہے تو ہماری گلی سے نہ گزرتا۔“

وہ بڑی حسرت سے اس مکان کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہاں کھڑی ہوئی مونا نظر آ رہی ہو، اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔

کیا وہ مجھے دور دور سے ہی نظر آنے کے لیے میری زندگی میں آئی ہے؟

کیا وہ ایسا پھول ہے جو ہاتھ نہیں آتا۔ محض دور سے خوشبو کا پیغام پہنچاتا ہے؟

کیا وہ آسمان کا تارا ہے جس میں توڑ کر نہیں لاسکتا؟

نہیں وہ بھی زمین پر ہے، میں بھی زمین پر ہوں۔ دنیا والوں نے محبت کرنے والوں کو زمین اور آسمان بنا دیا ہے۔ اگر ایسا کیا ہے تو میں انسانی کو ہونی کروں گا۔ زمین اور آسمان کو ملا دوں گا۔

وہ دن گزر گئے۔ تیسرے دن اس نے بنوئی کی موٹر سائیکل لی۔ پھر دسویں گلی کی ٹکڑ پر کھڑا ہو گیا۔ صبح سات بجے سے ساڑھے نو بجے تک دل کو تسلیاں دیتا رہا۔ وہ آئے گی، مگر سے اکثر نکلتی ہو گی۔ آج بھی نکلتی گی۔

اس کا اندازہ درست نکلا۔ پونے دس بجے وہ گھر سے نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ پہلے تو شبہ ہوا کہیں جاتی آگے کا پتہ نہ ہو۔ اس نے آنکھیں مل مل کر دیکھیں۔ پھر میری یقین نہ آیا۔ اس نے جھپٹ کر پشت کو منہ کے قریب لا کر اسے داغوں سے ذرا کاٹ لیا، پھر تھملا کر پھیل کر جھٹکنے لگا۔ یقین آ گیا کہ وہ بچ چلی آ رہی ہے۔

وہ آئی۔ گلی کی ٹکڑ پر پہنچی۔ نگاہوں کا تصادم ہوا پھر وہ ٹھک گئی۔ دوسرے ہی لمحے ایک دم سے غصے اور نفرت سے دیکھتے ہوئے منہ بھیر کر جانے لگی۔ اس نے مخاطب کیا۔ ”سنو، پلیز میری ایک بات نہ لو۔“

وہ سنی ان سنی کر کے سڑک کو پار کرتے ہوئے بس اسٹینڈ کی طرف جا رہی تھی۔

اس نے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اسے اسٹارت کیا۔ ذرا انجن گھر گھرایا۔ پھر بند ہو گیا۔ پھر اسٹارت لیا، انجن دوبارہ شور مچا کر خاموش ہو گیا۔ اس نے اتر کر موٹر سائیکل کو ایک لات مار دی۔ پھر دوڑتا ہوا سڑک کو پار کرتا ہوا بس اسٹاپ کی طرف جانے لگا۔ مونا وہاں کھڑی تھی۔ اس کے آس پاس دوسری عورتیں اور مرد بھی تھے، سبھی بس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ دوڑتا ہوا اس کے قریب آ کر رک گیا۔ وہ سم کر ایک عورت کے پیچھے چلی؟

اس نے دوڑ کے آنے اور رکنے کا انداز ایسا تھا کہ تمام لوگ متوجہ ہو گئے۔ پھر مونا کے سامنے لے انداز نے لوگوں کو کچھ اور متوجہ کیا۔ وہ سب کامران کو گھورنے لگے۔

مونا کے سامنے ڈھال بننے والی عورت نے ناگواری سے پوچھا۔ ”اے، کیا گھسے چلے آ رہے ہو۔ اور چراگا۔“

”جی میں..... میں اس سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔“

”دنا نے اس عورت کے پیچھے اور چھپتے ہوئے کہا۔ ”میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“

اس عورت نے کامران سے پوچھا۔ ”سن کیا تم نے؟“

”جی ہاں، لیکن مونا کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ان کے بنوئی سے اپنے والدین کے روپے کی معافی مانگتا چاہتا ہوں لیکن مانگ نہیں سکتا۔ انہوں نے مجھے گلی میں آنے سے منع کیا ہے۔“

ایک شخص نے قریب آ کر اس کے گریبان کو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”گلی میں آنے سے منع کیا ہے اس لیے لڑکی کو میاں پھینچ رہے ہو۔“

دوسرے شخص نے دوسری طرف سے اس کے کارو پکڑ لیا۔ پھر تیسرے نے پوچھا۔ ”عزت سے جاؤ گے یا گلوں پر بٹھا کر جلوس نکالا جائے؟“

اس دوران بس آگئی۔ مونا دوسری عورتوں کے ساتھ اس میں سوار ہو گئی۔ اسے لڑائے والوں نے اسے ایک طرف دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ”صورت سے بھلے ہاتھ نکلتے ہو اس لیے پھوڑ کر جا رہے ہیں۔ بس میں آؤں گے، اس کا پیچھا کرو گے تو اٹھا کر باہر پیسٹک اٹھاؤ گے۔“

بس آگے بڑھ گئی۔ اس نے بھی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔ اسے تیز رفتاری سے آگے بڑھانا ہوا پہلے بس کے پیچھے چلنے لگا پھر بس کے برابر ہو گیا۔ چھوڑنا درجہ تھا اس دروازے کی طرف پہنچ گیا۔ وہ نظر آ رہی تھی اور چار عورتوں کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس میں بیٹنے کی جگہ نہیں تھی اس لیے دروازے کے قریب ہی تھی۔ موٹر سائیکل کی آواز سنتے ہی اس نے چونک کر دیکھا۔ پھر کامران کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یوں گھبرانے لگی۔

”خداہ خواہ ہونے والی بدنامی کا ڈر ہو۔“

وہ بس دوسرے اسٹاپ پر رک گئی۔ وہ بھی رک گیا۔ کچھ مسافر اترے۔ کچھ مسافر ہار ہوئے۔ بس پھر آگے بڑھ گئی۔ اس نے بھی موٹر سائیکل کی رفتار اس کے برابر کی اور زنانہ درجے کے دروازے کی طرف پہنچ گیا۔ موٹا اسے دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔ اس کی طرف سے منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی تھی۔ کنڈیکٹر نے دروازے لے پاس آ کر پوچھا۔ ”اے بھائی! کیوں بس کے ساتھ رہیں لگا رہے ہو؟ کیا سر نے کاراواہ“

”ہاں“

اس نے موٹر سائیکل کی رفتار کو برقرار رکھتے ہوئے موٹا کی طرف دیکھ کر بلند آواز سے کہہ دیا۔ ”میں جانتا ہوں تمہارے ساتھ۔ میں جانتا ہوں تمہارے ساتھ۔“

کنڈیکٹر نے چونک کر کہہ دیا۔ ”ارے کیوں سبھی کرتا ہے۔ ہمارے اندر کیا خوبی ہے کہ ہمارے ساتھ جینا چاہتے ہو ہمارے ساتھ رہنا چاہتے ہو۔ بھائی! دوسرے جاؤ۔ منی بس کے ساتھ رہیں لگاؤ وہ تمہیں مزہ چکھائے گا۔“

”میں جس کے ساتھ ارادہ کر لیتا ہوں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا ہوں۔ وہ بھاننا چاہے، دوڑنا چاہے تو میں اس کے ساتھ دوڑنا جانتا ہوں۔“

موٹا سن رہی تھی اور اس سے نظریں ملانے سے کھڑا رہی تھی۔ وہ بس پھر ایک اسٹاپ پر رک گئی۔ اس بار کامران نہیں رکا۔ موٹر سائیکل کو تیزی سے دوڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ موٹا نے اسے دور جانے دیکھا تو اطمینان کی سانس لی۔ وہ بس پھر آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اسے کنڈیکٹر کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ارے بھائی! تم پھر آگے؟“

وہ بھی بس میں سوار ہو کر جانے لگے۔ اس نے فریادی نظروں سے زنانہ درجے کی طرف دیکھا۔ موٹا عورتوں کی بیٹیوں میں نظر آ رہی تھی لیکن اس سے نظریں چار رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی بس وہاں سے چل پڑی۔ وہ دھیرے دھیرے سے دوڑنے لگا جب بس کی رفتار تیز ہو گئی اور وہ اس سے آگے نکل گئی تو اس نے دوڑتے ہوئے سڑک کو پار کیا۔ اپنی موٹر سائیکل کے پاس پہنچ کر اسے اسٹارٹ کرنے لگا۔ ایک بار، دو بار، تین بار وہ پڑلے پر جھٹکے گا۔ مارتا رہا۔ اس کا انجین جاکتا تھا۔ پھر سو جاتا تھا۔ وہ بار بار اسٹارٹ کرنے کے دوران دور جاتی ہوئی بس کو دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ بس کا روٹ کیا ہے۔ کس راستے پر جاتی ہے اور وہ روٹھ کر جانے والی کہاں گئی ہے؟

اس نے غصے میں آنر گاڑی کو لات مارنے کے لیے جینز پر ہاتھ رکھ کر ضبط کرنے لگا۔ اس کے بعد ایک گہری سانس لے کر موٹر سائیکل تھپکتے ہوئے بولا۔ ”تم نہیں جھڑکی ہو۔ تقدیر بگڑی ہے۔“

تیسرا دن پھر یہی مگر رگید کوئی بات نہ بن سکی۔ اس روز اس نے گاڑی کی اچھی طرح مرمت کرائی۔ جب یقین ہو گیا کہ وہ بالکل رنگ کنڈیشن میں ہے تو چوتھے دن دس بجے سے پہلے ہی بس اسٹاپ سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ پچھلے دن کی طرح ٹھیک پونے دس بجے گھر سے نکلی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ صبح وقت پر گھر سے نکلتی ہے اور کسی ضرورت سے کہیں جاتی ہے۔ گلی کے کنارے آتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ نظریں چار ہوئی تھیں۔ اس نے ناگوار سے دیکھا۔ پھر اس طرح ادنہ کہہ کر منہ پھیر کر جیسے اس سے شدید نفرت ہو، وہ سڑک پار کرنے لگی۔ کامران نے کہہ دیا۔ ”پلیز مجھے معافی کا موقع دو۔ میں بے قصور ہوں۔“

ایسا کہنے کے دوران وہ سڑک کے دوسری طرف جا چکی تھی۔ بس بھی آگئی تھی اور اب وہ سوار ہو کر جانے والی تھی۔ وہ اس کی آوازیں میں گم ہو گیا۔ اس کی نفرت میں بھی بالائی دلہنی تھی۔ ادنہ کہہ کر منہ پھیرنے اور دور جانے میں پاس بلانے کی ترغیب تھی۔ ایک پہنچ تھا۔ مناسکتے ہو تو کسی طرح منالو۔

”میں آتا رہوں گا۔ بیش آتا رہوں گا۔ جو خطاوار ہوتے ہیں، وہ منہ چھپاتے ہیں۔ میں نے کوئی خطا نہیں کی ہے۔“

کنڈیکٹر نے بس ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے آواز دی۔ ”استاد سائیکل مارو۔ ایک بندہ مرنا چاہتا ہے۔ ویسے بھی کراچی کے ڈرائیور بندے مارنے میں مشغول ہیں۔“ یہ سننے ہی ڈرائیور نے بس کی رفتار تیز کر دی۔ پھر اسے دائیں بائیں گھمانے لگا۔ یقیناً وہ سائیکل مارنا چاہتا تھا۔ موت نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ موٹر سائیکل کو اس طرح دائیں بائیں گھماتا آ رہا تھا۔ بس اس کے قریب آنا چاہتی تو وہ ڈرا دور ہو جاتا۔ دوسری طرف گھومتی تو وہ اس کے قریب چلا آتا۔ ایک بار یوں لگا جیسے وہ موٹر سائیکل توازن قائم نہ رکھ سکا ہو۔ بس سے ٹکرانے ہی والا ہو۔ موت نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

چند لمحوں تک اس کا دل دھڑکتا رہا۔ یہی سمجھ میں آتا رہا کہ اب تب اس کے حواس کی خبر سنائی دے گی لیکن اس کا قہقہہ سنائی دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”واہ صاحب! کوا ادائیں ہیں۔ خود تو نفرت سے مارتے ہو۔ ہم مرنا چاہیں تو محبت سے آنکھیں بند کر لیں۔“

بس ایک اسپتال کے اسٹاپ پر رکنے لگی۔ وہ موٹر سائیکل کی رفتار بڑھاتا ہوا وہ لکھا لکھا گیا تاکہ وہ آگے بڑھے گی تو پھر اس کے ساتھ ریس لگائے گا۔ ایک منٹ کے، وہ نی وہ اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے پھر موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور اسے آگے بڑھانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بس کے برابر ریس لگا رہا تھا۔ زنانہ درجے کے دروازہ کے پاس پہنچ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید اسے پیٹھ کے لیے سیٹ مل رہا ہو۔ وہ موٹر سائیکل کی رفتار کبھی گھٹاتے ہوئے، کبھی بڑھاتے ہوئے، بیٹوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے باوجود وہ نظر نہیں آئی۔ کچھ شیشیں ایسی تھیں جو باہر سے نظر نہیں مل سکتی تھیں۔ وہ سب ان میں سے کسی سیٹ پر بیٹھی ہو۔

ایک اور اسٹاپ آگیا۔ گاڑی دہل رکی تو اس نے موٹر سائیکل کو ایک جگہ روک کر زنانہ درجے کے پاس آکر دیکھا۔ کچھ عورتیں اتر رہی تھیں۔ کچھ سوار ہو رہی تھیں۔

وہ دوڑتا ہوا مردانہ جسم میں پچھلے پھر بد سے چڑھ کر زنانہ درجے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ دُجو نہ نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے دیکھتے ہی آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گئی ہو۔

لیکن وہ غائب کیسے ہو سکتی تھی؟ وہ اسے دیکھتا آ رہا تھا۔ یقیناً پچھلے اسٹاپ پر اتر گئی ہوگی۔ بس آگے بڑھنے لگی۔ وہ جلدی سے نیچے اتر گیا۔ مایوسی سے چلتا ہوا موٹر سائیکل کے پاس آیا۔ پھر اسے اسٹارٹ کر کے پچھلے اسٹاپ کی طرف جانے لگا۔ پچھلی منزل میں یہ مہموم کربا نہتہ مشکل تھا کہ وہ کہاں گئی ہے۔ ایک طرف بڑا اسپتال تھا۔ دوسری طرف اسکول اور اسکول کے ساتھ ہی ایک بہت بڑی عمارت تھی اس میں مختلف دفاتر تھے۔ اب وہ ان دفاتر میں کیسے کام کرتی تھی۔ اسکول میں بچوں کو پڑھاتی تھی یا ہسپتال میں ملازمت کرتی تھی۔ وہ کیا کرتی تھی؟ کہاں تھی؟

اس نے باری باری تمام جگہ تلاش کرنا شروع کیا۔ وہ دس بجے اس اسٹاپ پر پہنچا تھا۔ دو بجے دہریک اسے ڈھونڈنا ہی رہا مگر وہ نظر نہیں آئی۔ اسے تھک ہار کر واپس آنا پڑا۔ اس نے فیصلہ کر لیا اگلے روز وہ موٹر سائیکل کو بس کے پیچھے دوڑاتا رہے گا۔ آگے نہیں جائے گا اور دیکھتا رہے گا کہ کس اسٹاپ پر اتر کر کہاں جاتی ہے۔

اس طرح پانچواں دن گزرنے لگا۔ پچھلے دن وہ بس اسٹاپ پر کھڑا رہا لیکن وہ اپنے کمرے سے نکلی ہوئی کھلی سے گزرتی ہوئی یا بس میں سوار ہوتی ہوئی نظر نہیں آئی۔ اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ محبت کے جنون میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ پریشان ہو کر سوچتا تھا۔ آخر کہاں تم ہو گئی؟ کیوں نظر نہیں آتی؟

اگر وہ بیمار ہو گئی ہے تو میں اس کے گھر جا کر دو دن نہیں کر سکتا۔ دعا کر سکتا ہوں کہ وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی، اس کی بیماری ہی مجھ مل جائے تاکہ وہ چلتی پھرتی نظر آئے۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ وقت دھمکی دے رہا تھا کہ جلدی گزر جائے گا اور ہنسیاں ختم ہو جائیں گی۔ وہ صبح لکھا تھا اور تمام دن مارا مارا پھرتا تھا۔ کبھی بس اسٹاپ کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا تھا کبھی اس چوڑیوں کی دکان کے پاس پہنچ کر گھنٹوں اور گھنٹوں دیکھتا رہتا تھا۔ کیا وہ کبھی چوڑیاں پہننے بھی نہیں آئے گی؟

ایک دن اس کی می نے پوچھا۔ ”تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ کم از کم شیوہ کر

نہی کیا ہے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی اپنے دولہا بھائی کا بازو پکڑ کر ایک طرف ہٹ گئے۔
”نفس ہو گیا۔“

اس کی آپا اور بیٹنی نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”ایکڈنٹ ہو گیا۔ مجھ فوراً جانا ہے۔ آپ ایک سے سو تک گنتے رہیں۔ میں ابھی آؤں۔“

اس دوران میں موٹر سائیکل اشارت ہو چکی تھی۔ وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اسے اشارت کرتے ہوئے اس کی رفتار بڑھاتے ہوئے مکان کے احاطے سے نکلا۔ گلی سے گزرا ہوا دوسری گلیوں کو عبور کرتا ہوا اس سڑک پر پہنچ گیا جس کے بس اسٹاپ پر وہ اُبلتی تھی۔

نیک پونے دس ہوئے تھے۔ ایک برقی والی گلی نمبر دس سے چلی آ رہی تھی۔ وہ اسے فورے دیکھنے لگا۔ سرے پاؤں تک جائزہ لینے لگا۔ کیا یہ وہی ہے؟

وہ سڑک کو پار کر بس اسٹاپ کی طرف گھوم کر چلی گئی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا وہی لیکن اسے مخاطب کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بس آئی اور وہ سوار ہو کر جانے لگی۔

اس نے موٹر سائیکل اشارت کی اور اس کے تعاقب میں چل پڑا۔

ہر اسٹاپ پر وہ بس کے پیچھے رک جاتا تھا۔ توجہ سے دیکھتا تھا کہ برقی والیاں بس

اتنی ہیں۔ یوں تو برقی ایک جیسے ہوتے ہیں اور زیادہ تر سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں لیکن ایرانی ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ اس نے برقی کے ڈیزائن کو اور برقی والی کے چہل قدمی کو توجہ سے دیکھا تھا اور اس کی پہچان رکھی تھی۔

آخر وہ ہسپتال کے اسٹاپ پر اتر گئی۔ کامران نے اس کے برقیے اور سینٹرل کو اٹھایا۔ ایک طرح سے اور تصدیق ہو گئی۔ وہ بس سے اترنے کے بعد باہر آدھر دیکھ رہی تھی۔ کامران پر نظر پڑے ہی فوراً تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہسپتال کے احاطے میں داخل ہو گئی۔

اس کی اداؤں سے گھبراہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ بار بار پلٹ کر اسے دیکھتی تھی۔

4 لڑی سے چلتے گنتی تھی۔ کامران نے ہسپتال کے احاطے میں پہنچنے ہی ایک طرف گاڑی

لیا کر۔ اچھے کپڑے پہنا کر۔ آج لڑکی والے تمہیں دیکھنے آرہے ہیں۔ بہت بڑا گھرانہ ہے۔ ان کی اکلوتی لڑکی ہے۔ ماں باپ کے بعد ساری دولت اور جائیداد اسی کی ہوگی۔“

”مجھے دولت اور جائیداد نہیں۔ صرف شریک حیات چاہیے۔“

”ہاں! ہاں میں خوب سمجھتی ہوں۔ اسی کے پیچھے دیوانہ بنا گھومتا رہتا ہے۔ کیا حالت بنائی ہے اپنی؟ چندہ دن گزر چکے ہیں۔ چھٹی کے صرف چندہ دن رہ گئے ہیں۔ اب جانے گا تو پتا نہیں کتنے برسوں کے بعد آئے گا۔ میں اس بار بھولا کر رہوں گی۔ اب مجھ سے گھر کی ذمہ داریاں سنبھلی نہیں جاتیں۔“

اسی وقت ایک عورت برقی پن کرڈرائنگ روم میں آئی۔ اس کی می نے پوچھا۔
”اے بس! تم کون ہو؟“

اس نے برقی اشارتے ہوئے کہا۔ ”لو! پہچان لو۔“
وہ ایک بوڑھی عورت تھی۔ اسے دیکھتے ہی می نے کہا۔ ”اے ہے! یہ تم ہو؟ کب برقی کیوں پہن لیا؟“

”کیا کروں بس! میں نے تمہارے بیٹے کا رشتہ لگایا ہے اس محلے میں اور دوچار لڑکے والے ہیں۔ سب یہی کہتے ہیں، ہمیں اسی دولت مند لڑکی کا رشتہ چاہیے۔ اسے کتنے ہیں ایک انداز اور پیار۔“

اس کی می نے کہا۔ ”سن رہے ہو گا! اس لڑکی کے لیے دنیا دیوانی ہے۔ یہ تو ہماری بوا کی محبت ہے کہ یہ رشتہ ہمارے لیے روک رکھا ہے۔“

بوا نے کہا۔ ”اسی لیے آج برقی پن کر آئی ہوں۔ سوچا دوسرے گزروں کی تو محلے والے مجھے دیکھ کر گھبریں گے مجبور کریں گے۔ منہ کی مروت ہوتی ہے بس۔ منہ چھپانے کے لیے آج پہن لیا۔“

کامران نے ایک دم سے چپک کر کہا۔ ”برقی؟“ اس نے برقیے کو دیکھا۔ پھر کھڑکی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اوہ گاڈ! اتنے دنوں سے مجھے اتنی سی عقل نہیں آئی۔ برقی۔“

یہ کہتے ہی وہ دوڑتا ہوا باہر آیا۔ باہر اس کا بیٹنی موٹر سائیکل اشارت کر رہا تھا اور

اس نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا اس کے ساتھ ہی منظر بدلنے لگا۔ چوڑیوں کی دکان نظر آ رہی تھی۔ وہ کافٹر کے پاس سے پلٹ رہی تھی۔ ایک بیک اپنے سامنے اجنبی کو دیکھ کر ٹھک گئی۔ وہ اتنا قریب تھا جیسے سانسوں میں اترنا چاہتا ہو۔

کوئی اتنے قریب کبھی نہ آیا تھا پہلے خواب آتے تھے، دھندلا سا تصور ہوتا تھا۔ اب وہ تصور مجسم ہو کر عین نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا۔ چہرے پر شرفی۔ آنکھوں میں اتنی گہری چمک تھی جیسے اپنی طرف کھینچ رہی ہوں۔ محبت سے غم دے رہی ہوں۔ ”چلی آؤ۔ میری طرف چلی آؤ ورنہ جھپٹ لوں گا۔“

اور وہ یکبارگی سہم کر چلچلی پڑی تھی۔

وہ منظر ڈھواں ڈھواں ہو گیا۔ آئینے کے فریم میں جیسے ڈھواں بھر گیا ہو۔ جب وہ چمنے لگا تو دوسرا منظر دکھائی دیا۔ مونا اپنی آپا اور بھونٹی کے ساتھ ایک کمرے میں تھی۔ اس کا بھونٹی کمزری کی طرف سے پلٹ کر کہہ رہا تھا۔ ”وہ آ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا پیکٹ ہے یقیناً ہمیں یہ توقف بنانے کے لیے کسی مروت خان کے نام سے تحفہ لا رہا ہے۔“

اس کی آپا نے کہا۔ ”اور آپ وہ تحفہ قبول کرنا چاہتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آج سے پہلے آپ نے ایک پیسے کی بے اہمائی نہیں کی۔ پھر یہ کیا حرکت ہے؟“

”بیگم! میں نے جیسا سمجھایا ہے دیے ہی کرنا۔ جیسے ہی آواز دہن، تم کتنا مروت خان کا ٹیکرام آیا تھا، ہم نے بڑھ کر کہیں رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ گم ہو گیا۔“

مونا نے کہا۔ ”دوسرا بھائی یہ تو اور زیادہ بے اہمائی ہو گی۔ آپ اس تحفے کے بعد اس سے اسٹیرو کیٹ ریکارڈر وصول کرنا چاہیں گے۔“

خلیل احمد نے مونا کو گہری سنجیدگی سے دیکھا پھر بڑی نرمی سے کہا۔ ”تم میرے گھر میں جو ان بیٹی کی طرح ہو اور میں ایک باپ کی ذمہ داریوں کو محسوس کرتا ہوں۔ تمہیں کوئی بھی پسند کرے گا تو میں اسے ہر طرح سے پرکھنے کا سمجھنے کا حق رکھتا ہوں۔ مجھے اپنے طور پر پرکھنے دو۔ میں نے تم لوگوں کو یقین دلایا ہے اس سے کیٹ ریکارڈر وصول کرنے

کمزری کردی تھی اور اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اس کی جرات نے لڑکی کو اور پریشان کیا۔ وہ ہسپتال کے برآمدے میں آئی۔ ایک بار پلٹ کر دیکھا۔ پھر تیزی سے چلتے ہوئے اس طرف جانے لگی جہاں مختلف ڈاکٹروں کے کمرے تھے۔ ان کے بعد آپریشن ٹیمیر تھا۔ ادھر عام آدمیوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ ایک کوریڈور میں مڑ گئی۔ آگے جا کر پلٹ کر دیکھا تو وہ نظر نہیں آیا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ یقیناً ہسپتال کے دربان نے یاد دہرائے نے اسے ادھر آنے سے روک دیا ہو گا۔

وہ ایک بڑے سے کمرے میں آئی۔ وہاں کئی نرسیں لباس بدل رہی تھیں یا میک اپ درست کر رہی تھیں۔ جن کی ڈیوٹی ختم ہو چکی تھی وہ جانے کی تیاری کر رہی تھیں اور جنہیں ڈیوٹی پر حاضر ہونا تھا وہ نرس کا مخصوص لباس زیب تن کر رہی تھیں۔

وہ کمرے میں آتے ہی برقع اتارنے لگی۔ اس پہلے ہی سفید لباس پہن رکھ تھا نرس بننے کے لیے ہلکی سی تبدیلی کی ضرورت تھی۔ وہ آئینے کے سامنے آکر سر بردہ رد مال کیپ پہننے لگی، جو نرسوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ اس کے قریب کمزری ہوئی نرس نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے۔ آج بہت دنوں بعد پھر پریشان نظر آ رہی ہو؟“

”اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔“

”مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔ برقعے میں بھی پہچانی جاؤ گی۔ کتنی بار سمجھایا ہے، جب تر چلتی ہو تو سب سے الگ نظر آتی ہو۔“

”آخر میری چال میں کیا ہے؟“

”یہ پوچھو کیا نہیں ہے۔ جب چلتی ہو تو لگتا ہے گوار چل رہی ہے۔“

”مذاق نہ کرو۔ میں بہت پریشان ہوں۔ آج تو وہ میرے پیچھے ہی پڑ جائے گا۔“

”اس سے ڈرتی بھی ہو، اس کا ذکر بھی کرتی ہو، خود کو اس سے بچا کر یہاں تک

لے آئی ہو لیکن دھیان ادھر ہی اٹکا ہوا ہے۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میرا دھیان میری ہی طرف ہے۔“

”ان حالات میں زبان جھوٹ کتنی ہے چہرہ سچ کتنا ہے۔ یقین نہ ہو تو آئینے کے

سامنے ہو خود دیکھ لو۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔ ”کسی کا راستہ روکنا دانش مندی نہیں ہے۔ وہ نانا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جوانی دریا کی روانی ہوتی ہے، اس کا راستہ روکو تو وہ راستہ بدل کر دوسری طرف بہتی ہے۔ وہ ہمارا پتا پوچھ رہا تھا۔ ہمارے گھر آنا چاہتا تھا۔ اگر کوئی سیدھے راستے سے آنا چاہے تو اس کے منہ پر دروازہ نہیں بند کرنا چاہیے۔ ورنہ آنے والے دیواروں میں شگاف ڈال کر آ جاتے ہیں البتہ اسے یہاں تک بلانے کا اندازہ جادوگر تھا۔ وہ خود کو دانش مند اور مجھ کو احمق سمجھ کر پتا معلوم کر رہا تھا۔ میں نے خود کو دانش مند اور اسے احمق سمجھ کر اس سے یہ ڈراما شروع کیا۔ میری نیت صاف تھی۔ میں اس سے تحائف وصول کرنے کے بعد اس کے والدین کو واپس کرنا چاہتا تھا تاکہ اسے صحت ہو اور وہ آئندہ زندگی کے معاملات میں سیدھا راستہ اختیار کرے۔ سیدھی طرح دروازے پر آئے اور دستک دے لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ تکمیل دیانت داری سے شروع کروں گا اور بے ایمان ٹھہرا جاؤں گا۔“

آپا نے کلمہ ”ایک طرح سے آپ نے اچھا ہی کیا۔ اس طرح ان کی کم عمری کا پتا چل گیا۔ اب ایسے لوگوں پر لعنت بھیجئے۔“
مونا گم گم کھڑی سوچ رہی تھی۔ اچانک منظر بدل گیا۔ وہ گلی کی کھڑ پر تھی اور دوسری طرف کامران موٹر سائیکل کے قریب نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے نفرت کا اظہار کیا اور غصہ دکھاتے ہوئے ”سڑک پار کرتے ہوئے جانے لگی۔“
آپا نے فریم میں منظر بدلتے جا رہے تھے۔ لوگوں نے کامران کے گریبان کو پکڑ لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اچھا تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”مجھے صفائی کا موقع دو۔ میری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔“

منظر پھر بدل گیا۔ وہ بس کے ساتھ موٹر سائیکل کی ریس لگا رہا تھا اور اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ پریشان تھی۔ سہی ہوئی نظروں سے کبھی اسے دیکھتی تھی۔ کبھی نظریں چرائیتی تھی۔ وہ بلند آواز سے کنڈیکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”جب میں کسی کے ساتھ چلنے کا ارادہ کر لیتا ہوں تو اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلا ہوں۔ اگر وہ بھاگتا ہے تو میں چاہے تو اس کے ساتھ دوڑنا بھی جانتا ہوں۔“

کے بعد تمام چیزیں اس کے والدین کو واپس کر دوں گا۔“
اسی وقت دروازے پر دستک دینے کی آواز سنائی دی۔ اس نے کلمہ ”میں جا رہا ہوں۔ اس سے باتیں کرتا ہوں۔ یاد رکھنا اس بار اس سے اسٹیرو کیسٹ ریکارڈز کا مطالبہ کرنا ہے۔“
وہ دروازے کی طرف جانے لگے۔ مونا انہیں ایسے دیکھ رہی تھی جیسے یہ سب کچھ اسے پسند نہ ہو لیکن بے بس ہو۔ بیروں کے درمیان کوئی اس کی سننے والا نہ ہو۔
وہ منظر بھی دھواں دھواں ہو گیا۔ جب دھواں پھٹنے لگا تو ایک خواب گاہ کا منظر دکھائی دیا۔ رات کا وقت تھا۔ خلیل احمد بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ پاس ہی وہ بڑا سا پینٹ رکھا ہوا تھا جو کامران دے گیا تھا۔ اس کی آپا کہہ رہی تھی۔ ”اسے کھول کر تو دیکھیں۔“
آخر کیا ہے؟“

”اس میں جو کچھ بھی ہے، ہمارا نہیں ہے۔ جس کا ہے اس کے پاس واپس جانے والا ہے۔“
مونا نے کمرے میں آکر کلمہ ”دوسرا بھائی! مجھے یہ بالکل پسند نہیں ہے۔ میں یقین سے کہتی ہوں، کل وہ جانے کتنا قیمتی کیسٹ ریکارڈز خرید کر لے آئیں گے۔ جب سوچتی ہوں، یہ سب میرے لیے ہو رہا ہے تو بڑی شرم آتی ہے۔ پلیز، آپ اسے واپس کر دیں۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ کیا ضروری ہے کہ اسے ریکارڈز خریدنے پر مجبور کریں۔ اتنی آزمائش کافی ہے۔ میں اس کے والد سے کل صبح ہی ملنے جاؤں گا۔“
منظر پھر دھواں دھواں سا ہو گیا۔ جب وہ دھواں پھٹنے لگا تو خلیل احمد کی کمر بجلی ہوئی نظر آئی۔ وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر جھکے ہوئے تھے۔ بڑے ہی دل برداشتہ ہو کر کہہ رہے تھے۔ ”مجھے ان لوگوں سے ایسی توقع نہیں تھی۔ ایک تو ان کا مال واپس کرنے گیا اوپر سے چور کھلایا۔“

آپا نے کلمہ ”میں اسی دن کے لیے منع کرتی تھی۔ کیا ضرورت تھی اس لڑکے کو لفٹ دینے کی؟“

اور وہ بس کی تیز رفتاری کے ساتھ اپنی تیز رفتاری کا ثبوت دیتا جا رہا تھا۔
منظر بدل گیا۔ وہ گہرائے ہوئے انداز میں ہسپتال کے کمرے میں پہنچی۔ وہاں
نرسیں اپنا لباس تبدیل کر رہی تھیں۔ اس کی اسی سبیلی نرس نے پوچھا ”کیا بات ہے؟“
”وہ میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ آج اس نے موٹر سائیکل پر بیچھا کیا ہے۔ یہاں بھی
یقیناً آتا ہی ہو گا۔“

”پریشان کیوں ہوتی ہو۔ تم اسی کمرے میں رہو۔ آج میں تمہاری ڈیوٹی سنبھال
لوں گی۔“

موتا نے اطمینان کی سانس لی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ منظر پھر بدل گیا۔ اب وہ اپنے
گھر میں تھی اور ایک سیاہ برقع پہنے ہوئے تھی۔ اس کی آبا کرا رہی تھی۔ ”یہی مناسب
ہے۔ کسی کے منہ کھلنے سے بہتر ہے“ اپنے بچاؤ کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے۔ انہو
عزت اپنے ہی ہاتھ ہوتی ہے۔“

وہ برقع پہن کر گلی کی کھڑ پر پہنچی۔ دیکھا تو کامران موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا اس کے
مکان کی طرف، اس کی گلی کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس برقعے والی کو نہیں پہچان رہا تھا۔
اس کے باوجود وہ گھبرا رہی تھی، جیسے پہچان لی جائے گی۔ وہ سڑک پار کر کے بس اسٹاپ کی
طرف جانے لگی۔

منظر پھر بدل گیا۔ وہ برقع پہنے ہوئے چوڑیوں کی دکان میں تھی۔ چوڑیاں پسند کر
رہی تھی۔ اور بار بار سرگھما کر باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کامران کھڑا ہوا تھا۔ وہ اس
لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو چوڑیوں کی دکان میں داخل ہوتی تھی یا اس دکان سے باہر نکلتی تھی پھر
وہ وہ رہ کر باپس ہو جاتا تھا۔

☆ ----- ☆

منظر بدل گیا۔ وہ اپنی گلی سے نکل کر سڑک پار کرتے ہوئے بس اسٹاپ کی طرف جا
رہی تھی۔ کامران نظر آ رہا تھا۔ اب اس کا شیوہ بڑھا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔

پہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ وہ بہت پریشان تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اپنا سب کچھ
لٹانے کے بعد کسی محتاج کی طرح سڑک کے کنارے سوالی بن کر کھڑا ہو گیا ہو۔

موتا پہلے برقع پہن کر ہسپتال آئی تھی۔ فاطمہ نے انداز میں مسکراتی ہوئی برقع اتارتی
تھی۔ جیسے دشمن کو شکست دے کر آ رہی ہو۔ اب وہ عرصہ حال ہی ہو کر ہسپتال کے کمرے
میں داخل ہوتی تھی بہت جلد سے ہوئے انداز میں برقعے کو اتارتی تھی اور سوچتی رہ جاتی تھی
اور یوں سوچنے کے دوران پھر چوڑیوں کی دکان کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ اب وہ دکان
نے اندر نہیں گئی تھی۔ دور ہی سے دیکھ رہی تھی۔ کامران وہاں کھڑا ہوا۔ دکان میں
آنے جانے والی ہر لڑکی کو دیکھ رہا تھا اور باپس ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اسے تلاش کر
رہی تھیں۔ وہ موجود تھی مگر پردے کے پیچھے تھی۔ وہ برقع ایک بند دروازہ تھا۔ صرف
دروازہ کھلنے کا دیر تھی۔ وہ نظر آتی تو دیوانہ دوڑا چلا آتا لیکن گھربا ہوتا ہے وہ رہنا ہوتا
ہے، مرضی اپنی ہوتی ہے۔ اس کی اپنی مرضی تھی کہ وہ دروازہ کھولے یا بند رکھے۔ اس کا
ہاتھ دروازے تک جاتا تھا۔ وہ ہچکچاتی تھی۔ پھر ہاتھ واپس آ جاتا تھا۔ وہ دروازہ کھولتے
کھولتے رہ جاتی تھی۔

آئینہ صاف ہو گیا۔ تمام مناظر مدھل گئے۔ وہ خود کو آئینے میں نرس کے روپ میں
دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ آئینے کی طرف سے پلٹ کر جانے لگی۔ اس کی سبیلی نے کلمہ ”تم جا
رہی ہو اور تمہارا وہ موٹر سائیکل پر تمہارا بیچھا کراتے ہوئے یہاں پہنچ گیا ہے۔“

☆ ----- ☆

وہ جاتے جاتے دروازے پر رک گئی۔ پھر کچھ کسے بغیر آگے بڑھ گئی۔ جیسے عزم کر
لیا ہو کہ دروازہ کھول دینا چاہیے جو وہ گا دیکھا جائے گا۔ وہ کمرے سے باہر نکل۔ ایک
کورڈر سے لے ہوئی ہوئی دوسرے کورڈر میں آئی پھر ٹھک گئی۔ وہ سامنے کھڑا ہوا تھا۔
پندرہ ٹھکوں تک دونوں ساکت رہے۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ پھر وہ
نظریں چرا کر اس سے کتراتے ہوئے جانے لگی۔ وہ اس کے برابر چلتے ہوئے بولا۔ ”مجھے

صفائی کا موقع دو۔ میں راتوں کو سو نہیں سکتا۔ میری نیند اڑ گئی ہے۔ میری بیوی کہہ رہی ہے۔ میں آہستہ آہستہ مرنے جا رہا ہوں۔“

وہ چلتے چلتے ایک دم سے رک گئی۔ ذرا گھبرا گئی۔ اس کا ہاتھ بے اختیار ا۔ دھڑکتے ہوئے دل پر پہنچ گیا۔ پھر اس نے تیری بدل کر ذرا سخت لمبے میں پوچھا۔ ”آخر کیا چاہتے ہو؟ کیوں میرا پیچھا کر رہے ہو؟“

”میں اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میری کوئی خطا نہیں ہے۔“

”میں نے مان لیا۔ تمہاری کوئی خطا نہیں ہے۔ اب پیچھا چھوڑ دو۔“

”جب بے قصور مان رہی ہو تو پیچھا کیوں چھڑا رہی ہو۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اس روز میرے والدین غلط فہمی کی بنا پر غلیل صاحب سے فارو سلوک نہ کرتے تو اب تک ہمارے درمیان کی ساری دیواریں گر چکی ہوتیں اور تمام بن دروازے کھل چکے ہوتے۔ آج تم میری شریک حیات ہو تیں۔ مجھ سے پیچھا چھڑانے کا بات نہ کرتیں۔“

اس نے فوراً ہی دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ ”میں ڈیوٹی پر ہوں۔ آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

”میں بھی ڈیوٹی پر ہوں۔ دل کا معاملہ پیش کرنا دنیا کی سب سے بڑی ڈیوٹی ہے۔ نوجوانی کا سب سے اہم تقاضا ہے۔“

وہ ایک کمرے کے سامنے رک گئی۔ ”پلیز چلے جائیں۔ کیا آپ مجھے بدنام کرنا چاہتے ہیں؟“

”میں تمہیں اپنا نام دینے آیا ہوں۔ بدنام کرنے کے لیے نہیں۔ اگر مجھ سے ڈر لگتا ہے تو میں قریب نہیں آؤں گا لیکن دور ہی دور سے ضرور دیکھ رہوں گا۔“

وہ کوئی خواب سننے بغیر آگے بڑھ گیا۔ وہ چند لمحوں تک اسے دیکھتی رہی۔ پھر کمرے کے اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈیوٹی پر تھی پھر بڑے ڈاکٹر کے ساتھ راولپنڈی پر نکلی تو اس نے کامران کو برآمدے میں دیکھا۔ وہ اپنے وعدے کے مطابق دور تھا۔ اسے

مطلب نہیں کر رہا تھا۔ بس اسے دیکھتے جا رہا تھا۔

اس کا دیکھنا ہی قیامت ڈھا رہا تھا۔ موتا سے کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کی ہدایات کو سنتی تھی۔ مریضوں کی طرف توجہ دیتی تھی لیکن دھیان اس کی طرف چلا جاتا تھا۔ کبھی میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی طرف سے منہ پھیرنے کے باوجود دل کیوں نہیں پھرتا۔

عورت اپنی اتنا سے مجبور ہے۔ وہ زبان سے چاہت کا اظہار نہیں کرتی مگر غیر شعوری طور پر چاہتی ہے کہ اسے کوئی چاہت دیکھتا رہے۔

اور وہ دیکھ رہا تھا۔ اس اعتماد سے دیکھ رہا تھا کہ اس کی فریادی نگاہیں موتا کے دل پر دستک دے رہی ہیں۔

(ہر شخص ماہر نفسیات نہیں ہوتا لیکن محبت ایک دوسرے کی نفسیات سے کھیلنے کا طریقہ سمجھا دیتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ عورت آہستہ سے زیادہ مرو کی آنکھوں میں سنورنا چاہتی ہے اور یہ جانتی ہے کہ مرد ایک بار اس کا ہاتھ تھامنے کی شدہ کر لے تو پھر ایک بار نہیں! بار بار جنت سے نکلے جانے کی پروا نہیں کرتا۔)

اسسٹنٹ ڈاکٹر نے آکر اطلاع دی۔ ”سر! آپریشن کے تمام انتظامات مکمل ہیں لیکن خون دستیاب نہیں ہو رہا ہے۔“

”کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ کیا کسی بلڈ بینک میں نہیں ہے۔“

”جی نہیں۔ دیے بھی او نیگیٹو بڑی مشکلوں سے دستیاب ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں خون دینے کی روایت بہت کم ہے۔ لوگ اس سلسلے میں تعاون نہیں کرتے۔“

دووں ڈاکٹر باتیں کرتے ہوئے ہسپتال کے برآمدے سے گزر رہے تھے۔ موتا ان کے ساتھ تھی۔ چاکلی کامران نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے کہے۔ ”ڈاکٹر! میرے خون کا گروپ او نیگیٹو ہے۔ میں خون دینے کے لیے تیار ہوں۔“

اس کی پیش کش سننے ہی وہ چلتے چلتے رک گئے۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”کیا تم مریض کے رشتہ دار ہو؟“

”جی نہیں۔“

”جی ہاں، پہلی ملاقات سے آج تک دستک دیتا چلا آ رہا ہے۔“

”تم دل کا دروازہ کھولنا کیوں نہیں چاہتیں؟“

”میں ڈرتی ہوں۔ دروازہ کھولوں گی تو یہ مجھے جیت کر لے جائے گا۔“

”تمہیں اس کی جیت پر کیا اعتراض ہے؟“

”سب سے پہلا اعتراض تو یہ کہ یہ سات سمندر پار سے آیا ہے، آج آیا ہے کل

چلا جائے گا۔ میں ایک کمزور عورت ہوں۔ ایک بار دل ہارنے کے بعد سات سمندروں کو

عبور کر کے اپنے چاہنے والے تک نہیں پہنچ سکوں گی۔“

کامران نے اپنے چلو میں بھرے ہوئے لو کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”اے منصف

اعلیٰ! میں اپنے بازوؤں کی کشتی ہڈاؤں کا اور لو کے دریا سے گزر کر اپنی مونا کو اپنے ساتھ

لے جاؤں گا۔“

مونا نے کہا۔ ”اے منصف اعلیٰ! ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک پہنچنے کے

لیے اجازت نامہ چاہیے۔ صرف دل کی بات ہو تو میں اجازت دے سکتی ہوں۔ اس کے

بعد بزرگوں کی اجازت چاہیے لیکن اس دیوانے کے بزرگ مغرور ہیں۔ اپنے سامنے

دوسروں کو کتر سمجھتے ہیں۔ انہوں نے میرے خاندان والوں پر کچھ اچھلا ہے، ہماری

شرافت کو گالیاں دی ہیں جب مجھے اس کے بزرگوں سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ نہیں مل سکتا تو

پھر میں اپنے دل کا دروازہ کیوں کھولوں؟“

کامران نے کہا۔ ”عورت کا کیریکٹر سرٹیفکیٹ اس کا شوہر ہوتا ہے۔ میں یقین دلاتا

ہوں کہ میرے رویے سے گھروالوں کا رویہ تبدیل ہو جائے گا۔ میں چاہوں گا تو گھر والے

چاہیں گے ایک باغ کا مال، جتنی لگن سے باغ کو بیٹے جانتے ہی خوبصورت پھول کھلتے جاتیں

گے اور میں اپنے لو سے پھولوں کی جنت کو بیٹھتا رہوں گا۔“

اس نے چلو میں بھرے ہوئے لو کو ایک طرف چمڑک دیا۔ جہاں لو جا کر گرا،

وہاں پھول کھلتے گئے پھر اس نے اپنے دل کی طرف ہاتھ رکھا۔ وہاں خنجر بیست تھا اور لو

رس رہا تھا۔ چلو پھر خون سے بھر گیا۔ اس نے دوسری طرف اپنے خون کو چمڑکا وہاں بھی

پھول کھلتے گئے۔ وہ لو سے بیٹھتا جا رہا تھا۔ پھول کھلتا جا رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا۔ ”میں

انہ کے انداز کی خود کشی کروں گا۔ مجھ میں مر جاؤں گا۔ اپنا خون دیتا جاؤں گا۔ دوسرے

انسانوں کی زندگیوں کو پھولوں کی طرح کھاتا جاؤں گا تاکہ میرے بعد بھی محبت مر نہ سکے۔

دوسروں کی صورت میں ہمیشہ زندہ رہے۔“

منصف اعلیٰ نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”ادب ادب! بہت ہو چکا۔ اس سے

پہلا کہ کوئی بے موت مر جائے ضمیر کا فیصلہ ہے کہ حسن اپنی شکست تسلیم کر لے۔ ورنہ

محبت کا لو صرف پتھروں کو نہیں فلواد کو بھی پھول بنا دیتا ہے۔“

کامران نے ایک چمچہر لو اپنے دل سے لیا اور اسے مونا کی طرف اچھلا دیا۔ وہ

سر ہا فلوادی ذخیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ لو کے چھینٹے پڑتے ہی وہ پھولوں کی ذخیریں

بن گئیں۔

اس نے یکبارگی چونک کر دیکھا۔ کوئی منصف اعلیٰ نہیں تھا، وکیل نہیں تھا اور نہ ہی

ضمیر کی عدالت کا کمرہ تھا۔ وہ ہسپتال کے کمرے میں تھی۔ اس کے سامنے کامران بستر پر

ہوا تھا اور محبت کے نام پر خون کا عطیہ دے رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بستر کے سرے پر بیٹھ

گئی اپنے سر کو ہچکا لگی۔ جیسے ضمیر کی عدالت کے فیصلے کے آگے جھک گئی ہو۔ پھر اس نے

ٹہراتے ہوئے جھجکتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

☆-----☆-----☆

محبت کا مسئلہ کبھی آسمانی سے حل نہیں ہوتا۔ ایک قسمی سلجھانے کے بعد دوسری

المنحی جلی جاتی ہے۔ مونا اگرچی جی جان سے اس کی ہو گئی تھی پھر بھی اسے شریک حیات

بنانے کا مسئلہ درپیش تھا۔

کتنے ہیں میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی؟

حالانکہ بے چارہ قاضی ہر حال میں راضی رہتا ہے کیونکہ اس کا کام ہی نکاح پر دھانا

نہ دراصل لڑکے اور لڑکی کے والدین راضی نہیں ہوتے۔ کامران انہیں راضی کرنے

لے لیے منتیں کر رہا تھا۔ ”کیسے ممی! مجھے یہاں سے جانے کے لیے صرف سات دن رہ

”وہ میرے گھر آئیں گے تو میں انہیں عزت سے بٹھاؤں گا۔ یہ اپنے اپنے عرف کی بات ہوتی ہے۔“

اس بحث میں دو دن اور گزر گئے۔ کامران نے پریشان ہو کر کلمہ ”یہا! صرف چار دن رہ گئے ہیں۔ آج سے چار دن بعد ٹھیک پانچویں دن میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ صرف اتنی سی بات کے لیے کہ جس شخص کو اپنے گھر سے نکال دیں“ اس کے گھر میں رشتہ نہیں مانگتے جائیں گے“ یہ کہی شدہ ہے؟“

اس کی والدہ نے کلمہ ”ایک دن تم نے کہا تھا کوئی کسی کی مرضی کے بغیر اس کے دل میں نہیں ہا سکتا۔ کوئی کسی ملک کی زمین پر قانونی اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا اور تم نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ میرا گھر ہے۔ میں یہاں کی مالک ہوں۔ میری اجازت کے بغیر کوئی یہاں نہیں آ سکتا۔ پھر تم میری اجازت کو تسلیم کیوں نہیں کرتے چونکہ میں یہاں کی مالک ہوں۔ میں اپنی مرضی سے“ اپنی ہند سے بولاؤں گی۔“

اس نے بے بسی سے کلمہ ”اس کا دل جیتنے میں اتنے دن گزار گئے۔ اب اس کے گھر کا ویزا حاصل کرنے کے لیے پتا نہیں کتنے دن ضائع کرنے ہوں گے۔“

”کیوں ہمارے پیچھے وقت ضائع کرتے ہو۔ آج کل کے جوان چھو کرے تو لڑکی کا ہاتھ پکڑتے ہیں اور کورٹ میں جرح کر لیتے ہیں۔ جاؤ“ تم بھی کر لو۔“ بنوئی نے کلمہ

مجھے ایسا کرنا ہوتا تو بہت پہلے کر لیتا۔ میں اخلاقی پابندیوں میں رہنا چاہتا ہوں۔ آپ لوگوں کی اجازت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے آج شام تک اپنی رضامندی ظاہر نہ کی تو میں آج ہی جا کر کل کا ٹکٹ لوں گا اور یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

اس کی آپا نے کلمہ ”یہ تم نہیں بول رہے ہو“ اس لڑکی کی زبان بول رہی ہے۔ ابھی شادی نہیں ہوئی تو یہ حال ہے کہ چار دن پہلے ماں باپ کو چھوڑ کر یہاں سے چاہتے ہو۔“

”آپ بات کا بھنگڑو بنائیں۔ اگر اس کی زبان بولتی تو اس سے بھی زیادہ نرم اور محبت بھرے لہجے میں بولتی میں بھی کوئی بغاوت نہیں کر رہا ہوں۔ چار دن پہلے یہاں سے جانے کا ارادہ کر کے آپ لوگوں کی خدمت کے خلاف خاموش احتجاج کر رہا ہوں۔ مجھے اس

جئے ہیں۔ پلیز ان کے ہاں جا کر رشتہ مانگئے۔“

”ہرگز نہیں۔ اس روز ہم نے لڑکی کے بنوئی کو کھری کھری سناٹی تھیں اب وہاں جائیں گے تو وہ بھی سمجھیں گے کہ ہم معافی مانگتے آئے ہیں۔“

”معافی مانگنے کی بات نہیں ہے۔ آپ ان سے صرف اتنا کہہ دیں گی کہ آپ کو ان کے سلسلے میں غلط فہمی ہوئی تھی تو بات ختم ہو جائے گی۔ خلیل احمد صاحب بڑے فراعزل ہیں۔ وہ آپ لوگوں کی بے حد عزت کریں گے۔“

اس کے پیانے کلمہ ”میں ہمارے معیار کے مطابق نہ ہو اور جس سے ایک بار خچر کھای ہو چکی ہو“ ہم اس کے گھر نہیں جا سکتے۔ تیس ایک نہیں ہزار بار سمجھا چکے ہیں۔ وہ لاچکی لوگ ہیں۔ انہوں نے ہمیں مختلف انداز سے چلانے کی کوشش کی ہے اور وہ کامیاب ہو رہے ہیں۔ ہم تمہاری طرح نادان نہیں ہیں۔ ہم ان میں پہنٹنا نہیں چاہتے۔“

ماں نے کلمہ ”میری ماں لو۔ میں نے ایسی لڑکی دیکھی ہے کہ تو دیکھے گا تو موت کی ضد بھول جائے گا۔ اس شرمیلہ وہی ایک ہو رہی نہیں ہے۔“

دوسری طرف موت کی آپا ناراض ہو کر سمجھا رہی تھیں۔ ”اس شرمیلہ لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ اس کامران کا خیال دل سے نکال دے۔ وہ سات سمندر پار سے آیا ہے۔ سات دنوں کے بعد چلا جائے گا۔ بھلا یہ کبھی کوئی بات ہوئی کہ آج شادی کرے گا اور کل چلا جائے گا۔ گویا یہ کھیل ہو کہ کھیل اور سات سمندر پار جا کر بھول گیا اور یقیناً وہ بھول جائے گا تو یہاں بیٹھی اپنے نصیبوں کو روتی رہے گی۔“

خلیل احمد نے موت کی حمایت میں کہا ”میں کوئی بات نہیں ہے۔ سیکڑوں ہزاروں لوگ روزگار کی خاطر ملک سے باہر جاتے ہیں۔ یہاں سے شادیوں کر کے چلے جاتے ہیں۔ اپنی نو بہتا دلہنوں کو چھوڑ کر جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دلہن یہاں بیٹھ کر اپنے نصیبوں کو روتی رہتی ہے۔ جب وہ اپنا نصیب اپنے شوہر کے ہاتھ میں دے دے وہ ہے تو رونا کس بات کا؟“

”آپ ان کی حمایت میں کہہ رہے ہیں۔ کیا اس گھر میں میری بہن کو بھیجتا چاہتا ہیں جس کے میکینوں نے آپ کی بے عزتی کی۔ اپنے گھر سے نکال دیا۔“

لڑکی سے تمام زندگی کے لیے چھڑایا جا رہا ہے۔ میں آپ لوگوں کو صرف چار دن پہلے چھوڑ کر جانا چاہتا ہوں۔ مگر آپ کا بیٹا ہوں۔ واپس ضرور آؤں گا لیکن کل ضرور جاؤں گا لہذا شام تک فیصلہ سنا دیا جائے۔“

اس نے ایک طرح سے وارننگ دی۔ پھر اپنے بیڑہ روم کی طرف چلا گیا۔ اس کی می نے تشویش بھری نظروں سے اس کے پایا کو دیکھا، انہوں نے کہا۔ ”لڑکے جوان ہو جائیں۔ خود کمانے لگیں تو اپنے فیصلے آپ کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، میں بیٹے کی پسند کے آگے جھکنایا پڑے گا۔“

”آپ ذرا سی بات پر ہمت ہار جاتے ہیں۔ میں ابھی بڑی دالوں کو فون کرتی ہوں، دیکھتی ہوں یہ کیسے راضی نہیں ہو۔ مثنیٰ لاکھوں میں ایک ہے۔ ہمارا بیٹا اسے دیکھے گا تو دیکھائی رہ جائے گا پھر دولت ہے، جائیداد ہے، اکیلی وارث ہے، سب ہمارے کارنامہ کا ہو گا۔ آخر یہ لڑکا سات سمندر پار کیوں گیا ہے؟ کس نے دیا ہے؟ تاکہ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرے۔ جب گھر بیٹھے لڑکی سب کچھ لے آئے گی تو اسے سمندر پار جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

ہماری دنیا میں اکثر رکاوٹیں بے بنیاد ہوتی ہیں۔ ایسی رکاوٹوں کے سامنے پہنچ کر انسان سوچتا ہے، کوئی غیر قانونی، ناجائز اور کوئی غیر مندرجہ طریقہ اختیار کرے اور اپنی بات منوالیے موتا کے گھر کے سامنے ایک خوبصورت سی جیتی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس کار میں آنے والے مہمان ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ موتا کے ہسپتال کا ایک ڈاکٹر اپنی والدہ، بھالی اور بہن کے ساتھ آیا ہوا قتلہ موتا کی آپاں کی خاطر ہمدردت میں ان کے آگے چھٹی جا رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں۔ ”شادی ایسی ہو کہ میں یوں اپنا گھر آباد کر سکیں۔ یہ کیا ہے کہ شادی ہوتے ہی میںاں کمانے کے لیے ملک سے باہر چلا جائے اور بیوی برسوں بیٹھی انتظار کرتی رہے۔ میرے ہاں موتا کے لیے ایسے رشتے آرہے تھے۔ میں نے تو صاف انکار کر دیا۔“

ڈاکٹر کی والدہ نے کہا۔ ”میرے بیٹے نے موتا کی اتنی تعریفیں کی ہیں کہ بس میں دیکھنے چلی آئی، کہاں ہے وہ ذرا میں بھی تو دیکھوں۔“

ظلیل احمد نے کہا۔ ”ابھی آ رہی ہے۔ جب آپ لوگوں کے آنے کی اطلاع ملی تو بہت خوش ہوئی۔ پکڑے تلنے گئی ہے۔ دراصل مجھے پکڑے بہت پسند ہیں۔“

موتا کی آپا نے اپنے شوہر کو گھور کر دیکھا۔ پھر بات بناتے ہوئے کہا۔ ”دراصل موتا کو بہترین پکوان کا شوق ہے۔ آپ اس کے ہاتھ کی کوئی بھی ڈش چھینیں گی تو انگلیاں چاٹتی رہ جائیں گی۔“

ڈاکٹر کی ماں نے کہا۔ ”میں ایسی سو نہیں چاہیے۔ جو چلے ہانڈی میں لگی رہے۔ ہمارے خاندان میں سبھی ڈاکٹر ہیں۔ یہ میری بڑی سو بھی لیڈی ڈاکٹر ہے، میرا بڑا بیٹا بھی ڈاکٹر ہے۔ یہ میری بیٹی ہے اس کا دل بڑھائی میں لگتا نہیں ہے اس لیے ہم اسے ڈاکٹر بنائیں۔ میرے بیٹے کی ضد ہے کہ بیٹی کی جگہ ہونے والی سو کو ڈاکٹر بنادوں۔“

موتا کی آپا نے کہا۔ ”لیکن وہ تو.....“

ڈاکٹر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے۔ موتا نے ہسپتال میں نرس کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرنے کے دوران بتایا تھا کہ اس نے میڈیکل کے فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا تھا لیکن حالات سازگار نہیں تھے اس لیے تعلیم کھوئی کرنا پڑی۔ اسی لیے اس ہسپتال میں ملازمت کر رہی ہے تاکہ اپنے اخراجات خود برداشت کرے اور آئندہ سال میڈیکل میں داخلہ لے۔ پھر کیوں نہ یہ کام ہمارے ذریعے ہو جائے۔“

ڈاکٹر کی والدہ نے کہا۔ ”ہم یہاں سے سو بنا کر لے جائیں گے۔ چھ ماہ بعد ہی داخلے شروع ہونے والے ہیں اور میڈیکل کالج میں داخل کرنا ہمارے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے۔“

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ موتا چائے اور ناشتہ ٹرالی میں لا رہی تھی۔ اس نے مہمانوں کو سلام کیا۔ اس کی آپا نے تعارف کرایا۔ ”یہ میری چھوٹی بہن موتا ہے۔“

ڈاکٹر کی والدہ نے تعریفی انداز میں اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”انشاء اللہ، جیسا سنا تھا ویسی ہی ہو۔ لیڈی ڈاکٹر بننے کے بعد بہت زیادہ املاٹ لگو گی۔“

موتا نے ڈاکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے مجھ سے کہا تھا، اگلے ماہ امریکہ بارہ ہیں۔“

”اعلیٰ تعلیم کے لیے جا رہا ہوں۔ ہمارے خاندان میں یہی ہوتا ہے۔ ہم یہاں ہاؤس جاب کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے کسی مغربی ملک میں چلے جاتے ہیں۔ وہاں سے کسی ایک مرض کے علاج کے اسپیشلسٹ بن کر آتے ہیں تو ہمارا رینٹ بڑھ جاتا ہے۔ صرف ایک مریض کو دیکھنے کی فیس سو اور دو سو روپے ہوتی ہے۔ ورنہ پاکستان میں کیا ہے۔ یہاں عام کلینک کے ڈاکٹر ایک مریض سے پانچ روپے یا دس روپے لیتے ہیں۔ ان سے زیادہ تو فٹ پاٹھ کے دوا فروش کما لیتے ہیں۔ ان کا کوئی معیار زندگی نہیں ہوتا ہے۔“

مونا نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کلمہ ”معیار زندگی کی بات نہیں ہے۔ یہ بزنس کی بات ہے۔ ڈاکٹر تو سب بن جاتے ہیں۔ بزنس میں آپ جیسے لوگ ہی بن سکتے ہیں۔“ اس کی والدہ نے کلمہ ”اس میں کیا شک ہے۔ ہم بہت سوچ سمجھ کر پلاننگ کرتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے خاندان کے بیٹے بیویں سبھی بڑے ڈاکٹر ہیں۔“

مونا اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر بولی۔ ”میں نے نرس کی ملازمت اختیار کی۔ اب بھی حوصلہ ہے کہ آئندہ میڈیکل میں داخلہ لوں لیکن کاروبار کے لیے نہیں“

یہ کہتے ہوئے وہ اپنی آگے قریب سے گزرنے لگی۔ وہاں رک کر بولی۔ ”آپ! آپ مجھے ایسی جگہ بتانا نہیں چاہتیں جہاں لڑکا دوسرے ملک جا کر رہے اور ہمارے ڈاکٹر صاحب بھی اگلے ماہ جانے والے ہیں۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے۔ تم بڑوں کے بیچ میں نہ بولو۔“ اس کی آپا اٹھ کر کھڑی ہو گئیں پھر اس کے قریب آ کر سرگوشی میں بولیں۔ ”کیا بے شرمی ہے۔ کیا رشتہ مانگتے والوں کے سامنے ہماری لڑکیاں اس طرح بولتی ہیں۔“

”گوگنی لڑکیوں کا دور گزر چکا ہے۔ زندگی ہمیں گزارنا ہے۔“

ڈاکٹر کی والدہ نے پوچھا۔ ”یعنی یہ دونوں بہنوں میں کیا سرگوشیاں ہو رہی ہیں؟“ ڈاکٹر نے کلمہ ”ممی! مونا نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ ویسے میں نے اسے ہسپتال میں بھی سمجھایا تھا اور اب بھی سمجھاتا ہوں۔ آدمی کو اس طرح جینا چاہیے کہ کاروبار بھی ہو اور انسانوں کی خدمت بھی ہو۔ کیا ہم اسپیشلسٹ بن کر انسانوں کی خدمت

نہیں کرتے ہیں؟“

مونا نے اس کی طرف پلٹ کر کلمہ ”پچھلے خدمت کرتے ہیں۔ اسپیشلسٹ کی لیس‘ ان کی تجویز کی ہوئی دوائیں‘ انکسرس‘ خون اور دنیا بھر کی میڈیکل رپورٹیں اتنی منجی ہوتی ہیں کہ ایک غریب آدمی اپنا خون بیچ کر بھی ان سے علاج نہیں کر سکتا۔ محاف بیچے گا‘ ڈاکٹر‘ میں نے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا ہے جو دوسروں کا خون نہیں چوڑتا بلکہ دوسروں کو اپنا خون دیتا ہے۔“

وہ کوئی جواب سے بغیر تیزی سے چلی گئی۔ اس کی آپا کبھی پریشان ہو کر اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور کبھی ممانوں کا منہ بے بسی سے دیکھتی رہی۔

☆ ----- ☆ ----- ☆

وقت کو جیسے پر لگ گئے تھے۔ کامران کی بدحواسی بڑھتی جا رہی تھی‘ یوں لگ رہا تھا بیت وقت اس کا مذاق اڑا رہا ہے‘ پہلے تو کبھی اتنی تیزی سے نہیں گزرتا تھا جیسے اب اس کا منہ چڑاتا ہو‘ آکر رہا تھا۔ چھوڑ دے کرنے والوں کو اپنی کامیابی کا یقین ہوتا ہے لیکن جو کچھ دار ہوتے ہیں وہ نکالی کی بھی توقع رکھتے ہیں‘ ایسے میں کامران سوچ رہا تھا‘ اگر اسے ناکام واپس جانا پڑا تو مونا کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت تو گزارے تاکہ پردیس میں بیچ کر جب بھی یادوں کی الم کو لے کر گزرا دے اور خوبصورت وقت نظر آتا رہے۔

وہ دونوں ایک طرف تو اپنے اپنے گھر والوں کو منانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ دوسری طرف کہیں نہ کہیں ملاقات کرتے تھے تاکہ اپنی جدوجہد کی رپورٹ ایک دوسرے کو سنا سکیں۔ مونا نے کلمہ ”آج خاندانی ڈاکٹر کوں کے ہاں سے ایک ڈاکٹر کا رشتہ آیا تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔“

”ابھی شام کو میرے ہاں لڑکی والے آئیں گے اسی لیے میں چلا آیا ہوں۔ دیر سے کمر جاؤں گا۔ وہ بے چارے اپنا سامنے لے کر واپس چلے جائیں گے۔“

”بے چارے نہ کو“ بے چارہ کیسے بھرا تھا‘ اسے دیکھ لیتے شاید وہ مجھ سے

خوبصورت ہوتی، مجھ سے اچھی ہوتی۔“

”عورت کسی نہ کسی بہانے اپنی تعریف سننا چاہتی ہے اب تمہارے جواب میں یہی کہوں گا کہ تم سے اچھی اور تم سے خوبصورت کوئی اور نہیں ہے۔ جب چاہئے دلا سوچ سمجھ کر دل دے چکا ہے اور چاہتا آ رہا ہے تو کیا پھر بھی تعریف کرنا ضروری ہے؟“

”بہت ضروری ہے۔ صرف ایک ہی شخص کو اپنی تمام کائنات سمجھنے والی عورت ایک ملاؤں گرل کی طرح اشتہار بن کر ساری دنیا سے داد وصول نہیں کرتی۔ صرف اپنے چاہنے والے کی زبان سے اپنی تعریف سننی ہے اور بس۔“

کامران نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر حلقہ انداز میں کہا۔ ”میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں۔ اگر تعریف کرتے رہنے سے تم مجھ سے لے سکتی ہو تو آج سے تم پر تعہد ہے کہ تم میرے شاعر بن جاؤ گے اس کے لیے لازم ہے کہ تم میری نظریں میرے گھر میں لکھنے کے لیے شاعر بن جاؤ گے اس کے لیے لازم ہے کہ تم میری نظریں میرے گھر میں رہو۔ میں تمہیں گھر میں لانے کے لیے پاگل ہو رہا ہوں۔ اگر تم نہ ملیں تو دنیا کو پاگل بنا دوں گا۔“

”مجھ میں نہیں آتا۔ ہم اپنے بزرگوں کو کیسے سمجھائیں۔ ہم اپنے شرعی حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنا چاہتے ہیں تو ان کی نظروں میں باقی ٹھہرائے جاتے ہیں۔“

”صرف باقی نہیں، بلکہ گولی ہوئی نسل کھلاتے ہیں۔ وہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے جسم بوڑھے ہوتے ہیں تو دماغ بھی بوڑھا ہو جاتا ہے ان کی سوچ بھی بوڑھی ہو جاتی ہے۔ ان کے فیصلے بھی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔“

”ایسا بات نہیں ہے۔ ہمارے بزرگ برس برس کی تجربوں کی روشنی میں فیصلے کرتے ہیں۔ درست فیصلے کرتے ہیں۔ ہاں بعض فیصلے غلط ہو جاتے ہیں۔“

کامران نے کہا۔ ”میرا خیال ہے۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ جب انسان بوڑھا ہوتا ہے اور اپنے سامنے ایک نئی نسل کو جو ان ہوتے دیکھتا ہے تو جس جوان کو وہ کھودتا ہے اسے دوسروں کو حاصل کرتے دیکھ کر رقاہت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔“

مونا نے کہا۔ ”ادھر تم باہر نفیات بننے رہو کہ آدھ تمہارا وقت گزرتا جائے گا۔“

اب تمہارے جانے میں دن کتنے رہ گئے ہیں؟“

”سارا قصور تمہارا ہے۔ تم پہلے ہی دن اپنے دل میں جگہ دے دیتیں تو اتنا وقت کبھی ضائع نہ ہو گا۔“

”جب دل چاہتا ہے تو دل دیا جاتا ہے۔ میں کیا کروں۔ میرے دل نے دیر سے فیصلہ کیا۔“

”کبھی کبھی جھنجھلا کر سوچتا ہوں، تمہیں یہاں سے بھگالے جاؤں۔“

”میں بھاگنے والی لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔ کالی! ہم کبھی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے جس سے ہمارے بزرگوں کی توہین ہو۔ ہمیں اس سراج میں زندہ رہنا ہے، عزت آبرو سے ایک دوسرے کے جیون ساتھی بنیں گے تو سوسائٹی میں ہماری عزت رہے گی۔“

وہ شام کی تاریکی چھلنے تک سندھ کے کنارے ٹھہرتے رہے اور مستقبل کے متعلق منصوبے بناتے رہے، کوئی راستہ بھٹکی نہیں دے رہا تھا۔ آخر وہ سات بجے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ صدر کے علاقے میں پہنچ کر کامران نے کہا۔ ”ہم رات کا کھانا کھا کر چلیں گے۔“

”بہت گھوم چکے۔ ہمارے گھر والے پریشان ہوں گے۔“

”گھر والوں نے بھی ہمیں پریشان کیا ہے۔ میں اتنی جلدی واپس نہیں جانا چاہتا۔“

وہ ایک ریستوران میں آئے۔ کامران نے کھانے کا آرڈر دینے کے بعد پوچھا۔

”مونیا یہ تیار؟ اس بار میں تمہیں شریک حیات نہ بنانے کا تو ہمارا کیا ہو گا؟“

”ہونا کیا ہے میں تمہارا انتظار کرتی رہوں گی۔“

”میں سال، دو سال بعد آؤں گا۔ تم اپنی آپا اور بہنوئی کے رحم و کرم پر ہو، کیا میرا انتظار کر سکو گی؟“

”میں کسی کے رحم و کرم پر نہیں ہوں۔ اپنی زندگی آپ گزارنا چاہتی ہوں۔ آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گی۔ تمہارے نام پر بیٹھی رہوں گی۔“

”آج تک میں نے کسی شریک حیات کے متعلق سوچا تک نہیں تھا۔ اب تمہارے لیے ایک گھر بنانے کا خواب دیکھتا رہوں گا اور اس خواب کی تعبیر کے لیے تمہارے نام پر

اشارت کیا۔ مونہ اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ وہ بڑی احتیاط سے بیٹھتی تھی۔ کامران کو دل و جان سے چاہنے کے باوجود سنبھل کر ہٹ کر بیٹھتی۔ بہت مجبور ہو کر اپنا ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھتی تھی۔ موٹر سائیکل کی تیز رفتاری سے ڈر لگتا تھا وہ نہ ایک ہاتھ کی بھی دوستی نہ کرتی۔ پچھلے دو چار دنوں میں کامران نے جب بھی کسی ہمارے اس کے ہاتھ کو تھامنا چاہا تو اس نے بڑی خوبصورتی سے ہاتھ چھڑا لیا۔ کامران نے پوچھا۔

”کیا تم مجھے اپنا نہیں سمجھتی ہو؟“

”سمجھتی ہوں۔“

”پھر شرماتی ہو؟“

”کیا شرمنا بری بات ہے؟“

”بری بات تو میں ہے لیکن چاہنے والے کے لیے یہ معیبت بن جاتی ہے۔“

”معیبت ہمیشہ بری لگتی ہے۔“

”تم بھند ہو تو مان لیتا ہوں۔ تمہاری شرم و حیا بری لگ رہی ہے۔“

”کیا خوب‘ مطلب پورا نہ ہو تو اچھی چیز بری لگتی ہے۔“

کامران نے سوچا ’’وہیں اور تعلیم یافتہ لڑکی سے بحث کرنے سے بہتر ہے‘ حالات کے ذریعے اسے مجبور کیا جائے‘ جب وہ پہلی بار موٹر سائیکل پر بیٹھی تو تیز رفتاری کے باوجود اس نے صرف ایک ہاتھ کا سہارا لیا۔ کامران شرارتیں کرتا رہا کبھی رفتار بڑھاتا تھا اور کبھی بڑے ہی خطرناک موڑ کھانے لگتا تھا اس پر بھی وہ سنبھلنے کی کوشش کرتی تھی۔ بہت زیادہ ہوا تو دوسرا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر اپنا توازن قائم رکھتی تھی۔

ایک مقام پر کامران نے اچانک ہی بریک لگائے اور ایک جھٹکے سے گاڑی روک دی۔ ظاہر ہے ایسے میں وہ سنبھل نہیں سکتی تھی۔ چیخ مار کراس پر آ پڑی‘ اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے اس کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئی۔ پھر دوسرے ہی لمحے الگ ہو کر اپنے آپ کو یوں سینے لگی جیسے چھینے کی جگہ ڈھونڈ رہی ہو۔ کار ہوتی تو شاید وہ کسی گوشے میں سمٹ جاتی۔ موٹر سائیکل میں محاش نہیں تھی۔

اس نے کلمہ ”سوری“ میں مجبور تھا تم دیکھ رہی ہو اگر اچانک گاڑی نہ روکتا تو

محنت کرتا رہوں گا۔“

دبٹر کھٹالے آیا‘ اس کے جانے کے بعد کامران نے کلمہ ”بہت زیادہ سنجیدہ ہو گئے ہیں۔ ابھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے چار دن باقی ہیں۔ چلو‘ کھانا شروع کرو۔“

”تم نے گھر والوں کو دھمکی دی ہے کہ ہمارے حق میں فیصلہ نہ ہو گا تو کل سویرے سے ہی چلے جاؤ گے۔“

”انہوں نے میری بات نہیں مانی تو میں گھر سے فون کے ذریعے مختلف ٹریپنگ ایجنٹس سے رابطہ قائم کروں گا۔ کسی نہ کسی فلائیٹ میں اپنے لیے سیٹ ریزرو کرالوں گا۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے جانے میں چار دن بھی نہیں رہے۔ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔“

”خدا نہ کرے۔ یہ آخری ملاقات ہو۔ تم بہت جلد مایوس ہو جاتی ہو۔“

”مایوسی کی بات ہر حال میں ہے۔ چاہے ہماری شادی ہو سکے یا نہ ہو سکے۔“

”میں نہیں سمجھ سکتا۔ فرض کرو ہماری شادی ہو جاتی ہے پھر مایوسی کیسی؟“

اس نے نظریں جھکا لیں۔ پھر آہستگی سے کلمہ ”صرف چار دن رہ گئے ہیں۔ پتا نہیں کب ہمارے بزرگ مائیں گے کب شادی ہوگی۔ اگر ہوگی تو ہم کتنی دیر ساتھ رہ سکیں گے۔ سنا ہے (لمن کی ایک صدی ایک پل میں گزر جاتی ہے اور جدائی کا ایک پل صدیوں میں گزرتا ہے) تم مجھے اپنا کر چلے جاؤ گے تو تمہاری داہنی تک مجھ پر کیا کیا تباہیں گزریں گی۔ یہ ابھی خود نہیں جانتی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تم جاؤ اور میں تمہارے انتقام یو ڈی ہو جاؤں۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو شادی ہوتے ہی تم اپنا پاسپورٹ بنوا لیتا‘ میں وہاں پہنچتی ہی‘ تمہیں ہلانے کے سلسلے میں جو بھی قانونی معاملات ہوں گے‘ ان سے جلد سے جلد نمٹنے کی کوشش کروں گا اور تمہیں فوراً اپنے پاس بلاؤں گا۔“

وہ کھانے کے بعد ریستوران سے باہر آئے۔ اس نے موٹر سائیکل سنبھال لی۔ اسے

حادثہ پیش آسکتا تھا۔

اس نے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کی۔ پھر اسے آگے بڑھا دیا۔ ذرا دور جا کر محسوس کیا، وہ سسک رہی ہے۔ اس نے عقب نما آئینے کا رخ بدل کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ منہ پر آنچل رکھے رو رہی تھی۔ اس نے سڑک کے کنارے گاڑی روک کر حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

وہ کچھ نہ بولی۔ آنچل سے آنسو پونچھے گئی۔ اس نے پھر پوچھا۔ ”بھئی، کچھ معلوم تو ہو کیا ہوا؟“

اس نے منہ پھیر کر کہا۔ ”کچھ نہیں۔ جان بوجھ کر گاڑی روکی تھی، کوئی حادثہ نہیں ہو رہا تھا۔“

کامران نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”وہ خوبصورت حادثہ تو پیش آیا جس سے تم کترا رہی تھیں۔“

اس نے فاتحانہ انداز میں گاڑی گئیر میں ڈالی پھر اسے آگے بڑھا دیا۔ پیٹک مرو بیش فلاح ہوتا ہے لیکن جیت لینے میں اور جبر کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

محبت میں عورت جبر کو پسند کرتی ہے لیکن صبر سے پسند کرتی ہے۔

جسے وہ جان سے زیادہ چاہتی ہے اس کے لیے اپنی ذات کو ایک خزانے کی طرح چھپا کر رکھتی ہے اور چاہتی ہے کہ چاہنے والا پہلے تذبذب کا اجازت نامہ حاصل کرے پھر اسے دریافت کرے۔

دیے اس کے آنسوؤں نے کامران کو سمجھا دیا تھا کہ وہ مہر کر سکتا ہے جبر نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد پھر کبھی شرارت نہیں کی۔ بڑی شرافت سے موٹر سائیکل چلا رہا۔ اس کے باوجود وہ بڑی محتاط ہو کر بیٹھتی رہی۔ کئی گنہگار میں بیچ کر وہ چھڑنے لگے۔ کامران نے کہا۔ ”یہ رات بھی گزر جائے گی گرینڈ نہیں آئے گی۔ یہی فکر ستائے گی کہ ہر آنے والا کل بڑی تیزی سے آج بن کر گزر رہا ہے۔“

”تم ایک ایک دن گزرتے دیکھ رہے ہو اور میں ایک عمر گزرتے دیکھ رہی ہوں۔

جانے کیا ہونے والا ہے۔“

اس نے بڑے عزم سے کہا۔ ”آج تو میں کوئی فیصلہ کر کے ہی رہوں گا۔“

وہ موتا سے رخصت ہو گیا۔ جب گھر پہنچا تو رات کے نوج رہے تھے۔ لڑکی والے ٹام کو آنے والے تھے لیکن دروازے تک پہنچا تو وہاں ایک بہت ہی قیمتی سیر کنڈیشنر کار نظر آئی۔ اندر ہنسنے بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ڈرائنگ روم میں آیا۔ ماں نے خوش ہو کر کہا۔ ”اگیا، میرا بیٹا۔ میں جانتی تھی، وقت پر آئے گا۔“

وہ تیزی سے کامران کے قریب آئیں۔ پھر سرگوشی میں بولیں۔ ”انہوں نے شام کو ہی فون کر دیا تھا کہ دیر سے آئیں گے۔ میں نے بھی جھوٹا کہہ دیا کہ تم بھی دیر سے آؤ گے۔ جو ضرورت مند ہوتے ہیں، وہ وقت پر آکر انتظار کرتے ہیں۔ لڑکی والے ضرورت مند ٹھہرے۔ وہ تم سے پہلے آکر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

وہ اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچے ہوئے مہمانوں کے درمیان لے گئیں۔ پھر ان سے تعارف کرانے لگیں۔ لڑکی کا نام ترقاۃ العین تھا۔ یعنی کلماتی تھی۔ وہ حسین بھی تھی، اسٹارٹ بھی، ہر اعتبار سے جاذبِ نظر تھی۔ ایک بات جو پسند نہیں آئی وہ اس کی بے تکلفی تھی۔ متعارف ہونے کے دوران یعنی نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا تھا، اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے مونا یاد آ رہی تھی۔ اس کی اصطلاح اور حیا کی اہمیت کا اندازہ ہو رہا تھا کہ جو چیز آسانی سے ہاتھ آ جاتی ہے اس کی قدر نہیں ہوتی۔ یعنی کے علاوہ اس کا ایک کزن اور والدین تھے۔ ان سے بھی باری باری تعارف ہوا۔ پھر یعنی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر کامران! آپ کا عاتبانہ تعارف ہو چکا ہے لیکن لائف پارٹنر بننے کے لیے ایک دوسرے کو دیکھنا اور دیکھنے کے بعد سمجھنا نہایت ضروری ہے۔“

یعنی کی والدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بھئی، جہاں تک سمجھنے کی بات ہے تم کامران کے ساتھ آؤ، آؤ گے کے لیے چل جاؤ۔ وہ گئی دیکھنے کی بات تو ابھی دیکھ رہی ہو۔ کیا خیال ہے؟“

یعنی نے ایک ادوائے ناز سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے مسکراتے ہوئے کامران کو دیکھا۔ پھر ایک لمبی ”ہوں“ کے ساتھ کہا۔ ”ٹھیک ہے، صرف دیکھنے کے بعد میں مسٹر کامران کو ہنڈیوں میں سے فوری مارکس دے سکتی ہوں۔“

کامران نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”مجھ سے گفتگو کے دوران یہ فوری مارکس بھی کم ہو جائیں گے۔ کیا صرف غائبانہ تعارف ہوا ہے یا میرے متعلق معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں۔ میں سن ہوں۔ کیا ہوں۔ کیا کرتا ہوں؟“

اس کی می نے پریشان ہو کر اسے دیکھا پھر کہا ”بیٹے! ہم نے ساری باتیں کر لی ہیں۔ جو بڑوں کی باتیں وہ بڑے کریں گے۔ تم دونوں اپنی اپنی باتیں کر۔“

”مجھے معلوم تو ہونا چاہیے کہ جو مجھے لائف پارٹنر بنانے کے لیے مارکس دے رہی ہیں انہیں میرے متعلق کتنی معلومات حاصل ہیں۔ کیا یہ معلوم ہے کہ میں لندن میں ایسی ٹیکسی ڈرائیور ہوں؟“

اس بات پر سب ہی چونک گئے، اس کی می پریشان ہو کر صوفے پر پہلو بدلے ہوئے اپنے شوہر کو دیکھنے لگیں۔ دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے بیٹا زہرہا ہو اور وہ شوہر سے بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ شوہر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بھئی ہمارا بیٹا کامران زندہ دل ہے۔ خواہ خواہ ہی چونکا دینے والی باتیں کرتا ہے۔ دراصل وہاں اس کا کاروبار ہے۔“

کامران نے کہا۔ ”میں اپنے والد کی بات جھٹلا نہیں سکتا۔ جیک میرا ایک چھوٹا سا چلتا پھرتا کاروبار ہے۔ جس طرح یہاں جمعہ بازار منقطع کیا جاتا ہے اسی طرح وہاں آل گیٹ میں منڈے بازار لگتا ہے، میرے پاس ایک سینکڑ ہینڈ پرانی سی کار ہے۔ میں اس میں ضرورت کا سامان رکھ کر آل گیٹ جاتا ہوں، کار کے آگے پیچھے اور اس کی بھت پر ان چیزوں کو دکانداروں کی طرح حاکم فروخت کرتا ہوں۔ یہ صرف ایک دن کا بلکہ چند گفتگوں کا کاروبار ہوتا ہے۔ باقی پورا ہفتہ مٹی کب کے ایک ادارے سے خشک رہتا ہوں۔ جب وہ مجھے کال کرتے ہیں تو وہاں جاتا ہوں۔ میرے لائق کوئی کام ہوتا ہے، کسی مسافر کو کہیں پہنچانا ہوتا ہے تو مٹی کب ڈرائیور کرتا ہوں۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی بیٹی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہو گئی۔ ناگواری سے بولی۔ ”اگر یہ بھی چونکا دینے والی باتیں کر رہے ہو یا مذاق کر رہے ہو تو مجھے ایسا مذاق پسند نہیں ہے۔“

کامران نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”جو بات سب سے زیادہ کڑوی لگے۔“

”مجھ لو، وہ سچ ہے۔“

بیٹی کے ساتھ ساتھ اس کے والدین اور اس کا کزن بھی کھڑے ہو گئے۔ اس کے والد نے ناگواری سے کہا۔ ”آپ لوگوں کے لیے وقت قیمتی نہیں ہوتا ہمارے لیے ہوتا ہے۔ آپ نے ہمارا بڑا وقت ضائع کیا ہے۔“

انہوں نے بیٹی، بیوی کو چلنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہاں سے جانے لگے۔ کامران کی می ان کے پیچھے چلتے ہوئے کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ کامران نے ان کا ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔ ”مٹی، رک جائیے۔ آپ اپنے بیٹا بڑا خاندان تلاش کر رہی تھیں۔ وہ بڑا خاندان کیا ہوتا ہے؟ کیا یہی کہ پردیس میں کوئی محنت مزدوری سے روزی حاصل کرے تو وہ چھوٹا ہو جاتا ہے؟“

اس کی می کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”پلیز، آپ میری بات کا جواب نہ دیں۔ کیونکہ ایک کے بعد دوسرے جواب دینے لگتے ہیں اور بحث کا سلسلہ چل پڑتا ہے جب سے یہاں آیا ہوں اس سلسلے میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ میں صرف ایک بات کہتا ہوں۔ اسے مان لیں۔ اس کے بعد میں کچھ نہیں کہوں گا۔“

اس کے پیانے پوچھا۔ ”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

اس نے اپنی می کو ایک صوفے کے پاس لا کر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ یہاں نہیں۔“

پھر اس نے اپنے پیانے کو مخاطب کیا۔ ”آپ وہاں اپنی جگہ بیٹھ جائیے پلیز۔“

پھر وہ اپنی آواز پر ہنسنے لگا۔ ”میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ یہاں بیٹھ جاتا ہوں اور آپ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں، صرف پانچ منٹ کے لیے آپ سب خاموش بیٹھیں۔ رہیں۔ اپنا اپنا سر جھکا لیں اور اپنے ضمیر کو آواز دیں۔ اس سے پوچھیں، ہم نے ایک سیدھی سی بات کو اپنی اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے تو اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ ہمارے اور آپ کے ضمیر کا جو فیصلہ ہو گا، اسے میں بھی تسلیم کر لوں گا آپ بھی تسلیم کر لیں؟“

اس کے پیانے نے کہا۔ ”بیگم! سر جھکا کر بیٹھ جاؤ۔“

”کیا میں مجرم ہوں؟“

”جیلز! اپنے بیٹے کی بات مان لو۔ یہ درست کہہ رہا ہے اگر ہمارا خمیر مردہ نہیں ہے۔ زندہ ہے“ تو پھر یقیناً ہم آج کسی صحیح نتیجے تک پہنچ سکیں گے۔“

یہ کہہ کر اس کے پیلا نے اپنے سر کو جھکا لیا۔ اس کی بہن اور بیٹھنی نے انہیں دیکھا تو وہ بھی اپنے اپنے سر جھکانے لگے۔ کارمان کا سر پہلے ہی جھکا ہوا تھا۔ اس کی می نے اس کی طرف محبت سے ’متا سے مگر مجبوری سے دیکھا جیسے بیٹے کے سامنے بس نہ چلا ہو۔ پھر انہوں نے آہستگی سے اپنے سر کو جھکا لیا۔

ڈرائنگ روم میں گمری خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ سب سر جھکانے اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنے خمیر کو آواز دے رہے تھے۔ پھر وہ مائل و حواض و حواض سا ہونے لگے۔ جب و حواض پھٹنے لگا تو عدالت کا کھرہ نظر آیا۔ پیچھے جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ”خمیر کی عدالت“ منصف اعلیٰ میز پر ہاتھ مار کر کہہ رہا تھا۔ ”ادب“ ”ادب“ یہ خمیر کی عدالت ہے۔ یہاں کا فیصلہ وہی تسلیم کرتے ہیں جو بیدار مغز اور وسیع القلب ہوتے ہیں۔“

عدالت کے دو طرفہ کھروں میں ایک طرف موٹا اور دوسری طرف کامران لمڑوں کی طرح سر جھکانے کھڑے ہوئے تھے۔ سامنے ایک قطار میں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان پر کامران کے پیلا، اس کی می، اس کی آپا، اس کے بیٹھنی، موٹا کی آپا اور بیٹھنی وغیرہ سر جھکانے ہوئے بیٹھے تھے۔ منصف اعلیٰ نے کلمہ ”ان لمڑوں سے متعلق اعتراضات پیش کیے جائیں۔“

کامران کے پیلا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کلمہ۔ ”اے منصف اعلیٰ! اس دنیا میں ہر شخص نیک نام رہ کر زندگی گزارنا چاہتا ہے، ہم اپنے آباؤ اجداد کے زمانے سے اپنے خاندان کو ایک معزز اور شریف خاندان کتے آئے ہیں۔ بعض اوقات اپنی عزت کو اپنی شرافت کو برقرار رکھنے کے لیے تھوڑا جھوٹ بھی بولنا پڑا ہے لیکن آج ہمارے بیٹے کی ضد کے باعث ہماری خاندانی ساکھ بگڑ رہی ہے۔“

کامران نے کلمہ۔ ”اے منصف اعلیٰ! میرے والد صاحب، جھوٹ بول کر ہم سے

بڑے خاندان میں، ایک امیر ترین خاندان میں میری شادی کر کے اپنے خاندان کی برتری قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ میں لندن میں رہتا ہوں۔ ہفتے میں ایک دن چند گھنٹوں کے لیے ایک معمولی سا کاروبار کرتا ہوں۔ ورنہ منی کب کا ڈرا نیور ہوں۔ میرے والدین مجھے ایک بہت بڑا بزنس مین ظاہر کرتے ہیں۔ کیا جھوٹ بول کر اپنی برتری قائم رکھنا مناسب ہے؟“

اس کی آپا نے ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے کلمہ ”سچی جھوٹ بولتے ہیں۔ اس دنیا میں سچی تو تھوڑے وقت کم تو لے لے۔ بولتے وقت زیادہ بولتے ہیں۔ اپنا چہرہ خوبصورت ہوا نہ ہو، کم پوڑ، اپ اسٹک اور کابل سے بچے چہرے کو چھپاتے ہیں جو ہے وہ نہیں دکھاتے۔ جو نہیں ہے، اسے بنا سنوار کر پیش کرتے ہیں۔ میرے بھائی کامران کو بنا سنوار کر پیش کیا جا رہا تھا۔ کیا یہ اپنے والدین کی عزت نہیں رکھ سکتا تھا؟“

”اگر بڑوں کی عزت کرنے کے لیے یہ شرط شامل ہے کہ ان کے جھوٹ کا ساتھ دیا جائے تو میں ساتھ نہیں دے سکتا۔“

موٹا نے کلمہ۔ ”ہمارے بزرگوں نے ہمارے ممبر کو اس حد تک آزمایا ہے جس کے بعد بچے باقی ہو جاتے ہیں مگر ہم نے بناوٹ نہیں کی ہے۔“

کامران نے کلمہ۔ ”ورنہ ہم بچے نہیں بالغ ہیں۔ ہمیں قانوناً نکاح پڑھوانے کا حق حاصل ہے لیکن ہم ان کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے اب بھی صبر کر رہے ہیں۔ یہ ہماری سعادت مندی ہے۔“

اس کی می نے کلمہ ”سعادت مندی کا ڈھونگ ہے۔“

موٹا کی آپا نے کلمہ۔ ”اگر یہ سعادت مند ہوتے تو ہماری مرضی سے شادی کر لیت۔“

کامران نے احتجاج کیا۔ ”شادی ہم کریں گے۔“

موٹا نے بھی احتجاج کیا۔ ”زندگی ہم گزاریں گے۔“

کامران نے کلمہ۔ ”یہ بزرگ اپنی دنیا اپنی مرضی سے آباد کر چکے ہیں۔“

موٹا نے بڑے عزم سے کلمہ۔ ”ہم اپنی مرضی سے اپنی دنیا آباد کرنا چاہتے ہیں۔“

کامران دونوں ہاتھ اٹھا کر گمراہ کر روتے ہوئے فریاد کرنے لگا۔ ”یہ کیسا ظلم ہے“

طیر ۶۰ جاے گا۔ کل تمہارا بیٹا اپنی تمام حسروں کے ساتھ خالی ہاتھ سمندر پار چلا جائے گا۔
 ضمیر تمہیں بے چین کرے گا۔ تم ضمیر کو تھک تھک کر ملانا چاہو گے مگر خود تمہاری
 فہمیں اڑ جائیں گی۔ ایسا وقت آنے سے پہلے ہی میرا فیصلہ ہے کہ تمہارے ضمیر ابھی
 روشن ہو جائیں۔“

اس کے ساتھ ہی ان کے چروں کی تاریکی دور ہونے لگی۔ چہرے روشن ہوئے
 گئے۔ وہ ایسے خوش نظر آ رہے تھے جیسے ایک طویل عرصے تک اندھیروں میں بہکنے کے
 بعد روشنی کا سراغ ملا ہو۔

دہی بلو قار آواز گونج رہی تھی۔ ”اے بیٹیوں کے سر پر ستو! تم بھی سوچو، غور کرو“
 اگر تمہاری بیٹی کسی کے نام سے کنواری بیٹی رہ گئی۔ اپنی خند پر قائم رہی تو کل دنیا اس
 نے ساتھ تمہیں بھی بدنام کرے گی۔ اس سے پہلے کہ بدنامی تمہارے گھر کا راستہ دیکھے
 اور اس کے بعد تمہیں ضمیر کی آواز سنائی دے اس سے پہلے ہی میں فیصلہ سناتا ہوں کہ
 تمہارے ضمیر بھی روشن ہو جائیں۔“

اس کے ساتھ ہی مونا کی آبا اور بہنوئی کے چہرے روشن ہونے لگے۔ انہوں نے
 مسرا کر مونا کی جانب دیکھ کر مونا نے مسکراتے ہوئے کامران کو دیکھ لیا۔ وہ سب روشنی میں
 نا رہے تھے۔ رنگ برنگے قمیضے گلے پہنچ رہے تھے۔ ڈھولک پر تھاپ پڑ رہی تھی اور
 ساک کے گیت گانے والیوں کی رس بھری آواز ابھرتی جا رہی تھی۔

☆-----☆

رنگ برنگے قمیضے روشن تھے۔ گھر کے اندر اور باہر مہمانوں کی چل پھل تھی۔
 ذرا رنگ روم میں فون کا ریسیور کان سے لگائے کامران کے پلاچ پیچ پیچ کر کہہ رہے تھے۔
 ”بھئی کیا کروں۔ لڑکے نے اچانک ہی لڑکی پسند کی اور شادی طے پاگئی۔ کامران آج سے
 تیسرے دن چلا جائے گا۔ یوں سمجھیں کہ یہ عمارت انہیں حقیقتاً چٹ مٹکی اور پٹ بیاہ کا
 معاملہ ہے۔ آپ کسی نہ کسی طرح ہماری خوشیوں میں ضرور شریک ہوں۔“

مجھ سے میری محبت کے ستائش دن جچیں لیے گئے۔ صرف تین دن رہ گئے ہیں۔ کیا میں
 اپنی مونا کا پیار حاصل کیے بغیر چلا جاؤں؟ اے منصف اعلیٰ! اس سے پہلے کہ مجھ سے یہ
 تین دن بھی چھین لیے جائیں میں انہیں ضمیر کی عدالت میں لے آیا ہوں۔ خدا اور اپنا
 فیصلہ سنا دے۔ ان کے ضمیر کو روشن کر دے۔“

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر ایک بلو قار، رعب اور دبے سے بھر پور
 آواز گونجنے لگی۔ ”یہ ضمیر کی عدالت ہے۔ انسانوں کی پہلی اور آخری عدالت۔ لہذا فیصلہ
 سننے کے لیے سب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جائیں۔“

مونا اور کامران پہلے ہی کٹھنوں میں کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ اس کے پاپا
 اس کی مئی، مونا کی آبا اور بہنوئی کامران کی آبا اور بہنوئی سب کے سب اٹھ کر کھڑے ہو
 گئے۔ ان کے چہرے تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جیسے ضمیر کی روشنی گل ہو گئی ہو
 اور وہ اندھیروں میں گم ہو گئے ہوں۔ عدالت کے ماحول میں پھر دہی بلو قار آواز گونجنے
 لگی۔

”اگر انسان ضمیر کی عدالت کے فیصلے تسلیم کرتا رہتا تو آج دنیا میں کسی اور عدالت
 کی ضرورت پیش نہ آتی۔“

صاحبزادہ تم ابھی عدالت میں کھڑے ہوئے ہو جہاں کسی گواہ کی، کسی ثبوت کی
 ضرورت نہیں ہوتی۔ یہاں انسان کا دل خود ہی جھوٹ اور سچ کی گواہی دیتا ہے۔

اے لوگو! تم اپنے دلوں میں جھانک کر دیکھو۔ اگر تم کسی کا حق تسلیم نہیں کر رہے
 ہو تو تسلیم کر لو۔ اگر تم نے کسی کی محبت کے ستائش دن اپنی انا کی خاطر چھین لیے ہیں تو
 اس چھیننے کے عمل کو جائز قرار نہ دو۔

اکثر لوگ اپنی ایک غلطی کو درست ثابت کرنے کے لیے دوسری غلطی کرتے ہیں۔
 تم نہ کرو۔ اکثر بزرگ چھوٹوں کے حقوق دینے میں اپنی توہین محسوس کرتے ہیں۔ تم
 محسوس نہ کرو۔ چھوٹوں کے حقوق ادا کرتے رہنے میں ہی بزرگوں کی عظمت ہے۔“

وہ سر جھکائے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے چروں پر ابھی تک نیم تاریکی تھی۔ وہ
 واضح طور پر نظر نہیں آ رہے تھے۔ دہی بلو قار آواز گونج رہی تھی۔ ”یاد رکھو آج تمہارا

کامران کی مٹی نے آکر کہا۔ ”آپ صبح سے فون کرنے میں مصروف ہیں۔ میرا چاروں بہنوں کو اطلاع دی ہے یا نہیں؟“

انہوں نے ریسپور رکھتے ہوئے کہا۔ ”بھئی ایک ایک کو اطلاع دے رہا ہوں۔ کمر فیکٹر ام دیا جا رہا ہے۔ کسی سے فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا جا رہا ہے۔ جو قریب رہتا والے ہیں انہیں اطلاع دینے کے لیے آدی دوڑائے جا رہے ہیں۔ اتنی جلدی میں اور کیا کر سکتا ہوں۔ تمہاری بہنوں کو بھی اطلاع دی جائے گی۔“

چند لڑکیاں کامران کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے لا رہی تھیں۔ کامران نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ”مئی! یہ کیا مصیبت ہے شادی آج ہو جاتی تو کیا غضب ہو جاتا۔ کیا یہ فضول سی رسمیں ضروری ہیں۔“

اس کی مٹی نے ڈانٹ کر کہا۔ ”زیادہ نہ بولو! کامراری جلد بازی میں ہم باپ دادا کی رسموں کو بھول جاتیں؟ میں پہلے بھی تمہیں سمجھا چکی ہوں۔ آج انہن کی رسم ہے۔ کل مندی پر سون تمہارا نکاح ہو جائے گا۔“ کامران نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہیں پر سون تو ایک ہی دن رہ جائے گا۔ دوسرے دن یہاں سے چلا جاؤں گا! دلن کامنہ بھی ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکوں گا۔“

لڑکیاں اسے کھینچ کر لے جانے لگیں۔ ایک نے کہا۔ ”دلن کامنہ دیکھنے کے لیے منہ کیوں ہٹا رہے ہو؟“

دوسری نے کہا۔ ”ابھی یہی کیا بے صبری ہے! پہلے دلن کو تو آنے دو۔ جب آئے گی تو منہ دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔“

تمام لڑکیاں کھٹکھٹلا کر ہنسنے ہوئے اسے ایک کمرے میں لے گئیں، وہاں ڈھولک پر سہاگ کے گیت گائے جا رہے تھے۔ اسے ایک چوکی پر انہن کی رسم کے لیے بٹھا دیا گیا۔ عجیب شور برپا تھا۔ چھوٹے بچے ادھر سے ادھر بھاگتے دوڑتے بھڑبھڑاتے تھے۔ گود کے بچے رو رہے تھے۔ عورتیں زور زور سے بول رہی تھیں۔ کامران نے ایک لڑکی کی طرف جھک کر آہٹگی سے کہا۔ ”تم میری بہت اچھی بہن ہو۔ میرا ایک کام کرو گی؟“

”ضرور کروں گی۔ کیا کام ہے؟“

”میں نمبر تار رہا ہوں۔ تم فون کرو۔ کہنا کہ ہسپتال سے بول رہی ہو۔ مونا کی نرس مٹی ہو۔“

”کیا مونا کے گھر میں فون ہے؟“

”اس کے پردوس میں ہے۔“

”بھائی جان! آپ لندن سے آئے ہیں۔ یہاں کی رسموں کو بھول گئے ہیں۔ بے ہاری مونا باتیں بیٹھی ہے۔ اپنے کمرے سے نہیں نکل سکی۔ پھر گھر سے نکل کر پردوس میں فون انیڈز کرنے کیسے آئے گی۔“

”کیا فضول سی رسمیں ہیں۔ بھئی ان رسموں کے نام پر جو بھی ظلم کرتا ہے جلدی لرو۔ مجھے یہاں سے جانے دو۔“

وہ جلدی کر رہا تھا۔ عورتیں تو قیامت تک رسیں ادا کرتی رہ جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہاں سے نجات حاصل کر کے تیزی سے چلا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا۔ پھر فون کا ریسپور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے پوچھا۔ ”کیا آپ مونا لے پڑی ہیں؟“

”ہی ہاں فرمائیے۔“

”میں ہسپتال سے ڈاکٹر کامران بول رہا ہوں۔ ابھی ایک ضروری آپریشن ہے۔ مس مونا ایسے موقع پر مجھے اسٹ کرتی ہیں۔ میرا تمام ضروری سامان ان کی کسٹڈی میں رہتا ہے۔ اب مجھے میرے دستانے اور میرے آپریشن کے اوزار نہیں مل رہے ہیں۔ پلیز انہیں فون پر بلا دیجئے۔“

”سوری ڈاکٹر! مس مونا کی شادی ہونے والی ہے۔ وہ باتیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ نہیں آسکیں گی۔“

”جناب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ فضول رسمیں ایک انسانی زندگی سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتیں۔ یہاں آپریشن کے ذریعے ایک انسان کی زندگی بچانا مقصود ہے۔ آپ فوراً ہی مونا کو فون پر بلائیں۔“

”اچھی بات ہے میں کوشش کرتا ہوں۔ آپ انتظار کریں۔“

”میں ٹھیک پانچ منٹ کے بعد فون کروں گا۔“

اس نے پانچ منٹ کے بعد دوبارہ خبر ڈائل کی۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے پوچھا ”ہیلو! کیا مس مونا موجود ہیں؟ میں ڈاکٹر کامران بول رہا ہوں۔“

دوسری طرف سے غلیل احمد کی آواز سنائی دی۔ ”میں مونا کا بہنوئی بول رہا ہوں۔ جس تک میری معلومات کا تعلق ہے اس ہسپتال میں کامران نام کا کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔“

”آپ مس مونا سے پوچھ لیں۔ وہ تصدیق کریں گی۔ میں ڈاکٹر کامران بول رہا ہوں۔“

”وہ تو تصدیق کر رہی تھی۔ کامران کا نام سننے ہی آنا چاہتی تھی لیکن رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اپنے کمرے سے نہیں نکل سکتی۔“

”کتنے افسوس کی بات ہے یہاں ایک انسانی زندگی کو آپریشن کے ذریعے بچانے کا مسئلہ ہے اور وہاں آپ لوگوں کو رسم و رواج عزیز ہیں۔“

”میں ساجد اوسے! زیادہ اڑنے کی کوشش نہ کرو۔ دو دن صبر کر لو۔ آج اور کل کی بات ہے۔ پرسوں وہ تمہارے پاس ہو گی۔“

کامران نے ایک گہری سانس لے کر کہا ”بھائی صاحب! جب آپ نے مجھے پہچان ہی لیا ہے تو میری بیویوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آج ابھی ہے۔ کل مندی ہے۔ پرسوں نکاح پڑھایا جائے گا۔ آپ سوچیں ہم جی بھر کے باتیں بھی نہیں کر سکیں گے۔ فون پر تو باتیں کرنے کا موقع دیا جائے۔“

”مجھے افسوس ہے۔ مشرقی رسم و رواج عورتوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ ایسے وقت ہماری ایک نہیں چلتی۔ تم فون کرتے کرتے تھک جاؤ گے۔ مونا کو گھر سے نکلنے نہیں دیا جائے گا۔ اسے صبر کرو۔ میں تمہارے لیے دعا کرتا ہوں۔“

ریسیور رکھ دیا گیا۔ اس نے بھی جھجھکا کر ریسیور کو کیریئل پر بیٹھ دیا۔ غصہ دکھانے سے کیا وہ سکتا تھا۔ ایسے ہی وقت گذریں تاکہ ہوتی ہیں تو یقین کرنا پڑتا ہے کہ تقدیر کوئی چیز ہے جو نصیب میں لکھا ہوتا ہے وہی پیش آتا ہے۔

وہ صبر کر کے بیٹھ گیا۔

اللہ اللہ کر کے رسم و رواج کے دو دن کسی طرح گزر رہی تھیں۔ تیسرے دن وہ

ادات کا دولہا بن کر مونا کے دروازے پر پہنچا۔ وہاں بھی دستور کے مطابق صبر کرنا پڑا۔ پہلے تو اس نے ضد کی تھی کہ صبح بارات جائے گی تاکہ دوپہر تک اسے بیاہ کر لے آئے گا

لیکن دونوں خاندانوں میں منازع کے بعد نکاح پڑھانے کی روایت چلی آ رہی تھی۔ فقہا

مطرب کے بعد قاضی صاحب کا انتظار ہونے لگا پتا چلا وہ دوسری جگہ نکاح پڑھانے گئے

ہیں۔ جب آئے تو عشاء کا وقت ہو چکا تھا۔ لہذا وہ نماز پڑھنے چلے گئے۔ رات کے دس بجے نکاح پڑھایا گیا۔ بارہ بجے تک دولہا اور دلہن کی طرف سے آنے والے کھانے پینے

میں مصروف رہے۔ ایک بجے تک دلہن والوں کی طرف سے رسیں ادا ہوتی رہیں۔ ایک بجے کر پندرہ منٹ پر رخصتی ہوئی۔ جب وہ مونا کو لے کر گھر پہنچا تو دو بج رہے تھے۔ وہاں

ابھی کچھ رسیں باقی تھیں۔ اس نے جھجھکا کر کہا ”اب کوئی رسم ادا نہیں ہو گی۔“

اس کے جھجھکانے سے کیا ہوا تھا۔ اصل رسم تو یہی تھی۔ تمام رشتے داروں کو پہلے دلہن کا منہ دکھایا جاتا ہے۔ پھر اسے سناگ کی بیج پر پہنچایا جاتا ہے۔ چونکہ رات زیادہ

ہو گئی تھی اس لیے بچوں والی عورتیں اپنے اپنے بچوں کو جیل جیل مل رہی تھیں، وہاں ملائی جا رہی تھیں۔ مکان کے ہر کمرے میں مہمان بھرے ہوئے تھے۔ بیچے جا رہے جا سو

رہے تھے۔ چند لڑکیاں دلہن کو اپنے حصار میں لے کر سناگ کے دروازے تک پہنچیں۔ وہ جس رہی تھیں، کھکھلا رہی تھیں۔ کامران ایک طرف کھڑا انتظار میں تھا کہ وہ بیٹیں

کی تو کمرے میں جائے گا۔ اسی وقت آپا کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اس کی می می اور دوسری عورتیں کچھ نہ کچھ بولتی جا رہی تھیں۔ اس نے زینے پر آکر نیچے ڈرائنگ روم کی

طرف جھانکتے ہوئے پوچھا ”کیا بات ہے؟“

آپا نے اپنے سینے پر دو ہاتھ مارنے ہوئے کہا ”میرا بچہ! جانے میرا بچہ! کل گم ہو گیا ہے۔ کہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔“

”بچے کو آپ کی گود میں ہونا چاہیے۔ اگر اس بیٹے میں اسے کہیں سلا دیا ہے تو ذرا

دلہن پر زور ڈالئے۔ سوچئے! ابھی یاد آ جائے گا۔“

اس کے پلانے بچے کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”رونے سے بچہ نہیں لے گا۔ اپنے

ہایا۔ پھر کہا۔ ”موتا میں تمہیں چھو کر تمہیں سمیٹ کر یقین کرنا چاہتا ہوں کہ تم میری زندگی میں آگئی ہو۔ میں نے تمہیں پایا ہے اور اب دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے نہیں چھین سکے گی۔“

یہ کہتے ہوئے وہ ذرا قریب ہونے لگا۔ اسی وقت باہر سے ایک بچہ نکلی دی۔ اس کی آپا دھڑپیں مار مار کر رو رہی تھیں اور بچہیں مار مار کہہ رہی تھیں۔ ”ہائے میں لٹ گئی۔ ہائے میرا بچہ“ ہائے میں کس سے فریاد کروں۔ سب مجھے جھوٹی تیلیاں دے رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے، کوئی بچے والی میرے جگر کے کٹوے کو بھول کر لے گئی ہے لیکن میں جانتی ہوں، کوئی اسے چرا کر لے گیا ہے۔ کسی نے انوار کو لیا ہے۔ ہائے کتنا خوب صورت قتل۔ میں اسے کہاں ڈھونڈوں۔ کس کے دروازے پر سر بھجوں۔“

کامران نے بے بسی سے دروازے کی طرف دیکھ کر پھر صرختے ہوئے دیکھ کر دہانے جھکی جھکی نظروں سے زیر لب کہا۔ ”آپ کو باہر جانا چاہیے۔ اپنی آپا کو تسلی دیجئے۔“

”وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جھنجھلا کر بولا۔ ”مجھ میں نہیں آتا“ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔“

ب۔ یہ لوگ دشمن بن گئے ہیں یا تقدیر دشمنی پر قتل گئی ہے۔“
وہ غصے سے پاؤں پٹپٹا ہوا دروازے تک آیا۔ پھر ایک جھٹکے سے اسے کھول دیا۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی آپا نے اپنے سینے پر دو ہتھ پڑاتے ہوئے کہا۔ ”ہائے یہ کیا زمانہ ہے بھائیوں کا خون بھی سفید ہو گیا ہے۔ یہاں میرا بچہ کم ہو گیا ہے اور یہ دلہن کے بازو خراب ہو گیا ہے۔ میں پوچھتی ہوں کیا دلہن بھاگی جا رہی ہے؟ میرے بچے کو لے کر جانے کون بھاگا جا رہا ہو گا۔ اتنی سی مروت میں ہے کہ باہر جا کر اسے تلاش کر سکوں۔“

کامران نے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”آپا! جانے کتنے لوگ اس کی تلاش میں گئے ہیں۔ پھر میرا جانا کی ضروری ہے؟“

آپا نے بڑے زور سے ہائے کہہ کر سینے پر دو ہتھ پڑا دیے۔ پھر کہنے لگی۔ ”تم بھائی ہو یا قہقاریا ہو۔ خدا نخواستہ کسی نے میرے بچے کو مار ڈالا تو تمہاری آنکھ سے ایک آنسو میں نہیں ٹپکے گا۔ تم دلہن کے ساتھ قہقاریا لگاتے رہو گے۔“

دلہن کو پوری طرح پڑ سکون رکھو۔ ہو سکتا ہے بچہ بدل گیا ہو۔ کوئی دوسری بچہ والا تمہارے بچے کو لے گئی ہو اور اپنا بچہ یہاں چھوڑ دیا ہو۔“

سب آپا کو تیلیاں دے رہے تھے۔ کچھ عورتیں بچے کو تلاش کر رہی تھیں اور کچھ مردان بچے والی عورتوں کے ہاں گئے تھے جو شادی میں شریک ہونے کے بعد تھوڑی دیر پہلے اپنے گھروں کو گئی تھیں۔ خیال تھا ان میں سے کسی کے پاس آپا کا نشانہ ہو گا۔

کامران اپنے بیڈ روم کی طرف آیا۔ لڑکیاں دلہن کو بیچ پر بھاگا باہر آئی تھیں اور اس کی طرف دیکھ کر کھٹکھٹا رہی تھیں۔ منہ چھپا کر ہنس رہی تھیں۔ وہ جلدی جلدی چلتا ہوا کمرے میں آیا۔ پھر اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ ہر آہٹ پر دلہن صرختی رہی تھی۔ شرا رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تمہارا چلنے والوں کے لیے کھاتے ہے کہ وہ سات سمندر پار جاتے ہیں۔ جب میں پہلی بار وہاں گیا تو مجھے اتنی پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اتنے پاز نہیں بنیے۔ آج تاج چل رہا ہے کہ سات سمندر پار کرنے کے بعد تمہارے پاس آیا ہوں۔“

وہ اس کے قریب بیچ پر بیٹھ گیا۔ موتا جیسا سے سننے لگی۔ کامران نے جب سے ایک چھوٹی سی ذبیہ نکالی۔ پھر اس میں سے انگوٹھی نکالتے ہوئے کہا۔ ”مہم جلدی جلدی سلمی رو سینیں ادا کریں گے۔ میں تمہیں انگوٹھی پستانا ہوں۔ تم مجھے گھونگھٹ اٹھا کر فوراً ہی چھو دیکھنے کی اجازت دو۔ ورنہ کوئی نئی مصیبت نازل ہو جائے گی۔ میں تھک گیا ہوں۔ پریشان ہو گیا ہوں۔ مجھے یاد نہیں آ رہا ہے کہ دلہن کو انگوٹھی پستانے وقت اس کے حسن کی تعریف کس طرح کرنی چاہیے۔“

اس نے جلدی سے انگوٹھی پستانا دی۔ پھر اس کے گھونگھٹ کو اٹھا دیا۔ وہ سر جھکائے آنکھیں بند کیے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر چھوئے ہوئے چہرے کا اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اف! کتنی حسین لگ رہی ہو۔ تم تصور میں دلہن بن کر آئی تھیں مگر تصور پیکا پڑ گیا ہے۔ اتنی حسین لگ رہی ہو اتنی حسین لگ رہی ہو کہ کم بخت کوئی شعر بھی تو یاد نہیں آ رہا ہے۔“

وہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔ کامران نے اپنی دونوں ہتھیلیوں میں اس کے چہرے کو

فدا۔ ”کیس پتا نہیں چل رہا ہے۔ خدا جانے میرے بچے کو کون لے گیا ہے۔“
 کامران نے پوچھا ”کیا آپ کو ان تمام بچے والی عورتوں کے نام اور پتے معلوم ہیں؟“

اس کے ہنسنے لے اپنی جیب سے ایک بڑا سا کانڈ نکالتے ہوئے کہا۔ ”میں نے یہ مارے نام اور پتے نوٹ کر لیے ہیں۔ ان میں سے چند عورتوں سے پوچھ بھی چکا ہوں۔ ان کے پاس ہمارا بچہ نہیں ہے۔ باقی عورتیں ابھی اپنے گھر نہیں پہنچی ہیں۔“
 کامران نے اس فہرست کو ہاتھ میں لے کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ میں عورتوں کے نام اور پتے ہیں۔“

اس کے ہنسنے لے کہا۔ ”آٹھ عورتوں سے ملاقات کر چکا ہوں۔ میں نے ان کے نام اور پتے کاٹ دیے۔ باقی بارہ عورتوں میں سے کچھ اپنے گھر نہیں پہنچی ہیں۔ کچھ کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہ کوئی دوسری شادی انیڈ کرنے گئی ہیں جہاں شادیاں انیڈ کرنے گئی ہیں وہاں کے پتے بھی میں نے کانڈ کے پیچھے لکھ لیے ہیں۔ چونکہ پٹرول ختم ہو گیا تھا۔ میں بلدی میں غلطی جب گیا تھا اس لیے کچھ رقم لینے آیا ہوں۔“

کامران نے اپنے ہنسنے سے چاہی لی۔ ”ہم تلاش کریں گے آپ فکر نہ کریں۔ اگر آپ تلاش کرنا چاہیں تو اپنی موٹر سائیکل لے جائیں۔ چلو مونا ٹیو۔“
 مونا بنی نوپلی دلہن تھی۔ ایک تو دیے بھی شرمیلی تھی۔ اس وقت شرم سے دہری ہو رہی تھی۔ کار کا دروازہ کھلتے ہی بیٹھ گئی۔ کامران نے دوسری طرف سے آکر اسٹیئرنگ سیٹ سنبھالی۔ اسے اشارت کیا۔ کچھ رشتے داروں نے کہا۔ ”ذرا رک جاؤ۔ ہم بھی چلتے ہیں۔“

اس نے گاڑی کو مکان کے احاطے سے نکالتے ہوئے کہا۔ ”جس کا ساتھ ہوتا چاہیے“ وہ میرے ساتھ ہے اور کسی کی ضرورت نہیں ہے جلیز ہماری گاڑی میں کوئی نہ آئے۔“

وہ احاطے کے باہر آیا اور اسے ڈرائیو کرتا ہوا پٹرول پمپ کی طرف جانے لگا۔ کار نے اندر گری خاموشی تھی۔ دلہن چپ تھی۔ وہ بے چاری بھلا کیا کہہ سکتی تھی۔ سناگ

ایک بوڑھی عورت نے کہا۔ ”بیٹے! کاش! بہن کی تسلی کے لیے تلاش کرنے چلے جاؤ اور بھی بہت سے لوگ گئے ہیں لیکن تم بچے کے ماموں ہو۔ تم اسے اپنا فرض سمجھ کر تلاش کرو گے۔“

اور عورتیں بھی کچھ نہ کچھ بولنے لگیں۔ وہ کبھی اس کو دیکھ رہا تھا کبھی اس کو دیکھ رہا تھا اور کبھی حسرت سے کمرے کے اندر سچ پر بیٹھی ہوئی دلہن کو دیکھ رہا تھا پھر وہ کچھ سوچ کر تیزی سے چلنا ہوا مونا کے پاس آیا۔ ایک جھٹکے سے اس کی کلائی کو تھام کر بولا۔
 ”چلو! آؤ! میرے ساتھ چلو۔“

مونا نے جی رانی سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ اس نے کہا۔ ”تم میری شریک سیات ہو۔ میرے ہر معاملے میں شریک ہو۔ اگر میں بچے کو تلاش کرنے جا رہا ہوں تو تم بھی میرے ساتھ اسے تلاش کرنے نکلو گی۔ میں تم سے ایک بل کے لیے جدا نہیں ہو سکتا۔ ہماری ازدواجی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ لہذا جو بھی لمحہ گزرے گا وہ تمہارے ساتھ گزرے گا۔ چاہے وہ بچے کی تلاش ہی میں گزرے۔“
 یہ کہتا ہوا اسے کھینچتا ہوا وہ کمرے سے باہر آیا۔ عورتیں کہنے لگیں۔ ”ہائے ہائے“
 یہ کیا کر رہے ہو۔ دلہن کو اس وقت کہاں لے جا رہے ہو؟“

اس نے گرج کر کہا ”خبردار! کوئی ہمارے معاملے میں مداخلت نہ کرے۔ جب تک میں اپنے بھائی کو تلاش نہیں کروں گا اس وقت تک دلہن کے ساتھ واپس نہیں آؤں گا۔“

وہ اسی طرح مونا کو کھینچتے ہوئے ’زینے سے اترنے لگا۔ نیچے ڈرائنگ روم میں اس کی بیوی اور پلانیے کہا۔ ”بیٹے! یہ کیا کر رہے ہو؟ دلہن کو کہاں لے جا رہے ہو؟“
 ”اپنے بھائی کو تلاش کرنے جا رہا ہوں۔ اگر میں یہاں رہوں گا تو بہن کے طعنے سنتا رہوں گا۔ گاڑی کی چابی دیجئے۔“
 ”وہ تو تمہارے ہنسنے لے گئے ہیں۔“

اسی وقت باہر گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ سب دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ دلہن بھی اپنے دوہلا کے ساتھ تھی۔ اس کا ہنسنے گاڑی میں واپس آیا تھا اور مایوسی سے کہہ رہا

”میری بہن کا بچہ گم ہو گیا ہے۔ سوچا شاید آپ کی وائف بھول سے اٹھالائی ہو۔“

”ہمارے ہاں آپ کا بچہ نہیں ہے میری بیوی اپنی گود میں اپنا ہی بچہ لے کر آئی ہے۔ تم چاہو تو گھر میں آکر دیکھ سکتے ہو۔“

”آپ پر بھروسہ ہے۔ ہم تو صرف اس لیے پوچھ رہے ہیں کہ شاید بھول سے بچہ بدل گیا ہو۔ بہر حال زحمت دی“ معافی چاہتا ہوں۔ بہت بہت شکریہ۔“

وہ کار میں آکر بیٹھنے لگا۔ مالک مکان نے دور سے کار کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

”یہ دلہن کو ساتھ لے کر گھوم رہے ہو؟“

”جی ہاں، ساگ رات یوں بھی بگڑا رہی جاتی ہے۔“

وہ گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے مونا کی طرف دیکھنے لگا۔ کار کی اندر دنی لائٹ روشن تھی۔ اس کا چہرہ صاف طور سے نظر آ رہا تھا۔ وہ سر تھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسی ’مونہنی‘ ایسی دل نشیں تھی کہ سیدھی دل میں اثر رہی تھی۔ وہ ڈرائیو نہ کر سکا۔ سڑک کے کنارے گاڑی روک کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا ہاتھ تھمنا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہیں تقدیر کو یہ بھی منظور نہ ہو۔ ادھر میں تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لوں اور کوئی نئی مصیبت نازل ہو جائے۔“

وہ کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ سر تھکائے بیٹھی رہی۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ حائل ہاتھ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اب سے پہلے اس نے نری اور گری کو ایک سٹیم پر محسوس کیا ہو۔ اس کے دل میں اس کے دماغ میں اس کی ایک ایک رگ میں یہ سوال لہو کی طرح دوڑ رہا تھا۔ چل رہا تھا کہ جب یہ ہاتھ ایسا ہے تو وہ کیسی ہوگی؟

گھونگھٹ کے سائے میں حنا کی طلسماتی مہک تھی۔ یو ڈی کلون کی مسکور کن نوشبو تھی۔ گلاب تھا، جینیل تھی۔ ایک رات کی سہیلی تھی مگر اس سہیلی تک پہنچنے کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔

اس نے مونا کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑی بے قراری سے کہا۔

کی سچ سے زبردستی اٹھا کر لائی گئی تھی۔ کسی کو کال کو فوری سے نکال کر پھانسی کے تختے پر چڑھایا جائے تو وہ ہمسائیہ اذیت میں مبتلا ہو گا لیکن ساگ کی سچ سے نئی نوبلی دلہن کو اٹھا کر لایا جائے تو وہ ذہنی اذیتوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کی اذیتوں کو کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ شاید کامران بھی یہی کچھ سوچ رہا ہو گا۔ اس لیے کم صم قتلہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نئی دلہن کو کس طرح تسلیاں دے یا اپنی حسرتوں کا کس طرح ماتم کرے؟

وہ پڑول پسپ پنچ کر رک گیا۔ نیکی فل کرنے کا آڈر دیا۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ”ہماری تقدیر ہمارے ساتھ بہت ہی بھیاکتی مذاق کر رہی ہے۔“

اس نے مونا کو دیکھ لیا۔ اس کا نصف چہرہ گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا۔ ”پلیز مونا! گھونگھٹ اٹھاؤ۔ مجھے جی بھر کر دیکھ لینے دو۔ رات کا بچھاا پر ہے اور ہم ہیں۔ پھر میں کہاں اور تم کہاں؟“

اس کی بات سنتے ہی وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ مندی والے خوب صورت ہاتھ آنسوؤں کو چھپا رہے تھے لیکن محبت کی آنکھ سے نکلنے والے آنسو کامران کے دل میں ٹپک رہے تھے۔ اس نے کار کے باہر دیکھ لیا۔ پھر آہستہ سے کہا۔ ”مونا! یہ کیا؟ تم بہت بار جلاؤ گی تو کل کیسے جاسکو گا؟ دیکھو لڑکا پڑول کے پیچھے لینے آ رہا ہے۔ وہ دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔ جلدی سے آنسو پونچھ لو۔“

مونا نے دوسری طرف منہ تھما لیا۔ وہ پڑول کی رقم ادا کر کے گھر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اسے آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہ آج کل کی عورتیں مائیں بنتی ہیں لیکن شادی بیاہ کے موقعوں پر میک اپ کرنے، ڈھونگ بجانے، ٹانپنے گانے کے دوران اپنے بچوں کو بھول جاتی ہیں۔ کسی بھی کمرے میں ڈال دیتی ہیں کہ بچہ سوتا رہے۔ اس کے بعد بھول جاتی ہیں۔ آجائے یہی کیا اور ہم پر بڑا احسان کیا۔“

وہ ایک بچے والی کے مکان کے سامنے ٹپک گیا۔ گاڑی کا پارن بجایا۔ پھر اتر کر دروازے پر دستک دی۔ رات سونے کے لیے ہوتی ہے۔ اتنی رات کو بھی سوتے ہیں۔ ان کی طرح کچھ بد نصیب جانتے ہیں۔ بہر حال مالک مکان نے دروازہ کھولا۔ پھر کامران کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ارے دولہا میاں اتنی رات کو یہاں کیسے؟“

”چلو ہم قبرستان میں چلتے ہیں۔“

مونتا نے ایک دم سے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ ”ہاں مونتا! وہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں انسان اپنے مردہ ضمیر کے ساتھ بیٹھ کے لیے سو جاتا ہے۔ اس شہر خوابیدہ میں کوئی نہیں پریشان نہیں کرے گا۔ کوئی ہم سے سوال نہیں کرے گا کہ دلمن کے گھونگھٹ تک پہنچنے کے لیے مقدّز سے اجازت نامہ لائے ہو یا نہیں؟“

مونتا کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ اس کے آنسو گرم تھے۔ اندر کی آگ سے اہل کر آئے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ہم زندہ انسان اپنے گھروں میں دروازے بناتے ہیں۔ اس لیے کوئی بھی اندر چلا آتا ہے یا باہر نکل جاتا ہے۔ شہر خوابیدہ کے کسی گھر کا کوئی دروازہ نہیں ہوتا۔ اس لیے کوئی ہم تک نہیں پہنچ سکے گا۔ چلو ہم اس شہر بے خبروں و شہرامن و اہل میں چلیں۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔ کوئی کار کی پاؤں کو ٹھونکنے بجاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ”اس عورت کو کہاں لیے جارہے ہو؟“ وہ دونوں جاگتی آنکھوں کے خواب سے چونک گئے کار کی کھڑکی سے ایک حوالدار جھانک رہا تھا اور پوچھ رہا تھا۔ ”تم کون ہو؟ اور یہ عورت کون ہے؟ مظلوم ہو رہے کوئی دلمن ہے۔ پھولوں سے لدی ہوئی ہے۔ اور ہاں! سونے کے زیورات تو بہت زیادہ ہیں۔ اسی لیے بھاگ کر لائے ہو۔ ارے بے وقوف بھگوڑے! جب لے کر بھاگنا ہی تھا تو پہلے سوچ لینے کہ بھاگ کر کہاں جانا ہے۔ ایسی بھی کیا ہے میری کہ سڑک کے کنارے ہی رک گئے؟“

مونتا پر کیا گزر رہی تھی اور پولیس والا کیا سمجھ رہا تھا اسے اپنی توہین کا احساس ہوا تو وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر رونے لگی۔ حوالدار نے کہا۔ ”نہ لی لی نہ! اب رونے اور ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ ہم اس بد معاش کو ایسی سزا دیں گے کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ اے! ہمارے ساتھ تھانے چلو۔“

کار کے دونوں طرف کے دروازے کھل گئے حوالدار کے ساتھ دو سپاہی بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کامران نے بے بسی سے کہا۔ ”حوالدار صاحب! آپ غلط سمجھ رہے

ہیں۔ ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔“

”میں تمیں برس سے حوالدار ہوں۔ تم میری آنکھوں میں دھول بھونکنا چاہتے ہو۔ اس لڑکی کے آنسو بتا رہے ہیں کہ تم اس پر ظلم کر رہے ہو۔ زبردستی لے جا رہے ہو۔“

کامران نے کہا۔ ”مونتا! پلیز چپ ہو جاؤ۔ آنسو پونچھ لو۔ انہیں بتاؤ کہ ہم پر کیا مکر رہی ہے“

”یہ کیا بتائے گی جو کچھ بتانا ہے وہ تھانے چل کر بتاؤ۔ دیں بیان دو۔ اس سے پہلے نجات نہیں مل سکتی۔“

کامران نے جھنجھلا کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ پھر ایک ہنگامے سے آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”بتاؤ مکدھر جانا ہے؟“

ایک سپاہی راہنمائی کرنے لگا۔ وہ اس کے بتائے ہوئے راستوں پر گاڑی دوڑاتا ہوا ایک تھانے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ پھر وہ گاڑی سے اترتا۔ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر مونتا کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ”آؤ! ہمارے نصیب میں یہ بھی لکھا ہوا تھا۔ جلدی سے بیان دے کر اپنے میاں بیوی ہونے کا ثبوت پیش کریں۔ اس کے بعد یہاں سے چلیں گے۔“

وہ اندر آئے صبح کے چار بج رہے تھے اسل ایچ او کہیں محو خواب تھا۔ سب انسپکٹر ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے معاملات دریافت کیے۔ پھر کہا۔ ”دونوں ادھر کھڑے ہو جاؤ۔ سچ بچ بتاؤ! کون ہو؟ کہاں بھاگے جارہے ہو؟“

”جناب! میری بہن کا بچہ کم ہو گیا ہے۔ ہم اسے تلاش کرنے نکلے ہیں۔“

”لیکن یہ تو خبی دلمن لگ رہی ہے۔ بچے کو تلاش کرنے کے لیے کسی کی دلمن کو اٹھالائے ہو؟“

”جناب! یہ میری دلمن ہے۔ میری شریک حیات ہے۔ آج ہی ہماری شادی ہوئی ہے۔“

حوالدار نے کہا۔ ”یہ بکواس کرتا ہے۔ میں نے سڑک کے کنارے انہیں ایسی

کامران نے عاجزی سے کلمہ "جناب! میرا قیام لندن میں ہے۔ میں ایک ماہ پہلے آیا تھا۔ کل صبح چلا جاؤں گا۔ میں نے آج تک یہی دیکھا ہے کہ جب تک کسی پر الزام ثابت نہ ہو اسے بیٹھے کا موقع دیا جاتا ہے۔ آپ مجھے نہ سہی کم از کم میری وادعہ کو تو بیٹھنے کا کہہ سکتے ہیں۔"

سب انسپکٹر نے ریسپورڈ کرڈیل پر ہنسنے ہوئے کلمہ "تم لندن کا رعب نہ جتاؤ۔ یہاں یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے اسمگلر اور بدوہ فروش آتے ہیں اور ہمارے سامنے مرغا بنے ہیں۔ شکر کرو ابھی تمہیں مرغا نہیں بتایا ہے۔ تم اسے لوگ کھڑے منہ کیا تک رہے ہو۔ ان دونوں کو زندہ اور مردانہ حوالات میں بند کرو۔ وہاں آرام سے بیٹھیں گے۔"

حوالدار اور سپاہی دونوں کو حوالات کی طرف لے جانے لگے۔ کامران نے کلمہ "یہ کیسا ظلم ہے۔ نہ ہم لوگوں کی بات کا یقین کیا جا رہا ہے۔ نہ ہمارے رشتہ داروں کو اطلاع دی جا رہی ہے۔ آخر کسی کو ابھی آپ ہمیں قصوردار کس طرح سمجھیں گے؟"

حوالات کے قریب پہنچ کر حوالدار نے آہستگی سے کلمہ "تم بالکل ہی اناڈی ہو۔ اگر صاحب یہاں سے فون کر کے تمہارے رشتہ داروں کو بلائیں گے تو تمہارے رشتے دار فوراً پہنچ جائیں گے۔ اس طرح تمہاری جیب سے ایک پیسہ خرچ نہیں ہو گا۔ اگر ہمارے ہائی کو آنے جانے کا کرایہ دو گے تو وہ رکشا میں جانے گا اور ٹیکسی میں تمہارے رشتہ داروں کو لے آئے گا۔"

کامران واقعی اناڈی تھا۔ اسے یہاں کے طور طریقوں کا علم نہیں تھا۔ اس نے سو رہا تھا کہ کانٹ نکال کر حوالدار کی طرف بڑھائے۔ اس نے ایک نوٹ لیتے ہوئے کلمہ "یہ تو صرف جانے کا پتہ ہے اور آنے کا؟"

کامران نے جب میں ہاتھ ڈال کر سو کے چار نوٹ نکالے۔ پھر اس کی ہتھیلی پر دیکھتے ہوئے کلمہ "خدا کے لیے جلدی پیچھا پھراؤ۔"

"مجھ کو پیچھا چھوٹ گیا۔ ہم ابھی تمہارے رشتہ داروں کو بلا رہے ہیں۔"

وہ انہیں لے کر سب انسپکٹر کے پاس پہنچا۔ پھر کلمہ "سر! یہ تو بہت ہی شریف

حالت میں دیکھا ہے کہ آنکھیں گنگار ہو جاتی ہیں۔"

سب انسپکٹر نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "کیا دیکھا ہے؟"

"یہ اس عورت کا ہاتھ زبردستی پکڑ رہا تھا اور یہ بے چاری رو رہی تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ بیوی ہے تو کیوں رو رہی تھی؟"

"جناب! میں اپنے گھر کا فون نہرتاتا ہوں۔ آپ معلوم کر لیں۔ پتا چل جائے گا کہ ہمارے ہاں ایک بچہ گم ہوا ہے اور میں اس کی تلاش میں اپنی دلہن کے ساتھ نکلا ہوں۔"

"پولیس والے ہم ہیں اور تم ہمیں تفتیش کرنے کا طریقہ سکھا رہے ہو۔ ہو سکتا ہے لڑکی والوں سے کوئی خاندانی دشمنی ہو۔ اس لیے تم اپنے گھر والوں کے ساتھ مل کر اسے اغوا کر رہے ہو۔ ہم کیوں تمہارے گھر فون کر کے معلومات حاصل کریں۔ لڑکی کے گھر فون کر کے کیوں نہ پوچھ لیں۔"

"آپ لڑکی والوں سے بھی پوچھ سکتے ہیں۔"

سب انسپکٹر نے موتہ سے پوچھا۔ "تم اپنے گھر کا فون نہرتاؤ۔"

موتہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کلمہ "ہم مجرم نہیں ہیں۔ یہ میرے شوہر ہیں ان کی شریک حیات ہوں۔ آج ہی ہماری شادی ہوئی ہے۔ میں رو رہی ہوں تو اپنی تقدیر پر۔ میں چپ ہوں تو اپنی بے بسی پر۔ آج میرے شریکے اور چپ رہنے کی رات تھی۔ یہ کیسا ظلم ہے یہ کیسی بے حیائی ہے کہ میں تمہارے بچہ کر بول رہی ہوں۔"

"اوبلی بی! یہ تھانہ ہے۔ یہاں آنسوؤں کا اور درد بھرے ڈائیگ کا کوئی اثر نہیں۔ سو کہ جو سوال کیا جا رہا ہے اس کا جواب دو۔ تمہارے گھر کا فون نہرتاؤ؟"

"میرے گھر میں فون نہیں ہے۔ پڑوس میں ہے اس کا نمبر نوٹ کیجئے۔"

اس نے نہرتایا۔ سب انسپکٹر ریسپورڈ اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگے۔ پھر ریسپورڈ کلنگ سے لگا کر سننے لگے۔ چند لمحوں کے بعد اس نے بیڑا ہوا کر کلمہ "وہاں فون کی گھنٹی بج رہی ہے لیکن کوئی فون اٹھانے والا نہیں ہے۔"

حوالدار نے کلمہ "پونے پانچ ہو رہے ہیں۔ لوگ اس وقت اذان کی آواز پر نہیں اٹھتے۔ فون کی گھنٹی پر کیا اٹھیں گے۔"

لوگ ہیں۔ پڑول کچھ زیادہ ہی مل گیا ہے۔ آپ ان صاحب کے گھر کا فون نمبر پوچھ لیں۔ کامران نے نمبر بتایا۔ انسپکٹر نے ریسپور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ تھوڑی دیر بعد وہ رابطہ قائم ہو گیا۔ انسپکٹر نے پوچھا۔ ”کیا آپ نوٹائین‘ فورٹائین‘ فورٹائین سے بول رہے ہیں؟“

”جی ہاں‘ فرمائیے؟“

”کیا آپ کے ہاں کوئی بچہ کم ہو گیا ہے؟“

”جی ہاں۔ کم ہو گیا تھا۔ ابھی ابھی مل گیا ہے۔ دراصل ایک خاتون اسے اپنا بچہ کر لے گئی تھیں اور اپنا بچہ ہمارے ہاں چھوڑ گئی تھیں۔“

انسپکٹر نے کہہ۔ ”ایک منٹ ہولڈ آن کریں۔“

اس نے ہاتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کامران سے کہہ۔ ”تم کہہ رہے ہو‘ بچے کو تلاش کرنے نکلے ہو اور وہاں پہنچ مل گیا ہے۔“

کامران نے اطمینان کی گہری سانس لیتے ہوئے مونا کو دیکھا۔ پھر کہہ۔ ”خدا کا شکر ہے‘ بچہ مل گیا۔ انسپکٹر پلیز آپ میرے پاپا کو ہمارے متعلق بتائیں۔“

انسپکٹر نے ریسپور پر کہہ۔ ”پاپو مسٹر! آپ کے صاحبزادے یہاں موجود ہیں اور ان کے ساتھ ایک نئی دلہن بھی ہے۔“

دوسری طرف سے کہہ۔ ”جی ہاں‘ وہ میرا بیٹا اور بہو ہیں۔ آج ہی شادی ہوئی۔ ہے۔ بے چارے بچے کو تلاش کرنے نکلے ہیں لیکن آپ کون ہیں۔ کہاں سے بول رہے ہیں۔“

”میں پولیس انسپکٹر ہوں اور تھانے سے بول رہا ہوں۔ تمہارا بیٹا اور بہو محکوک حالت میں گرفتار ہوئے ہیں۔ جب تک آپ یہاں آکر چند معزز حضرات کی گواہی پیش نہیں کریں گے‘ اس وقت تک یہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔“

وہ چپ ہو کر دوسری طرف سے بات سنتے لگا۔ پھر اس نے ریسپور کو کریڈل پر رکھتے ہوئے کہہ۔ ”تمہارے گھر والے آ رہے ہیں۔ یہاں کریسیوں پر بیٹھ جاؤ۔“

وہ کریسیوں پر بیٹھ گئے۔ مونا نے کھڑکی کے پار دیکھا۔ صبح کی ہلکی ہلکی روشنی ہو

رہی تھی۔ تاریکی سے روشنی کی طرف آؤ تو خوشی ہوئی ہے لیکن صبح ہوتے دیکھ کر اچانک اسے رونا آگیا۔ وہ پھر آجکل میں منہ چپا کر ہولے ہولے سکھنے لگی۔ اپنے آنسوؤں کو‘ اپنی آنسوؤں کو‘ اپنی سکیوں کو ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ساگ سلامت ہو اس کے باوجود ساگن کے اندر ماتم ہو تو وہ چھپ نہیں سکتا۔ دیکھنے والوں کے حساس دلوں کو متاثر کرتا ہے۔ کامران اسے دیکھ رہا تھا بڑے کرب سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ دیران تھیں۔ جیسے تمام آنسو بھج گئے ہوں جتنے کو محض دل رہ گیا ہو۔

☆ ----- ☆ ----- ☆

جب وہ گھر واپس آئے تو صبح کے ساتھ ہی رہے تھے۔ کامران کی ردائی میں صرف تین کپڑے رہ گئے تھے۔ گھر میں رشتے داروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ سب بیدار ہو گئے تھے۔ کوئی ناشتا کر رہا تھا۔ کوئی بچے کی بازیابی پر اس کی ماں کو مبارک باد دے رہا تھا۔ وہ دلدل دھن ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے اپنے بیڑ روم میں پہنچے۔ جس طرح ڈوبتے ہوئے کشتی کا سارا ہوتا ہے‘ اسی طرح بھڑکتے والوں کے لیے تین کپڑے ہی بہت ہوتے ہیں۔

شرقی آداب اور حیا کچھ اور ہوتے ہیں۔ یہاں اس قدر بے تکلفی یا بے حیائی نہیں ہوتی کہ نئی دلہن اپنے دولہا کو لے کر تمام لوگوں کی موجودگی میں ایک کمرے میں جا کر بند ہو جائے۔ مونا بھی شرعی لڑکی یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ دن کے وقت بند کمرے میں قماشیں جاتے اور بڑی یو زیمن کی تنقید کا نشانہ بنتی رہے۔

جب وہ کمرے میں پہنچی تو کامران دروازہ بند کرنے لگا۔ وہ خشک لبے میں بولی۔ ”رک جاؤ۔ دروازہ بند نہیں ہو گا۔“

کامران نے پلٹ کر پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ کچھ دیر تو ہم مل بیٹھیں۔“

”عورت عزت اور آبرو سے پیار چاہتی ہے۔ جب تک یہ دروازہ بند رہے گا‘ میں

شرم سے مرنے رہوں گی۔“

”لیکن دروازہ کھولتے ہی عورتیں غی دلن کو دیکھنے چلی آئیں گی۔“

”دیکھنے دو۔ اب تو متاثر نہ ہونا رہ گیا ہے۔“

”کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟“

”میں اپنے خدا سے اور اپنے مجازی خدا سے کبھی روٹھ نہیں سکتی۔ پلیز دروازہ کھول دو۔“

اس کے آگے بڑھ کر بے دلی سے دروازہ کو کھول دیا۔

اس نے درست کھڑا کھڑے ہی بوٹھی عورتیں اور جوان لڑکیاں دلن کو دیکھنے کے لیے اندر آ گئیں۔ کامران کی مٹی اور اپنے کلمہ ”میں اب اتنی بھیڑیوں لگا رہی ہے؟ سب باہر جائیں۔ دو لہا کو کچھ تو باتیں کرنے دیں۔“

کامران نے چیخ کر کلمہ ”بس مٹی کیجئے۔ جب میں نے مونا کو حاصل کرنے کی التجا کی تو آپ اور بیٹا اپنی انا کی دیوار کھڑی کرتے رہے۔ جب بات مانی تو صرف تین دن رہ گئے مگر تین دنوں میں بھی رسم و رواج کی دیواریں کھڑی کی گئیں ایسا دیواریں جن میں مونا تک پہنچنے کے لیے کوئی دروازہ نہیں تھا۔ آج میں اسے بیاہ کر لایا تو ہمارے ساتھ کیا ہوا؟ میری آپا نے اپنے آنسوؤں کی دیوار کھڑی کر دی۔ ہم اپنی سسک رات سڑکوں پر اور قہقارے میں مٹا کر آئے ہیں۔ آپ لوگوں کو تو جشن منانا چاہیے۔“

اس نے مونا کی طرف پلٹ کر کلمہ ”کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ دلن کے روپ میں تماشا ہو۔ جاؤ اور لباس تبدیل کرو ہم ابھی ایئر پورٹ جا رہے ہیں۔“

عورتیں دلن کے کمرے سے باہر جا رہی تھیں۔ دلن اپنا لباس نکال کر ہاتھ روم کی طرف جانے لگی۔ مٹی نے پوچھا ”بیٹے! کیا غصہ دکھا کر جاؤ گے؟“

آپا نے پوچھا ”کچھ کھائے پئے بغیر گئے ہیں نہیں جانے دوں گی۔“

”آپ لوگوں کی محبت سے پیٹ بھر گیا ہے۔ رہ گیا غصہ تو میں کس پر دکھا سکتا ہوں؟ کیا پھولوں بھری بیج کو بیج ڈالوں اپنا پتہ نہ بچ لوں؟“

اس کے بیٹا نے بیڑ روم کے دروازے پر آ کر کلمہ ”بیگم! یہ درست کہہ رہا ہے۔“

ہم سب نے مل کر اپنے بیٹے اور بوڑھے غلم کیے ہیں۔ ان کے جانے میں جو بھی وقت رہ گیا ہے اس وقت تک کوئی ان کے درمیان نہ رہے۔ یہ جہاں جاتے ہیں انہیں جانے دیا جائے۔ ہم ہمیں سے انہیں رخصت کریں گے۔“

اس کی مٹی اور پاپے نے مزید بحث نہیں کی۔ چپ چاپ کمرے سے چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ مونا کے ساتھ کار میں بیٹھا ایئر پورٹ کی طرف جا رہا تھا۔ وہ دونوں تھا تھے۔ شرجاگ رہا تھا۔ بھری پری شاہراہیں ان کے ساتھ چل رہی تھیں۔ مٹی پاپ اور رشتے داروں نے انہیں تنہا کا موقع دیا تھا لیکن تنہا ان کے نصیب میں نہیں تھی۔

مونا نے ایک سادہ سی ساڑی پہن لی تھی۔ بدن پر ایک زیور بھی نہیں تھا۔ زلفیں کھلی ہوئی تھیں۔ بالکل اجڑی اجڑی لگ رہی تھی۔ حقیقتاً کوئی ساکن بھی یوں نہ اجڑی ہوگی۔

وہ ویڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ ”کای! تم مجھے کتنا چاہتے ہو؟“

”سوال نہ کرو۔ آؤا کر دیکھو لو۔“

”وہ تو میں نے آزما لیا۔ تم اپنے جسم کا ایک ایک قطرہ خون میرے ہلم پر بہا سکتے ہو۔ میں سوچتی ہوں‘ جب اتنی قربانیاں دے سکتے ہو تو کیا میری خاطر دیس کا کام چھوڑ کر اپنے ہی ملک میں کوئی روزگار حاصل نہیں کر سکتے؟“

”ضرور کر سکتا ہوں لیکن یہ تو سوچو روزگار کی تلاش میں زیادہ سے زیادہ کمانے کے لیے‘ اپنا مستقبل شائدہ بنانے کے لیے لوگ ملک سے باہر جاتے ہیں۔ ملک سے باہر جانے کے کئی مقاصد ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم اپنی صلاحیتوں کا وہاں بھرپور مظاہرہ کریں۔ دوسرا اپنے ملک کے لیے زرمبادلہ کمائیں۔ تیسرے یہ کہ غیر ممالک میں رہ کر غیر سرکاری طور پر اپنے ملک کی نمائندگی کرتے رہیں۔“

وہ آنسو بھرے لبے میں بولی۔ ”میں تمہارہ جاؤں گی۔“

”دون ایسا سنگدل ہو گا جو دل و جان سے حاصل کی ہوئی محبت کو تنہا چھوڑ کر جانے لگے۔ میں جا رہا ہوں تو میرا سینہ اندر سے خالی ہو رہا ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے میں اپنی

ذات میں اندر سے کچھ نہیں رہا۔ جو کچھ بھی تھا اسے تمہارے سامنے ہار چکا ہوں اور تانام جواری کی طرح واپس جا رہا ہوں۔“

”کیا تم وہاں پہنچنے ہی مجھے اپنے پاس بلاو گے؟“

”بھری پکلی کوشش یہی ہوگی۔ تم یہاں اپنا پاسپورٹ وغیرہ تیار رکھنا۔ میں کسی دن بھی تمہارے لیے وہاں سے بکٹ اور ویزا وغیرہ روانہ کر سکتا ہوں۔“

وہ ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ وہاں باتیں کر کے وقت گزارتے رہے۔ وقت کیا گزارنا تھا۔ وقت انہیں گزار رہا تھا اور بڑی تیزی سے گزار رہا تھا۔ جب کوئی خواہش پوری نہ ہو تو اسے پورا کرنے کے لیے آدی میں پچکان پین پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی۔ آج کوئی فلائٹ یہاں سے نہ جائے یا کسی وجہ سے کامران کا کٹنگ کینسل ہو جائے۔ کوئی ایسی وجہ ہو جائے کہ وہ کم از کم ایک دن کے۔ بے رک جائے۔

کامران نے کہا۔ ”میرا دل نہیں چاہتا“ تمہیں چھوڑ کر جاؤں مگر میں جو محنت کروں گا۔ مستقبل بناؤں گا اور تمہارے لیے بناؤں گا۔ اپنی ہونے والی اولاد کے لیے بناؤں گا۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ کمانے، زیادہ سے زیادہ مستقبل کو شاندار بنانے کے لیے ہمیں بڑی قربانیاں دینی ہوں گی۔“

”اس سے بڑی قربانی کیا ہو گی کہ ہم نے شادی کی پہلی رات قربان کر دی۔ ہماری آئندہ ملاقات تک جانے کتنی راتیں اور کتنے دن اور قربان ہوتے رہیں گے۔ مستقبل سنوارنے کا سوال ہے اس لیے چپ ہوں۔ میر کر رہی ہوں۔“

وہ ممبر کا حوصلہ کرتی تھی مگر بولتے بولتے روئے لگتی تھی۔ کامران اسے تسلیاں دیتا جا رہا تھا۔ آخر اس کے رخصت ہونے کا وقت آئی گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ بڑے دکھ سے بولا۔ ”تمہارا ہاتھ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ اس ہاتھ کو دوبارہ تھامنے کے لیے وہاں پہنچنے ہی کوشش کروں گا اور جیسے جلد سے جلد اپنے پاس بلاؤں گا۔“

وہ روٹی رہی۔ کامران اس سے ہاتھ چھڑا کر دور چلے لگا۔ وہ جا رہا تھا اور آنسوؤں میں دھندلا رہا تھا۔ وہ آہٹل سے آنسو پونچھتی تھی تو کچھ صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ پھر

آنکھیں بھر جاتی تھیں۔ منظر دھندلا جاتا تھا۔ اس نے دوسری تیسری بار آنسو پونچھتے ہوئے دیکھا۔ وہ طیارے تک پہنچ چکا تھا۔ وہاں سے پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ اس نے آنسو نہیں پونچھے۔ اب پونچھ کر کیا کرنا تھا؟ کسے دیکھنا تھا۔ منظر دھندلا رہا ہے، دھندلا رہا ہے، اس کی تو اپنی زندگی، اپنے ارمان اور اپنے جذبے دھندلا رہے تھے۔

پھر وہ وقت آیا کہ طیارہ وہاں سے حرکت کرتا ہوا دن وے پر دوڑتا ہوا بلندی پر پرواز کرنے لگا۔ دور چلنے لگا۔ نگاہ نگاہ تک وہ اسے یوں بھتی رہی جیسے وہ پلٹ کر واپس آئے گا اور کہے گا۔ میں تو تمہارا امتحان لے رہا تھا۔ ہماری رفاقت اس لیے تو نہیں تھی کہ تمہیں چھوڑ کر پردیس چلا جاؤں۔

اس کے دل کی گمراہیوں سے ایک آہ نکلی۔ ”آہ!“

بے فیض رفاقت میں شمر کس کے لیے تھا
جب دھوپ تھی قسمت تو شجر کس کے لیے تھا
پردیس میں سوتا تھا تو چھت کس کے لیے ڈالی
باہر ہی لکنا تھا تو گھر کس کے لیے تھا

☆-----☆-----☆

رہا۔ اس کا رویہ ایک مخصوص ڈگر پر چل رہا ہے اور تم چلا رہے ہو۔ اس میں تمہاری مستقل مزاجی یا فحس منصوبہ بندی کا دخل نہیں ہے۔ اگر تم نے کوئی مستقل ارادہ کیا ہو اور اس پر عمل کیا ہو تو بتاؤ؟“

”مجھے اور کون سا ارادہ کرنا ہے؟“

”اتنی عمر ہو گئی ہے۔ شادی تو کر سکتے ہو۔ شادی کا منصوبہ بتانا ایک اچھی شریک حیات کا انتخاب کرنا اور اس کے ساتھ مستقل زندگی گزارنا ایک فحس منصوبے کی دلیل ہے۔“

”ایسا تو بھی کرتے ہیں۔“

”بھی کامیاب ازدواجی زندگی نہیں گزارتے۔ ازدواجی زندگی کا رویہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔ پہلے بیوی کے مزاج کو سمجھنا اور اپنا مزاج سمجھنا اور کامیابی سے زندگی گزارنا اس کے بعد اولاد کا مستقبل سنوارنا یہ باتیں ایسی ہیں کہ اس دوران میاں بیوی مختلف مراحل سے مختلف آزمائشوں سے گزرتے ہیں۔ تم بہت خدی ہو۔ اگر ایک بار شادی کی خد کر لو تو یقیناً کر کے رہو گے۔“

”تم اچھی طرح جانتے ہو میں عورتوں سے نفرت کرتا ہوں سب کچھ کر سکتا ہوں شادی نہیں کر سکتا۔“

ڈاکٹر ہنر نے ہنسنے ہوئے کہہ ”تمہارا وہ دوست کامران بھی تمہارے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ اس نے بھی سوچ رکھا تھا کہ شادی نہیں کرے گا اور اب تمہی کہتے ہو کہ پاکستان پہنچے ہی اس نے شادی کر لی ہے۔“

”ہاں“ دو گھنٹے بعد میاں بیوی پر ہے۔ میں اسے لینے ایئر پورٹ جا رہا ہوں۔ کبکٹ کو کھڑی کھڑی سناؤں گلہ اس نے شادی کر کے میرا نام ڈوبا دیا ہے۔“

”اس میں نام ڈوبنے کی کیا بات ہے؟“

اس نے حقارت سے کہہ ”عورت آخر ہوتی کیا ہے؟ چند سکوں میں حاصل ہو

جاتی ہے۔“

”اوہ“ نو“ نو“ رضا مراد! عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے آگے سپاہی ہتھیار ڈال

وہ رائل ہسپتال کی سب سے اونچی منزل پر بیٹھا ڈاکٹر سے باتیں بھی کر رہا تھا اور وسیع و عریض کھڑکی کے باہر منظر بھی دیکھ رہا تھا۔ لندن کی فضا کمر آلود تھی۔ ددر وریائے ٹیمر کمر میں دھندلا رہا تھا۔ ایک طرف البرٹ برج اور دوسری طرف چیلی برج دکھائی دے رہے تھے۔ ڈاکٹر نے کہہ ”رضا مراد! تمہارا دماغ اور دوسری طرف چیلی برج دکھائی نہیں کوئی بیماری نہیں ہے۔ دراصل تم کوئی سائنڈ ہو یعنی تمہارے دماغ میں دھند چھائی رہتی ہے۔ یہ کمزیر دھند آخر کیا چیز ہے؟ اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ جس طرح لندن کے خوب صورت مناظر کو کمر چھپا لیتا ہے۔ یہ خد ہے کہ خوب صورتی کو چھپا لے گی۔ اسی طرح تمہارا دماغ بہت سی حقیقتوں کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے۔ پھر کمر آلود دماغ کے ذریعے جو بات سمجھ میں آتی ہے تم اس پر عمل کرنے لگتے ہو۔“

”ڈاکٹر ہنر! اگر تم نفسیاتی اصطلاحات میں باتیں کرو گے تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ تم محض ڈاکٹر نہیں میرے دوست بھی ہو اس لیے دوستانہ انداز میں سیدھے سارے طریقے سے سمجھاؤ۔ بات کیا ہے؟“

”بات کچھ بھی نہیں ہے۔ بس تم حقیقت سے گریز کرتے ہو کوئی کپا خیال تمہارے دماغ میں آتا ہے، تم اس پر عمل کرتے ہو۔ کسی فحس منصوبے کے تحت کام نہیں کرتے۔“

”وہ ڈاکٹر میں لندن مٹی کیب ایجنسی کے نام سے اتنا بڑا کاروبار چلا رہا ہوں۔ کیا یہ میرا فحس منصوبہ نہیں ہے؟“

”وہ کاروبار تمہارے بڑے بھائی نے شروع کیا تھا۔ بے چارہ اس دنیا میں نہیں

دیتے ہیں۔ ششہفتہ وقت ان کے تدموں میں تاج رکھ دیتا ہے۔ پھر بھی وہ حاصل نہیں ہوتیں۔ تم نے لندن میں رہ کر صرف وی ڈی ٹیٹ منٹ حاصل کرنے والی لعلتی عورتوں کو دیکھا ہے۔

”ڈاکٹر! اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں بھی کامران کی طرح پاکستان کا ایک پتھر کا ڈون۔ وہاں کوئی عورت مجھے اپنی زلفوں کی ذخیر میں بکڑے اور میں اسے بیاہ کر لے آؤں۔“

”اگر اپنے ملک، اپنی قوم کی کوئی عورت بیاہ کر لے آؤ تو بہتر ہے۔ اپنے ہاں کی عورت جلد ہی مرد کی ہم مزاج بن جاتی ہے۔“

رضا مراد نے ہنسنے ہوئے کہہ ”معاذ تو ایمریشن کا ہے۔ شادی کرنے کے بعد یہاں کیسے لائیں میرا مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے بشرطیکہ میں کبھی شادی کروں، جس کی امید نہیں ہے۔ مسئلہ تو کامران کا ہے۔ وہ اپنی وائف کو یہاں کیسے لائے گا؟ اسے مرکز اجازت نہیں ملے گی کیونکہ وہ یہاں کا باقاعدہ شری نہیں ہے۔“

”اس کے لیے یہ بڑا پرابلم ہے۔“

”جب سے وہ کسی مونا کے عشق میں گرفتار ہوا ہے تب سے درجنوں خطوط لکھ چکا ہے۔ ہر خط میں ایک ہی بات کہ میں فوراً ہی اس کی وائف کے ایمریشن کے لیے کوشش شروع کر دوں تاکہ وہ شادی کے فوراً بعد اسے یہاں لے آئے۔ اب تمی بتاؤ، میں اس مسئلے میں کیا کر سکتا ہوں؟ کیا تم کوئی مدد کر سکتے ہو؟“

”اگر برطانیہ کا قانون کسی کی سفارش سے تبدیل ہو سکتا تو میں بڑی بڑی سفارشیں حاصل کر سکتا تھا۔“

”بھاری دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔ وہ کامران کا بچہ یہاں آئے گا تو دن رات میرا دلغ کھاتا رہے گا، بچہ، کچھ کر نہیں سکتے تو کوئی اچھا سا مشورہ ہی دو۔“

”میرا مشورہ ہے، کسی وکیل کی خدمات حاصل کر دو۔ دنیا کے تمام وکیل جو قانون کا احترام کرتے اور اس کا تحفظ کرتے ہیں، ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو قانون کی کمزوریاں تلاش کرتے ہیں اور کبھی کبھی اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اسے وائل پلٹ کر اپنے مزاج اور مفاد کے مطابق بدل دیتے ہیں۔ شاید کوئی وکیل تمہارے لیے ایسا کر

کے۔“

”میں بھی کسی وکیل کے متعلق سوچ رہا تھا۔ تم نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔ ہم اس پر ضرور عمل کریں گے۔ پائی دی دے، میرے علاج کے متعلق بتاؤ۔ یہ نئی بیماری کیسے شروع ہو گئی؟ پہلے میرے قلع میں جلن نہیں ہوتی تھی۔“

”یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تمہیں کوئی نہ کوئی نئی بیماری لاحق ہوتی رہتی ہے۔ تم دھند میں گرفتار رہتے ہو۔ اس لیے اپنے آپ پر شبہ کرتے ہو کہ صحت مند نہیں ہو۔ جب خود پر اعتماد نہ رہے تو آدمی نفسیاتی طور پر بیمار ہو جاتا ہے۔ ہر حال میں جو گولیاں لکھ کر دی ہیں، انہیں کھانے کے بعد چلیا کر دو۔ بیماری دور ہو جائے گی۔ میں جانتا ہوں مجھے دو مہینے بعد تم کوئی نئی بیماری لے کر آؤ گے۔ اس لیے اب یہاں سے جاؤ۔“

”بھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فلائیٹ کا وقت ہو رہا ہے میں خود ہی جا رہا ہوں۔ اچھا پھر ملیں گے۔“

اس نے مصافحہ کیل پھر اس کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ڈاکٹر نے اپنی اسٹنٹ کو بلا یا پھر کہہ ”رضا مراد کی فائل لے آؤ۔“

فائل پیش کی گئی۔ اس نے کھول کر اسے پڑھنا شروع کیا۔ آج سے دو برس پہلے رضا مراد بالکل نارمل تھا۔ یوں تو اب بھی نارمل نظر آتا تھا لیکن ذہنی انتشار میں مبتلا رہتا تھا۔ پچھلے دنوں اس کے ساتھ جو حالات پیش آئے تھے، ان کا نفسیاتی تجزیہ کرنے پر واضح ہوتا تھا کہ وہ غیر شعوری طور پر اپنے آپ سے انتقام لیتا ہے۔ جب کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تو اپنے آپ کو بیمار بناتا ہے۔ ایسی ہی چھوٹی موٹی خود ساختہ بیماریوں کے دوران اس کی دوستی ڈاکٹر جان بنز سے ہو گئی تھی۔

قصہ یوں ہے کہ اسے شینہ پند آگئی تھی۔ اس نے ٹوٹ کر اس سے محبت کی اور اس کے قریب ہوتا چلا گیا۔ اس دوران شینہ اور اس کے والدین کو معلوم ہوا کہ رضا مراد کا بڑا بھائی فیا مراد تمام کامیاب کاروبار کا مالک ہے۔ اس لیے شینہ ادھر سے ادھر ہو گئی۔ اس سے ملاقاتیں کرنے لگی۔ اس کے والدین کسی نہ کسی بہانے اسے اپنے ہاں مدعو کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بڑے بھائی کے ساتھ شینہ کی شادی ہو گئی۔ اس شادی نے رضا

کہ ”تین تین خواب آور گولیاں کھاتے ہو۔ یہ تمہارے لیے نقصان دہ ہے میں تمہیں صرف ایک گولی کھاؤں گا اس کے بعد تم آرام سے سو جاؤ گے اور صبح وقت پر بیدار ہو سکے“، لیکن ایک شرط ہے۔“
”وہ کیا؟“

”جیسا میں کہوں ویسا ہی عمل کرو۔ اپنے بستر پر چاروں شالے چت لیٹ جاؤ۔“
اس نے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیا۔ جہاں وہ لیٹا ہوا تھا وہاں سے اس کی نگاہیں مائے آفتاب دان کی طرف جاتی تھیں۔ ڈاکٹر نے وہاں ایک موم بتی روشن کر دی اور کہل: ”بب تک تمہیں ٹینڈ نہ آئے اس موم بتی کی روشنی کو سکتے رہو۔ صرف ایک ہی بات سوچنے رہو کہ تمہیں حالات سے سمجھوتہ کرنا ہے اور اپنے بھائی کے کاروبار کو سنبھالنا نہ۔ سوچتے سوچتے جھنجھنے لگو تو آنکھیں بند کر لیتا۔ خود بخود نیند آجائے گی۔“

اس نے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیا۔ ایک گولی کھائی۔ اس کے بعد آرام سے لیٹ گیا۔ شمع کی لو کو سکتا رہا سوچتا رہا پھر آنکھیں بند کر کے سو گیا۔ صبح بیدار ہوا تو تازہ دم تھا اور یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ بھائی کے کاروبار کو سنبھالے گا۔ وہ کامران سے گھر کی کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔ جو کچھ ہوتا تھا اس سے کہتا تھا اور اس سے مشورہ طلب کرتا تھا۔ اس نے جاکر فریڈ پھر آہستہ آہستہ اسے سمجھا دی ہے کہ دھچکی کے بعد اس سے شادی کر لے! اگر نہیں کرے گا تو کاروبار کا ہنوار ہو گا۔ بیوی اور بچے کو زیادہ ملے گا اور بھائی کو شاید بچہ نہ ملے۔

کامران نے کہل: ”یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فریڈ اور اس کے گھر والے دولت کی طرف جھکتے ہیں۔ ویسے بھی لوگ یہی دیکھتے ہیں کہ کھانے کمانے والا لڑکا ہو۔ اچھا کاروبار ہو تو بڑی اسی کو دی جائے اسی لیے انہوں نے فریڈ کی شادی تمہارے بھائی جان سے کی ہے۔ اب وہ بیوہ ہونے کے بعد دوسری شادی نہ کرے اور تمہارے بھائی کی اولاد پیدا کرے تو وہ اپنے بچے کے ساتھ اس کاروبار کی پوری طرح مالک ہو گی۔ اس میں سے شاید ہی تمہیں کچھ حصہ مل سکے۔ اگر تم کاروباری نقطہ نظر سے اس سے شادی کر لو تو سب کچھ تمہارا ہو گا۔“

مراد کے دماغ کو زبردست دھچکا پہنچا۔ وہ بظاہر مسکراتا رہا اور دماغی صدمے کو چھپاتا رہا۔ اندر اگر طوفان مچل رہا ہو۔ لادایک رہا ہو تو اسے چھپانا حال ہوتا ہے۔ انسان کی حرکتوں سے اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ بات بات پر جھجھکانے لگا تھا۔ بھائی کے کاروبار میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے بھائی کے ساتھ رہنا چھوڑ دیا تھا۔ لندن میں ایسے فلیٹ دستیاب ہو جاتے ہیں جہاں کسی کے ساتھ شیئر میں رہا جاسکتا ہے۔ یعنی دو یا تین افراد مشترکہ طور پر کرایہ دے کر وہاں رہ سکتے ہیں۔ وہ ایسے ہی ایک فلیٹ میں رہنے لگا۔ کامران نے اسے بہترا سمجھایا۔ ”بھئی حالات سے سمجھوتہ کرو۔ دنیا میں ایک ٹینڈ ہی حسین عورت نہیں ہے بہت ہیں۔ تم ایک دھوم دھوا گے ہزار ملیں گی۔“
”اس نے جھجھکا کر کہل: ”اب میں عورتوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں کبھی کسی پر بھروسہ نہیں کروں گا اور نہ ہی کسی عورت کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھوں گا۔“

”تم عورت کو شریک حیات کے روپ میں نہ دیکھو۔ اس سے نفرت کرو“ یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے لیکن عورت کے کئی روپ ہوتے ہیں۔ ماں، بہن، بیٹی اور بھائی۔ تمہیں ٹینڈ کو بھائی کی حیثیت سے تسلیم کرنا چاہیے۔“
”میں اسے کسی حیثیت سے تسلیم نہیں کروں گا۔ وہ ایک بلا ہے“ اس بلا سے دور رہنا ہی دانش مندی ہے۔“

وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ شادی کے چھ ماہ بعد ہی فریڈ مراد کا ہارٹ میل ہو گیا۔ اسے اپنے بھائی کی آخری رسومات میں شریک ہونے کے لیے اس کے گھر جانا پڑا۔ جب رسومات ادا کرنے کے بعد واپس آیا تو فریڈ نے اس سے معافی مانگی۔ ”مذکرہ کر کہل: ”جو کچھ ہوا“ اسے بھول جاؤ۔ اپنے بھائی کے کاروبار کو پوری ذمہ داریوں سے سنبھال لو۔ میری خاطر نہ سہی“ اپنے بھائی کے کاروبار کی خاطر اور اپنے بھائی کے ہونے والے بچے کی خاطر یہ ملے آؤ۔“

کامران نے بھی دوستی کا واسطہ دیا۔ اسے سمجھایا۔ اس کا دوست ڈاکٹر جان ہنر بھی اس سے ملنے کے لیے آیا۔ اس نے کہل: ”تم شکایت کرتے ہو کہ راتوں کو نیند نہیں آتی۔

”میں ایسے کاروبار پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں شینہ کی صورت بھی دیکھنا گوارا نہ کرتا۔“

جب شینہ کو اس فیصلے کا علم ہوا تو اس نے پہنچ کے انداز میں کہا۔ ”میرے دیکھوں گی کہ میرے مرحوم شوہر کا کاروبار تم کیسے اپناتا ہو۔ یہاں لندن میں ملازمت کرو گے یا بھوکے مرو گے لیکن بھائی کے کاروبار سے ایک ٹکنا نہیں لینے دوں میرا بیٹا ہو گا اور وہی اس کاروبار کا مالک ہو گا۔“

قصہ مختصر جب وقت آیا تو شینہ کا پہنچ پورا نہ ہو سکا۔ بچہ پیدائش سے پہلے ہی گیا تھا۔ میجر آپریشن کی نوبت آئی جس کے نتیجے میں وہ جانبر نہ ہو سکی۔ نہ بچہ رہا نہ رہی۔ رضا مراد اپنے بھائی کے کاروبار کا بلا شرکت غیر مالک بن گیا۔

لیکن وہ نفرت کا جو بوجھ مٹی تھی اس کا پودا رضا مراد کے دماغ میں پھل پھول گیا تھا۔ اب اس کے سر میں کبھی درد رہتا تھا۔ کبھی نیند نہیں آتی تھی اور کبھی گیس شکایت رہتی تھی۔ باہر نفسیات ڈاکٹر جان ہنر کھتا تھا۔ وہ نفرت کی دھند میں چھپا ہوا ہم شینہ مر گئی۔ اس سے انتقام نہیں لے سکتا۔ لہذا اپنے آپ کو بیمار بنا کے انتقام لے رہا۔ اس کا علاج ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ شادی کر لے۔

نفسیاتی مسئلوں سے کہ شادی کے بعد بیوی خوش اخلاق اور وقار ہو گی تو جو نفرت دھلی جائے گی اور اگر وہ بھی بیوفا اور نافرمان ہوئی تو رضا مراد اس سے نفرت کرے گا جیسے جو اب شینہ سے نفرت کر رہا ہو اور اس سے انتقام لے رہا ہو۔

نفرت کا دریا بننے کے لیے کوئی راستہ چاہتا ہے۔ اس کا رخ سوڑ دیا جائے یعنی مراد کی زندگی میں محبت کرنے والی بیوی آجائے تو وہ عورت سے محبت کرنا سیکھ جائے خود کو بیمار بنا کر رکھنا بھول جائے گا لیکن اس کی زندگی میں جو عورت آئے وہ خوب سمجھ کر آئے۔ شینہ کی نفرت کو تازہ کرنے والی آئے گی تو وہ انتقام میں جنون کی حد تک گزر سکتا ہے۔

دوسری بار اس کی زندگی میں ایک ایٹھواڑین لڑکی لیزا آئی۔ تیسری بار شیانہ آئی۔ دونوں ہی لڑکیوں کی صورت اور خوش اخلاق تھیں۔ کامران اور ڈاکٹر جان ہنر نے اسے

بھلیا۔ لیزا یا شیانہ کسی سے بھی شادی کرنے پر ہر طرح سے مجبور کیا مگر اس نے جواباً کہا ”شادی اس سے کی جاتی ہے جس پر دل آتا ہے۔ شینہ پر آیا تھا۔ اب کسی پر نہیں آئے گا۔“

اکثر ایسا ہوتا ہے جب کبھی کسی سے دوستی کرنے کے لیے دل چلتا ہے تو پرانی دوستی کا زخم بھر جاتا ہے۔ نئی دوستی آہستہ آہستہ مزاحم رکھتی جاتی ہے اور پچھلی تکیوں کو ہلاتی جاتی ہے لیکن رضا مراد کی ضد اور نفرت ظاہر کر رہی تھی کہ شاید وہ کسی عورت پر براہ راست نہیں کرے گا۔

وہ انیورٹ پینا تو اس وقت تک طیارہ اچکا تھا۔ اسے دیر ہو چکی تھی۔ کامران اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی آگے بڑھ کر گلے لگے۔ کامران نے اسے تھپکتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا اچھے بھول گئے تھے؟“

”میں بھلا نہیں بھول سکتا ہوں؟ تم بھی یاد ہو اور تمہارا کام بھی۔“

”کیا ہوا۔ امیگریشن کے سلسلے میں کوئی بات بن رہی ہے۔“

”نہیں۔ ڈاکٹر جان ہنر کا مشورہ ہے ہم کسی دیکل کی خدمات حاصل کریں۔“

”تو پھر چلو۔ ابھی کسی دیکل سے وقت مقرر کرتے ہیں۔“

”ابھی آئے ہو۔ جلدی کیا ہے۔ پہلے میرے ہاں چلو۔ آرام سے کھائیں گے پتیس کے۔ پھر اپنی کہیں گے کچھ تمہاری سٹیں گے۔“

کامران نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ”ہرگز نہیں۔ پہلے کام ہو گا۔ میں پہلی فرصت میں دونا کو اپنے پاس بلانا چاہتا ہوں۔“

”ایسی بھی کیا ہے قراری ہے؟ عورت کو زیادہ سر نہیں چڑھانا چاہیے۔“

”یار ایسی باتیں نہ کرو۔ سر چڑھانا تو دور کی بات ہے، میں تو اس سے ٹھیک سے بات بھی نہ کر سکا۔“

”کیا مطلب؟“

”آہ شادی ہوئی لیکن ایک رات بھی لہن کے ساتھ نہ گزار سکا۔ تم میری انتہاں سنو گے تو سارے کام چھوڑ کر امیگریشن کا مسئلہ حل کرو گے اور میری مونا کو

میرے دل کی دھڑکنوں تک پہنچاؤ گے۔

”میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ تم آتے ہی پیچھے پڑ جاؤ گے۔ چلو کوشش کرتے ہیں۔“
وہ پارکنگ ایریا میں آئے۔ رضا مراد اپنی کار لے کر آیا تھا۔ اس نے اسٹیرنگ
سنبھال کر کہا۔ ”آج ایک جگہ بکنگ ہے جسے گاڑی بے چانا ہو گی۔“

”میرا دل دماغ ٹھکانے نہیں ہے، جہاں دیکھا ہوں، مونا ہی مونا نظر آتی ہے۔ کب
بتاؤں۔ اگر اس کے حسن کی تعریف شروع کروں تو.....“

”پلیز شروع نہ کرنا مجھے عورت کے حسن سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میری دلچسپی
اتنی ہے کہ تم میرے دوست ہو اور مجھے تمہارے کام آتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ
نہیں۔“

”وہ مجبوریاں تو سنو گے جن کی وجہ سے میں شادی کے بعد بھی دیباہی ہوں جیسا
یہاں سے گیا تھا۔“
”ہاں سنا۔“

وہ سنانے لگا۔ محبت اور مجبوری کی داستان اتنی دلچسپ تھی کہ رضا مراد سنا رہا۔
”چچ میں اپنے دوست سے ہمدردی کا اظہار کرتا رہا۔ جب اس کی داستان ختم ہو گئی تو اس
نے پشیمے ہوئے کہا۔ ”تم سے ہمدردی بھی ہوتی ہے اور غمی بھی آتی ہے۔ اس کا مطلب
تو یہ ہوا کہ تم میاں بیوی کا دامن نچوڑا جائے تو قرشتے فوضو کریں۔“

کامران نے ایک سرو آہ بھری۔ اس کی نگاہوں میں مونا اداسی اداسی دکھائی
دے رہی تھی۔ رضا مراد نیند چٹکی کے علاقے میں رہتا تھا۔ اگرچہ تنہا رہتا تھا لیکن
چھوٹے سے فلیٹ کو خوب بنا ستوار کر رکھا تھا۔ وہاں پہنچ کر کامران نے کہا۔ ”پہلے کسی
اے ون وکیل سے رابطہ قائم کرو۔ اس سے ملاقات کا وقت لے کر۔ اس کے بعد میرے
کراچی والے گھر کے فون پر رابطہ قائم کرو۔ مونا میرے انتظار میں فون کے پاس بیٹھی ہو
گی۔“

”ابھی ہم گھر میں داخل ہوئے ہیں۔ ذرا سانس تو لینے دو۔ تم تو مجھے تھکا مارو
گے۔“

وہ جھنجھلا ہوا فون کے پاس پہنچا۔ پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ کامران
نے مسکرا کر کہا۔ ”تمہاری ادا میں ایسی ہیں کہ اس گھر میں ایک بھالی آجائے تو تم پر قربان
ہوتی رہے۔“

”پلیز! اپنی دلی کا ذکر کرو۔ میری دلی نہ کوئی ہے اور نہ کوئی ہو گی۔“
”یار! شائد بہت اچھی ہے۔ لیذا بھی کہ نہیں ہے لیکن شائد ہم مذہب ہے ہم دہم
ہے، ہم مزاج بھی ثابت ہو گی۔“

”اگر تم یہ کہو اس کو گے تو فون نہیں کروں گا۔“

کامران نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر اشارے سے کہا کہ وہ ایک لفظ بھی نہیں
بولے گا۔ رضا مراد نے رابطہ قائم ہوئی، وکیل کو مخاطب کیا۔ پھر اس سے وقت طے
لرنے کے سلسلے میں باتیں کرنے لگا۔ کامران قریب آکر مراد کے چہرے کو یوں تک رہا تھا
جتے اس کے چہرے کے رد عمل سے وکیل کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہو۔ اس نے کہا۔
”آپ کل کا وقت دے رہے ہیں۔ میرا دوست صبح تک مر جائے گا۔“

دوسری طرف سے وکیل نے پوچھا۔ ”کیا اسے پھانسی ہونے والی ہے؟“
”جنت! قانون کے پھندے سے زیادہ عورت کا پسندنا مضبوط ہوتا ہے۔“
وکیل کی آواز سنائی دی۔ ”میں سمجھ گیا۔ ہم جیسے وکیلوں کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔
تمہارا دوست اپنی بیوی سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔“

”ہرگز نہیں۔ پیچھا تو ہم جیسے مرد چھڑا لیتے ہیں۔ ایک بار دھوکا کھاتے ہیں، بیشک
لے لے گاں پکڑ لیتے ہیں لیکن میرے دوست کو اس کی محبت پاکستان سے کان پکڑ کر یہاں
تک لائی ہے۔ جب تک وہ اپنی بیوی کو یہاں نہیں بلائے گا، محبت اس کے کان نہیں
بھرنے کی، لہذا یہ انگریزیشن کا معاملہ ہے۔“

”یہ کون سی بیوی بات ہے۔ چنگی بجاتے ہی کام ہو جائے گا۔“

”ہم بھی چنگی بجاتے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ میرا دوست یہاں کا باقاعدہ شہری نہیں
ہے۔ اس کی بیوی وڈٹ وڈیز پر چنہ مارے لے آ سکتی ہے مگر میرے دوست کے ساتھ
مستقل نہیں رہ سکتی اور وہ اسے مستقل اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ اب یہ مسئلہ کیسے حل

”کہہ دیا، کل صبح ملاقات ہو گی۔“

”ذرا اپنی ڈائری پر نظر ڈالیں کریں۔ ہو سکتا ہے آج شام کا وقت نکل آئے۔“

”سوری، تمہاری خاطر میں صبح سات بجے ملاقات کر سکتا ہوں۔ نو بجے کورٹ۔“

”ہے۔ اس کے بعد دوسرے ملاقات ہو سکتی ہے۔ جلدی بولو، کون سا وقت مناسب ہے۔“

”جلدی بولنے کی بات ہے تو صبح سات بجے کا وقت مناسب رہے گا۔ ہم حضرا

نہیں گے۔“

اس نے ریسپور رکھ دیا۔ کامران نے بایس ہو کر کہا۔ ”میں آج کی شام اور آج

رات کیسے گزاراؤں گا؟“

رضا مراد نے ریسپور اٹھا کر نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا۔ ”تم تو ایسے کہہ رہے

جیسے وکیل سے ملتے ہی تمہاری مونا یہاں چلی آئے گی۔“

”اسے فوراً بلا نہیں سکتا اس کی آواز تو سن سکتا ہوں۔“

”میں وہی کرنے جا رہا ہوں۔ ذرا انتظار کرو۔ ابھی اس کی آواز سنائی دے گی۔“

کامران وہاں سے چلا ہوا صوفوں کے پاس آیا۔ اس نے سوٹ کیس کو اٹھا کر سٹا

ئیل پر رکھ لیا پھر اسے کھولنے کے بعد ایک اہم کو نکال کر دیکھنے لگا۔ اس کا صفحہ اٹھنے

مونا کی مسکراتی ہوئی صورت نظر آئی۔ وہ بے اختیار مسکرانے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے قسم

کے سامنے نہیں مونا کے رویہ پہنچ گیا ہو۔ اس نے آہستگی سے کہا۔ ”ہیلو۔“

تصویر میں جان پڑ گئی۔ مونا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہیلو۔“

”ہیلو مونا کیسی ہو؟“

مونا نے پھر کہا۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو، ہیلو! یہ بار بار ہیلو کیوں کہہ رہی ہو؟ کچھ اور بھی تو کہو۔“

رضا مراد نے کہا۔ ”ایسا عشق تو نہیں دیکھ لیں مونا اور اوسر ہیلو ہیلو

رہے ہو۔ بھائی فوراً چلے آؤ۔ رابطہ قائم ہو گیا ہے۔“

وہ اہم کو چھوڑ کر دوڑتا ہوا آیا۔ پھر اس نے ریسپور سمجھ کر کان سے لگاتے

لوٹے بولا۔ ”ہیلو مونا! کیا یہ تم ہو؟“

دوسری طرف سے اس کے پلپٹ کی آواز سنائی دی۔ ”بیٹے میں ہوں۔ کیا تم خیریت

منجھ گئے ہو؟“

”نہیں پلپٹ! میں بالکل خیریت سے ہوں۔ آپ کو شش کر کے جلدی سے مونا کا

پورٹ دنیو بنادیں۔“

”تم فکر نہ کرو۔ ایک ہفتے کے اندر پورٹ تیار ہو جائے گا۔“

”ہیلو! ایک ہفتہ بہت ہوتا ہے۔ آپ ذاتی طور پر کوشش کریں گے تو جلد ہی

پورٹ مل جائے گا۔ آپ مونا کو ریسپور دیجئے۔“

ایک لمحے کی خاموشی رہی۔ پھر اس نے چیخ کر پوچھا۔ ”مونا! کیا یہ تم ہو؟“

دوسری طرف سے مٹی کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو ہیلو! میں صدقے میں واری،

تمہاری آواز سن کر اطمینان ہوا کہ تم وہاں خیریت سے پہنچ گئے ہو۔“

”نہیں! میں خیریت سے پہنچ گیا ہوں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ ریسپور مونا کو

اے دیں۔“

پھر ایک لمحے کی خاموشی رہی۔ اس نے پھر چیخ کر پوچھا۔ ”ہیلو مونا! کیا یہ تم ہو؟“

اس بار اس کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو! ہاں! تم خیریت سے تو ہو؟ میں تمہاری

لپٹا رہی ہوں۔“

وہ جھملا کر بولا۔ ”میری عمر کے لحاظ سے آپ کی آواز تیس برس پرانی ہو چکی

ہے۔ پلیز! آپ سب نے میرے تمام دروازے بند کر دیے تھے۔ ٹیلیفون کا دروازہ تو

کھلا دیجئے۔ مجھے اس کی آواز سننے دیجئے۔ مونا کو ریسپور دیجئے۔“

”اے کس مونا کی بات کر رہے ہو؟ بڑا نماز تھا اس پر..... تمہارے جیسے ہی گھر

بھگ گئی۔“

”کیا کہہ رہی ہیں؟“

”سچ کہہ رہی ہوں۔ تم اوسر گئے اوسر وہ یہاں آئی! اپنا تمام سامان اور زیورات

سینے اور ٹیکے چلی گئی۔

اس کے بعد اس کی می کی آواز سنائی دی۔ ”شبابش بیٹے! ہمارے لیے بڑی ہو پینڈ کی۔ ہمارا نام خوب روشن کرے گی۔“

”می ریسور پاپا کو دیجئے۔“

دوسرے ہی لمحے اس کے پاپا کی آواز سنائی دی۔ کامران نے پوچھل۔ ”ابھی آپ مجھ سے گفتگو کرتے وقت مونا کا پاسپورٹ بنوانے پر آمالو کی ظاہر کی۔ اس کے تفصیلات کیوں نہیں بتائیں۔“

”میں بتانے جا رہا تھا لیکن تمہاری می نے ریسور لے لیا۔ بیٹے! وہ خود نہیں اسے جانے پر مجبور کیا گیا ہے۔ میں گھر میں موجود ہوتا تو اسے نہ جانے دیتا۔ تم کو تو وہاں لے آؤں۔ ویسے اس ماحول سے بے خبر وہ اپنے گھر میں رہے گی اور تمہارا انتظار کرے گی۔“

”ٹھیک ہے پاپا! اسے ٹیکے میں رہنے دیں۔ میں ابھی اس سے رابطہ قائم کروں آپ کو پھر فون کروں گا“ خدا حافظ۔“

اس نے ریسور رکھ کر رضا مراد کو مونا کے پردوسی کا نمبر بتایا، پھر کہل۔ ”ہیلو! اس رابطہ قائم کرو۔ یقیناً وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔“

وہ پھر رابطہ قائم کرنے لگا۔ کامران وہاں سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے اندر چلی ہوئی تھی۔ وہ دوسرے سے اُسرٹھٹھٹھ لگا۔ مونا اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہی تھی وہ سوچ رہا تھا، ’جس نام اس کی می اور آپا وغیرہ نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے کہ وہاں سے جانے پر مجبور ہو گئی۔ اسے غصہ بھی آ رہا تھا اور وہ پریشان بھی ہو رہا تھا۔ قلم دس منٹ بعد رابطہ قائم ہوا۔ اس نے ریسور اٹھا کر کہل۔ ”ہیلو! کیا آپ مونا کے پردوسی ہیں؟“

”جی ہاں! میں ان کا پردوسی ہوں۔ مونا یہاں بیٹھی انتظار کر رہی ہے، بات کریں۔“ پھر مونا کی آواز سنائی دی۔ وہی حشرم آواز تھی۔ وہی شیریں لہو تھا وہ کہہ رہی تھی۔ ”ہیلو! تم نے کہا تھا پاکستان کے وقت کے مطابق چھ بجے اور وہاں کے وقت

مطابق تقریباً ڈیڑھ بجے پہنچو گے۔ میں ڈیڑھ بجے سے بیٹھی انتظار کر رہی ہوں۔“

”اور میں اس وقت سے انتظار کر رہا ہوں جب طیارہ کراچی ایئر پورٹ سے پرواز کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہاں پہنچوں گا کہ تمہاری آواز سنوں گا۔ گھر پر فون کیا تو پتا چلا کہ تم ٹیکے میں ہو۔ مونا جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ ٹیکے میں ہی رہو۔ میں نے یہاں آتے ہی ایک وکیل سے ملاقات کا وقت طے کیا ہے۔ کل صبح سات بجے تمہارے متعلق باتیں ہوں گی۔ میں کوشش کر رہا ہوں۔ تم دعا کرو۔ تمہارے یہاں آنے کی کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔“

”میری ہر سانس دعا کر رہی ہے۔ مجھے کسی طرح بلالو۔ کسی بھی طرح بلالو۔“

”مونا! تمہاری بے قراری میری بے قراری ہے۔ تم میرے جذباتوں کو اس طرح بھٹکتی ہو کہ میں بچتے ہی میں نے کوششیں شروع کر دی ہیں۔“

وہ باتیں کر رہا تھا۔ دوسری طرف رضا مراد دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے ناگوار سے منہ بنا رہا تھا۔ اس کے باوجود باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ کامران دوسرے دن مونا سے گفتگو کرنے کے لیے وقت مقرر کر رہا تھا۔ پھر اس نے ریسور رکھتے ہوئے کہل۔ ”کیوں اس طرح کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے بیٹھے ہو۔ کوئی کام نہیں ہے تو میری شادی کا اہم دیکھو۔ میری مونا کو دیکھو گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔“

وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری مونا اور دنیا کی ساری موناؤں کو دور سے سلام۔ وہ تمہاری ہنسی مکرانی یادوں کا اہم ہے، جنہیں مبارک ہو۔ میرے لئے میرا برنس اہم ہے، اس لیے خدا حافظ۔ رات کو ملاقات ہو گی۔“

وہ چلا گیا۔ کامران مونا کے خیالوں میں بہتا ہوا سوٹ کیس کے پاس آیا۔ پھر اہم کھول کر اس کی تصویریں دیکھنے لگا۔ وہ دونوں دوسرے دن سات بجے وکیل کے پاس پہنچے۔ اسے ساری روداد سنائی۔ وکیل نے یسوس ہو کر کہل۔ ”سٹر کامران! تمہارے پاس درک پرنٹ نہیں ہے تم یہاں کی کام نہیں کر سکتے، تو اپنی دانف کو باقاعدہ کیسے بلا سکتے ہو؟ اسے کچھ عرصے کے لیے بلاؤ۔ وہ تمہارے ساتھ چند مہینے رہے گی۔ یہاں کی سیر کرے گی۔ پھر واپس چلی جائے گی۔“

”میں یکی تو نہیں چاہتا۔ وہ میری شریک حیات ہے۔ اس لیے میری حیات کے ساتھ رہے گی۔“

”پھر تو سیدھا سارا سہ ہے جس طرح تم یہاں رہتے ہو، اسی طرح تمہاری بیوی بھی بے قاعدہ شہری بن کر رہ سکتی ہے۔“

کارمان نے کلمہ ”میں اس پہلو پر غور کر چکا ہوں۔ ہم جیسے مرد یہاں کے بے قاعدہ شہری بن کر رہ سکتے ہیں لیکن عورت نہیں رہ سکتی۔“

دیکل نے پوچھا۔ ”کیوں؟“

فرض کیجئے، میری بیوی میرے ساتھ ہے۔ چند ماہ بعد یا چند سال بعد اس کے پاؤں بھاری ہو جائیں وہ میرے بچے کی ماں بن جائے تو وہ بچہ کلمہ کا شہری کھلائے گا۔ اسے برتھ سرٹیفکیٹ کہاں سے ملے گا؟ برطانیہ سے یا پاکستان سے؟ ہمارا بچہ تو کس کا نہیں رہے گا کیوں کہ وہ برطانیہ میں پیدا ہو گا اور یہاں کے قانون کے مطابق پہلے اس بچے کے ماں باپ کو یہاں کی شہریت کا ثبوت دینا ہو گا۔ اسی طرح اس بچے کو پاکستان کی شہریت حاصل نہیں ہو سکے گی کیوں کہ وہ برطانیہ میں پیدا ہو گا۔“

دیکل نے کلمہ ”یہ کر سکتے ہو کہ جب تمہاری وائف ماں بنے والی ہو تو اسے پاکستان بھیج دیتا۔ وہاں بچے کی ولادت ہو گی۔“

”رضا مراد نے کلمہ“ دیکل صاحب! ذرا سوچ کچھ کر مشورہ دیجئے۔ ہم ایشیائی باشندے ہیں۔ ہر سال ہمارے یہاں بچے ہوتے ہیں۔ کیا ہر سال اس کی بیوی پاکستان چلا کرے گی؟“

دیکل نے کلمہ ”پھر تو بڑی مشکل ہے۔ بھیجی سیدھی کی بات ہے مسٹر کارمان! تم یہاں کا قاعدہ شہری بننے کے لیے درخواست کیوں نہیں دیتے۔ تم چار برس سے یہاں ہو۔ تمہارا ریکارڈ یقیناً اچھا ہو گا۔“

”اچھا نہیں ہے۔ میں مسٹر مراد کی مٹی کیب ایلجنسی کا ڈرائیور ہوں۔ مسافروں کے اصرار کرنے پر دوبار میں نے گاڑی غلط جگہ پارک کی۔ اس کا چالان ہوا۔ تیسری بار ایکسٹنٹ ہو گیلہ میں پولیس کی نظروں میں آگیا۔ آپ کو یاد ہو گا؟ اب سے چند برس پہلے

یہاں کے شرپسند نڈی قسم کے انگریز نوجوان نے نسلی فسادات شروع کیے تھے۔ اس مسئلے میں کتنے ہی قتل ہوئے۔ تجزیہ کاروں کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں ایک امن پسند شہری ہوں۔ اپنا کما ہوں، اپنا کھاتا ہوں لیکن اس ہنگامے کی لپیٹ میں آگیا۔ پولیس والوں نے مجھے بھی دھریا۔ ایک ماہ جیل میں گزار کر آیا ہوں۔ مختصر یہ کہ میرا نام پولیس والوں کی لسٹ میں ہے۔ میرے پاس اچھے مری کا ریکارڈ نہیں ہے۔ میں کس منہ سے باقاعدہ شہری ہونے کے لیے درخواست پیش کروں؟“

”یہ معاملہ پیچیدہ ہے۔ مجھے سوچنے کا وقت دو اور ایک ہفتہ بعد ملاقات کرو۔“

”ایک ہفتہ بہت ہوتا ہے۔ آج کل کا وقت دیتے۔“

رضا مراد نے کلمہ ”کارمان! ذرا صبر سے کام لو۔ انہیں اس مسئلے پر اچھی طرح سوچنے دیجئے اور تمہارے لیے کوئی راستہ نکالنے کا وقت دو۔ اس وقت تک تمہاری بیوی کا پاسپورٹ وغیرہ تیار ہوتا رہے گا۔“

مراد سمجھا بھما کے اسے وہاں سے لے آیا۔ ایک ہفتہ گزارنا مشکل قتلہ روز نیلیفون کے ذریعے گفتگو نہیں ہو سکتی تھی۔ اتنے اخراجات بھلا کون برداشت کر سکتا تھا لیکن کبھی کبھی گفتگو ہوتی تھی۔ مراد نے سمجھایا۔ ”تم اپنے آپ کو زیادہ مصروف رکھو۔ آل گیٹ میں دکان لگانے کے لیے صرف اتوار کو جالیا کرو۔ باقی تمام دن میرے ہاں رہ کر مٹی کیب چلایا کرو۔“

وہ خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک ہفتہ گزار گیا۔ دیکل صاحب نے مشورہ دیا۔ ”میں نے تمہارے معاملے میں غور کیا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ قانون راستہ روکے تو غیر قانونی راستے اختیار کیے جاتے ہیں۔ تم کوئی ایسا پاکستانی باشندہ تلاش کرو جو تمہارا نام ہو اور جو یہاں کا باقاعدہ شہری ہو۔“

”اس سے کیا ہو گا؟“

”اور کیا ہو گا۔ تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ تمہارا پورا نام کیا ہے؟“

”کارمان مرتضیٰ۔“

”فرض کرو یہاں لندن میں ایک ایسا پاکستانی ہے جس کا نام کارمان مرتضیٰ ہے۔ وہ

یہاں کا قاعدہ شہری ہے۔ وہ تمہاری دانف کو یہاں بلا سکتا ہے۔ اس کے ذریعے تمہاری بیوی کو یہاں رہنے کے حقوق حاصل ہو جائیں گے۔

رضا مراد نے کلمہ ”وکیل صاحب! آپ تو کمائیوں والی باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا کامران مرتضیٰ نامی کوئی شخص یہاں کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر مل بھی گیا تو کیا ضروری ہے کہ وہ قاعدہ شہری ہو اور اگر وہ قاعدہ شہری ہو تو کیا ضروری ہے کہ ہمارے کام آئے؟“

”میں نے کمائیوں والا مشورہ نہیں دیا ہے۔ جو بھی غیر قانونی واقعات پیش آتے ہیں وہ کمائیوں کی طرح دلچسپ بن جاتے ہیں۔ لوگ اسے دلچسپ سمجھیں یا کمائی۔ تمہارا دوسرا سوال یہ ہے، ”کون تمہارے کام آئے گا؟“ یہی تم اس کے دوست ہو۔ تم اس کا ساتھ دے رہے ہو تو یہی اس کے کام آجائے۔“

”جناب! میرا نام رضا مراد ہے۔“

وکیل نے کلمہ ”یہ کس قانون کی کتب میں لکھا ہوا ہے کہ..... رضا مراد اپنا نام تبدیل نہیں کر سکتا؟ میری خدمت حاصل کرو۔ میں عدالتی کارروائی کرتا ہوں۔ تم اپنی طرف سے بیان دو کہ اپنا نام تبدیل کر رہے ہو۔ رضا مراد کی بجائے کامران مرتضیٰ نام اختیار کر رہے ہو۔ آج سے تمہارا کارڈ بار کامران مرتضیٰ کے نام سے جاری رہے گا۔ تم کارڈ باری اور سلعی زندگی میں کامران مرتضیٰ کے نام سے جانے پہچانے جاؤ گے۔ جب میرے ذریعے تمہارا نام قانونی طور پر تبدیل ہو جائے گا تو تمہارا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ از سر نو نئے نام سے تیار ہوں گے۔ تم دونوں اس مسئلے پر مشورہ کر کے مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کرو۔“

رضا مراد نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ ”میں نام تبدیل کروں۔ واہ! کیا میرا دماغ خراب ہو گیا ہے؟“

کامران نے اسے اتجاہز نظروں سے دیکھا۔ رضا مراد نے پوچھا۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا میری دوستی پر شہ کر رہے ہو؟ کامران! میں تمہارے لیے جان بھی دے سکتا ہوں۔ نام بدلنا کون سی بڑی بات ہے لیکن میں جو نام تبدیل کروں گا وہ تمہارے حوالے سے ایک عورت کے لیے ہو گا اور مجھے عورتوں سے سخت نفرت ہے۔“

وکیل نے کلمہ ”سنو! آپ دونوں یہاں بحث نہ کریں۔ مجھے کام کرنے دیں پلیز۔“ وہ وکیل کے جیبر سے باہر آگئے۔ ایک پب میں پہنچ کر رضا مراد نے آؤر دیا۔ ”اسکاچ دوھ ہاٹ دائر۔“

کامران نے کلمہ ”یارا یہ کوئی پینے کا وقت ہے؟“ ”میرے لیے چینی کا بھی وقت نہیں ہے۔ دوستی مجھے آزمائش میں جھلا کر دی ہے۔“

”یہ کون سی بڑی آزمائش ہے؟ نام تبدیل کرنے میں کون سی قحاحت ہے؟“ ”یہ میرے باپ دادا کا رکھا ہوا نام ہے۔ ہر شخص کو سمجھن ہی سے اپنے نام سے جتنی محبت ہوتی ہے۔ شاید کسی اور نام سے اتنی محبت نہیں ہو سکتی۔ کیا تم اپنے پیدائشی نام سے پیچھا چڑا پائندہ کرو گے؟“

”ہم آئف دوسرے پر جان دینے کا دعویٰ کرتے ہیں پھر نام کیسے تبدیل نہیں کر سکتے۔ میں تمہاری خاطر ایسا کر سکتا ہوں۔“

ان کے سامنے اسکاچ کے دو بیگ آگئے۔ کامران پتا نہیں تھا لیکن دستور یہ تھا کہ جب بھی رضا مراد کامران کے ساتھ کسی پب میں جاتا تھا تو کامران کے نام پر ایک بیگ منگواتا تھا اور اس کے نام پر خود ہی بی جاتا تھا۔

اس نے پہلے اپنے نام کا بیگ جلتی سے اتارا۔ پھر خالی جام کو دیکھنے کے بعد دوسرے جام کو اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ تمہارے نام کا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو؟ میں تمہاری خاطر اپنے باپ دادا کا رکھا ہوا نام چھوڑ نہیں سکتا؟ ضرور چھوڑ سکتا ہوں لیکن تم میرے دوست ہو تو میرے دماغ سے سوچو۔ میری آنکھ سے عورت کو دیکھو تو جیس بھی نفرت ہو گی۔ میرے دوست! اس عورت سے شادی کر کے آئے ہو تو اسے وہیں رہنے دو۔ اسے سزا دو۔ تم اسے سزا دو گے تو مجھے دو ملٹی خوشی حاصل ہو گی۔ ذہن پاکستان میں ایک ٹینڈ کو تمہارے ہاتھوں سزا ملتی رہے گی۔ تم میرا انتقام لیتے رہو گے۔“

وہ دوسرا بیگ طلق سے اتارنے لگا۔ کامران اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا مجھے پاگل سمجھتے ہو؟“

”باگل نہیں جھوٹی۔ ایک ٹینہ کی بے وفائی نے تمہیں اس مقام پر پہنچا دیا ہے۔ اگر تمہارا نفسیاتی تجزیہ کروں تو تم ٹینہ سے آج بھی محبت کرتے ہو۔ تمہارے لاشعور میں یہ سوال چھتا ہے اور ٹینہ سے پوچھتا ہے۔ اے عورت! تم نے مجھ سے کیوں بی وفائی کی؟ یہ بات تمہارے لاشعور میں اس لیے نقش ہے کہ تم آج بھی اس سے محبت کرتے ہو۔ چونکہ محبت کرتے ہو اس لیے اتنی شدت سے نفرت کا اظہار کرتے ہو۔“

رضا مراد اس بات پر جھنجھلا کر اٹھ گیا۔ وہ دیکھ کا دل ادا کر کے وہاں سے باہر آ گیا۔ پھر تیزی سے اُدھر جانے لگا جہر انہوں نے مٹی کب کو کھڑا کیا تھا۔ کامران تیزی سے اس کے پیچھے آیا۔ پھر ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ ”ایک انسان ذہنی طور پر پیار ہوتا ہے تو وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔“

”میں نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔“

”پہنچا رہے ہو، اگر نارمل ہوتے، اگر تم ذہانت سے سوچتے تو اس نتیجے پر پہنچتے کہ دنیا میں صرف ایک ٹینہ نہیں ہے۔ دنیا کی ساری عورتوں نے بے وفائی اور دنیا کے تمام مردوں نے وفا شکاری کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے۔ مرد ہو یا عورت، دونوں ہی بے وفا بھی ہو سکتے ہیں اور وفادار بھی۔ تم ایک ٹینہ کی بے وفائی کا انتقام میری موت سے لے رہے ہو۔ اگر تم ذہنی طور پر نارمل ہوتے تو دوست کی حیثیت سے میری محبت کو محبت کی نظر سے دیکھتے۔ نفرت سے یوں کھڑے کی کو شش نہ کرتے۔“

وہ مٹی کب کے پاس آئے۔ رضا مراد دروازہ کھول کر اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھا چاہتا تھا۔ پھر ٹھک گیا۔ دور فٹ پاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے جیرائی سے بولا۔ ”ٹینہ.....“

اس کے منہ سے ٹینہ کا نام سن کر کامران نے اس سمت دیکھا جہر رضا مراد دیکھ رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر دور ایک مشرقی لڑکی نظر آئی۔ وہ جست پاجامہ ادا کرتا پہنے ہوئے تھی۔ کامران نے رضا مراد کے قریب آکر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

رضا مراد نے اس لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ دیکھو، ٹینہ آ رہی ہے۔“

”کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ وہ ٹینہ نہیں ہے۔ دوسری لڑکی ہے۔“

اس وقت تک لڑکی قریب آگئی تھی۔ فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی نگاہوں کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ رضا مراد نے یکبارگی اپنے دل کی جگہ سینے کو ایک ہاتھ سے تھام لیا۔ خرقہ کاٹنے لگا۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ پھر بھی وہ بڑی مشکل سے کہہ رہا تھا۔ ٹی..... میں..... میں مرضیں سکھ عورت کی بے وفائی مجھے نہیں مار سکتی۔“

وہ گرنا ہی چاہتا تھا کہ کامران نے سنبھال لیا۔ ذرا ہی سہارا دے کر اسٹیرنگ سیٹ پر بٹھایا۔ پھر کہا۔ ”میں کسی قریبی ڈاکٹر سے کونسل کر رہا ہوں۔ ابھی آتا ہوں۔“ اس نے کامران کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”کسی سے نہیں، صرف ڈاکٹر جان ہنر سے کونسل کرو۔ میں ٹیلی فون بوتھ ہے، ٹیلی فون کرو۔“

کامران دوڑتا ہوا ایک ٹیلی فون بوتھ میں پہنچا۔ پھر ڈاکٹر ہنر سے رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے ڈاکٹر ہنر کو رضا مراد کے متعلق بتایا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوا ہے۔ میرے پاس لے آؤ، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے ریموور رکھا۔ پھر بوتھ سے باہر نکل کر تیزی سے دوڑتے ہوئے مٹی کب کے پاس آیا۔ اسٹیرنگ سیٹ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر نے تمہیں بتایا ہے اور کہا ہے کہ پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔ تم فوراً ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ اس نے گاڑی اشارت کی پھر اسے تیزی سے ڈرائیو کر ہوا ڈاکٹر کی طرف جانے لگا۔ رضا مراد سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ ابھی اس کے سینے پر دل کی جگہ رکھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے کرب میں مبتلا ہو۔

آدھ گھنٹے بعد وہ ہسپتال کے ایک بستر پر پڑا ہوا تھا اور ڈاکٹر ہنر اس کا معائنہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”پھر تم نئی بیماری لے آئے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح چاروں شائے چٹ لینے رہو اور چھت کو نکتے رہو۔ جیسا میں کہوں، دیا کرتے رہو۔“

اس نے ہدایت پر عمل کیا۔ اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ چھت کی طرف نکتے لگا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”اب تم سانس روک لو اور دس بار کوہ میں حالات سے سمجھو کہ رہا ہوں۔“

نہیں کروں گا۔“

ڈاکٹر نے ایک ذرا توقف کے بعد کہل ”اسے کوئی بیماری نہیں ہوتی۔ یہ بیماری اپنے اوپر پر مسلط کر لیتا ہے۔ جب ٹینڈ شدت سے یاد آتی ہے تو یہ کئی طرح سے سوچتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اگر یہ کاروبار کا مالک ہوتا“ اپنے بھائی کی جگہ خود ہوتا تو ٹینڈ اس کی ہوتی چونکہ وہ بڑے بھائی کا محتاج تھا لہذا اس کی محتاجی نے اسے ٹینڈ سے دور کر دیا۔ وہ ٹینڈ سے بے انتہا نفرت کرنے کے باوجود اس سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ چونکہ اس کی محبت سے نجات حاصل نہیں کر سکتا“ اس لیے زیادہ سے زیادہ نفرت کا اظہار کرتا ہے اور انتقام اپنے آپ کو بیمار بنا لیتا ہے۔“

”یہ بات میں سمجھ گیا لیکن یہ فوراً ہی آپ کے علاج سے کس طرح اچھا ہو جاتا ہے؟“

”نفسیاتی طریقہ کار کے ذریعے پہلے ہم اپنی شخصیت سے متاثر کرتے ہیں۔ میں نے دو برس کے عرصے میں اسے اپنا دلا دوست بنا لیا ہے۔ میں جب بھی اسے کوئی دوا کھانے کے لیے دیتا ہوں تو اس سے پہلے دوا کے کھانے اور اس دوا کے اثر انداز ہونے کے لیے ایک ماحول پیدا کرتا ہوں۔ تم نے دیکھا کہ اسے کئی راتوں سے نیند نہیں آتی تھی۔ خواب آور گولیاں بھی اثر نہیں کرتی تھیں۔ میں نے ایک رات اسے بستر پر سلا یا پھر اس کے آگے ایک شمع روشن کر دی۔ اسے ہدایت دی کہ وہ شمع کی لو کو تکتا رہے اور جو کوسں دہی کھتا رہے۔ وہ میری ہدایت پر عمل کرتا رہا۔ دراصل یہ کچھ نہیں ہے۔ محض نفسیاتی طریقہ کار ہے۔ مریض کے لیے ایک ماحول پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس ماحول کے مطابق میں نے رضا مراد کو ایک ننھی سی خواب آور گولی کھانے کو دی اور اسے نیند آگئی۔ وہ صبح تک آرام سے سوتا رہا۔ تمہیں یہ سن کر تعجب ہو گا کہ وہ خواب آور گولی نہیں کھتی۔“

کامران نے حیرانی سے پوچھا ”پھر وہ کیا چیز تھی؟“

”کچھ نہیں“ بس ایک عام سی گولی تھی۔ اسے کوئی بھی کھالے تو اچھا براری ایکشن نہیں ہوتا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارے سامنے جو گولی میں نے اسے کھانے کے لیے دی

وہ سانس روک کر دس بار کھنے لگا۔ ”میں حالات سے سمجھوتہ کر رہا ہوں۔“

اس کے بعد ڈاکٹر نے کہل ”شماش“ اب گہری گہری سانس لو۔ پھر سانس روکنے کے بعد کہو۔ ایک عورت کی بے وفائی مجھے انتہا مل نہیں کر سکتی۔“

اس نے چند لمحوں تک گہری گہری سانس لیں۔ پھر سانس روک کر کہنے لگا۔

”ایک عورت کی بے وفائی مجھے انتہا مل نہیں کر سکتی۔“

کامران ایک طرف کھڑا ہوا پہلی بار نفسیاتی علاج کا ایسا طریقہ دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنی اسٹنٹ کو ایک دوا لانے کے لیے کہل وہ ایک چھوٹی سی ڈبیہ لے کر آئی جس میں سرخ رنگ کی گولیاں تھیں۔ ڈاکٹر نے اس میں سے ایک گولی رضا مراد کو کھانے کے لیے دی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اسے گل کر پانی پینے لگا۔ ”اب تم آرام سے لیٹ جاؤ۔ ہم تمہیں پانچ منٹ کے لیے تنہا چھوڑتے ہیں۔ تم اس تھالی میں ایک بات اپنے دماغ سے کرتے رہو گے۔ وہ یہ کہ مردشہ زور سے ’شہ زور رہے گا۔ عورت اسے کزور نہیں بنا سکتی۔“

یہ سمجھانے کے بعد ڈاکٹر نے سرخ رنگ کی گولیوں کی وہ ڈبیہ اسے دی اور کہل۔

”جب بھی ایسی کوئی تکلیف ہو تو اس میں سے ایک کھالیا کرنا۔ آرام آ جانا کرے گا۔ ہم پانچ منٹ کے لیے جا رہے ہیں۔ پھر آئیں گے۔“

وہ سب کمرے سے باہر آ گئے۔ کامران نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”مراو کی حالت کب تک یوں رہے گی۔ اچانک کوئی بیماری اسے لاحق ہوتی ہے پھر آپ کے پاس آتے ہی وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔“

ڈاکٹر نے جتنے ہوئے کہل۔ ”میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔ کیا تم اسے اپنے آپ تک محدود رکھو گے؟“

”ہاں ضرور۔ آپ مجھے بتائیے۔ میں اس کے لیے پریشان رہتا ہوں۔“

”تم اسے مت چاہتے ہو۔ کیس ایسا نہ ہو، میرے طریقہ علاج کی حقیقت اسے بتا دو۔ پھر میرے ٹریٹ منٹ کا بھی اس پر اثر نہیں ہو گا۔“

”میں اپنے دوست کی بھائی چاہتا ہوں۔ جس میں اس کا نقصان ہو، ایسی کوئی بات

ہے وہ دماغ کی گولیاں ہیں جسے عام طور پر کوئی بھی کھا سکتا ہے۔

”عجب ہے وہ ایسی بے گلی دواؤں سے فوراً اچھا ہو جاتا ہے۔“

”دراصل ہم جیسے باہر نفسیات اپنے مریضوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہم جو کچھ ہیں جو کرتے ہیں مریض پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ ہم نفسیاتی تجربے اور نفسیاتی علاج کے ذریعے مریض کو اس مقام پر لے آتے ہیں جہاں معمولی اور بے اثر دوائیں اثر کرنے لگتی ہیں۔ جو بات ہم اس کے دماغ میں بٹھاتے ہیں، وہ اسی کے مطابق ان دواؤں سے اثر لیتا ہے اور خود سائنہ بیماریوں سے نجات حاصل کرنے لگتا ہے۔ تم کئی بار دیکھ چکے ہو اسے نیند نہیں آتی تھی۔ ایک معمولی سی بے نام سی گولی کھا کر نیند آنے لگی۔ اسے میس کی شکایت تھی۔ وہ شکایت دور ہو گئی۔ آج اس کے دل میں درد اٹھ رہا تھا۔ میں نے دماغ میں بھڑکی گولی کھانے کو دی اور اب چل کر دیکھ لو۔ وہ پرسکون ہو گا۔“

وہ کمرے کے اندر آئے۔ واقعی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ پرسکون نظر آ رہا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی ہنسنے سے باز نہ آئے۔ ”ڈاکٹر! سو سوری۔ میں بار بار تمہیں زحمت دیتا رہتا ہوں۔“

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ دوست ہی کس کام کا جو دوست کی دی ہوئی زحمت کو خندہ پیشانی سے قبول نہ کرے لیکن مراد تم مجھ سے دوستی نہیں بھارے ہو۔“

”یہ سراسر الزام ہے۔ میں آپ کی ہر بات مانتا ہوں۔“

”مانتے ہو تو پھر شادی کر لو۔ لیرا یا شائندہ دونوں ہی اچھی لڑکیاں ہیں۔ آخر انہیں آزنا لینے میں کیا ہرج ہے؟“

وہ کچھ کھانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ کہنے سے روکتے ہوئے کہا۔ ”چلو ایسا کر شادی نہیں کرتے تو کسی عورت سے دوستی کرو۔ اس کے ساتھ کچھ وقت گزاریو۔ یوں تقریباً بھی ہوگی اور اسے آزنا سے بھی رہو گے۔ اگر وہ عورت ضرورت مند ہوئی تو تم انسانی ہمدردی کے تحت اس کے کام بھی آتے رہو گے۔“

کامران نے کہا۔ ”اس کہنت کو انسان نہ کہو۔ یہ میرے کام نہیں آ رہا ہے۔ میں اپنی ذائقہ کو اس کے ذریعے سنبھالنا چاہتا ہوں لیکن یہ انکار کر رہا ہے۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”یہ تو بڑی غلط بات ہے۔ اگر کامران کی دانتھ تمہارے ذریعے یہاں پہنچ سکتی ہے تو تمہیں ہر طرح تعاون کرنا چاہیے۔“

”آپ مجھے پانچ منٹ کے لیے اس کمرے میں چھوڑ کر گئے تھے۔ میں آپ کی ہدایت کے مطابق کہ رہا تھا۔ حوش زور سے شہ زور رہے گا۔ ایک عورت اسے کمزور نہیں بنا سکتی۔ ایسا کہنے کے دوران مجھے کامران یاد آ رہا تھا۔ اس کی محبت اور اس کی مونا یاد آ رہی تھی۔ اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کی خاطر اپنا نام تبدیل کروں گا اور اس کی محبت اس کو واپس دلاؤں گا۔ جب میں نے یہ فیصلہ کیا تو مجھے بڑا سکون محسوس ہوا۔ میں نے چشمِ قصور سے دیکھا، میں مونا کے کام آ رہا ہوں اور شینہ شرمندہ ہو رہی ہے۔ ندامت سے کہہ رہی ہے۔ مراد! میں نے تمہاری قدر نہیں کی۔ تم اتنے اچھے ہو کہ ایک عورت کی بے وفائی کے باوجود دوسری عورت سے بھرپور تعاون کر رہے ہو اور اسے اس کے محبوب تک پہنچا رہے ہو۔“

کامران نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”کیا واقعی تم نے فیصلہ کر لیا ہے؟ تم میری خاطر اپنا نام تبدیل کرو گے؟ میری مونا کو میرے پاس بلاؤ گے؟“

اس نے کامران کے دونوں شانوں کو مضبوطی سے تھام کر کہا۔ ”میں اپنے ڈاکٹر دوست کی ہدایت کے مطابق خود کو تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ شاید نام تبدیل کرنے سے مجھ میں تبدیلی آ جائے۔ اس طرح تمہارا بھی کام بن جائے۔ ہم ابھی وکیل سے مل کر نام تبدیل کرنے کے سلسلے میں ضروری کارروائیوں کا آغاز کریں گے۔“

آغاز ہو گیا۔

ایک طرف رضا مراد وکیل سے رابطہ قائم کرنے لگا۔

دوسری طرف کامران نے مونا کو تفصیل سے خط لکھا۔ اسے سمجھایا کہ ایک دوست ان کی خاطر کس طرح قربانی دے رہا ہے۔ اپنے پاپے دادا کے رکھے ہوئے پیدا ہونے کی نام سے دستبردار ہو کر اس کی خاطر کامران مرتضیٰ بن رہا ہے۔ لہذا جب وہ یہاں آئے اور کسی طرح کی انکوائری ہو تو وہ رضا مراد کو کامران مرتضیٰ تسلیم کرے۔

خط کے جواب میں فون کے ذریعے گفتگو ہوئی۔ مونا نے کہا۔ ”میں کبھی کسی شخص

کو کامران تسلیم نہیں کر سکتی۔ اسے کامران کہنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ خدا خواست کسی غیر مرد کو اپنا ہمسر رکھ رہی ہوں۔ اللہ ایسا کہنے سے پہلے میری زبان جل جائے۔“

”دیکھو مونہ! ضد نہ کرو۔ بس یہی ایک راستہ ہے۔ میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ رضا مراد کو شوہر تسلیم کرو۔ ایسا کہنے یا کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ پاسپورٹ اور نکاح نامے کی زو سے تم کامران مرتضیٰ کی بیوی ہو۔ یہاں بھی قانون کے لحاظ یہی دیکھیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ تمہارے قرب رضا مراد موجود رہے گا لیکن میں بھی تمہیں یہ کہتا ہوں کہ رضا مراد کو صرف کامران مرتضیٰ کہہ دیتا۔ شوہر نہ کہتا اور ہم ایسا کہنے کا موقع ہی نہیں دیں گے۔“

تھوڑی دیر بعد مونہ کی آپا نے رسیور لے کر کہا۔ ”ہمارا! اس لڑکی کا داغ چل گیا ہے۔ اتنا اچھا موقع ہاتھ سے گنوا جاتی ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں اسے یہاں سے روانہ کر دوں گی۔ یہ تھوڑی دیر کے لیے تمہارے دوست کو کامران مرتضیٰ کہہ دے گی۔ تم وہاں سے کٹھ اور ویرا روانہ کرو۔“

دو ہفتے میں تمام کام مکمل ہو گیا۔ ایک طرف مونہ اور اس کی آپا سے معاملات طے ہو گئے۔ دوسری طرف رضا مراد کا نام قانونی طور پر تبدیل ہو گیا۔ اب اس کے کارڈ کے دروازے پر اور مٹی کب ابجی کے دفتر میں کامران مرتضیٰ کے نام کی تختی لگ گئی تھی۔ اس نئے نام سے اس کا ڈرائیونگ لائسنس اور پاسپورٹ وغیرہ تیار ہو رہے تھے۔ مونہ کے لیے اسی نام کی زوجیت کے اعتبار سے کٹھ اور ویرا روانہ کر دیا گیا تھا۔

وہ میاں بیوی تھے لیکن ایک دوسرے کے ایسے عاشق تھے کہ ایسے میاں بیوی کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ شاید اس لیے کہ میاں کو اب تک بیوی حاصل نہیں ہوئی تھی اور بیوی کو اب تک میاں حاصل نہیں ہوا تھا اور جب تک ایک دوسرے کو حاصل نہ کیا جاسکے اس وقت تک میاں اور بیوی محبوب اور محبوبہ ہی رہتے ہیں۔

پھر ایک دن ٹیلیفون کے ذریعے پتا چلا، مونہ کو کٹھ اور ویرا مل چکا ہے۔ وہ دوسرے دن کی فلاٹ سے آ رہی ہے۔ یہ ایسی خبر تھی کہ کامران نے خوشی سے ایک جج ماری اور رسیور سمیت مراد سے لپٹ گیا۔ اس نے کہا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو۔ میں مراد

ہوں۔ مونہ اور رسیور میں ہے۔ باتیں کرو۔“

پھر باتیں ہونے لگیں۔ ادھر مونہ خوشی سے باتیں کر رہی تھی۔ کھکھلا رہی تھی۔ کامران نے کہا۔ ”ہزاروں میل کی دوری سے تمہاری یہ سنگٹائی ہوئی ہنسی میرے اندر اپجی پیدا کر رہی ہے۔ آج میں خوشی کے مارے سو نہیں سکوں گا۔“

مونہ نے کہا۔ ”تمہیں ضرور سونا چاہیے۔“

”سمجھ گیا۔ آج سونا چاہیے۔“ رات جاگتا ہے۔ اود خدا! انتظار کے کتنے خدا ہوں اور آزمائشوں سے گزرنے کے بعد کل ملن کی رات آئے گی۔“

رضا مراد نے اپنے کلاں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

اس رات کامران سونہ سک۔ ادھر سے ادھر کر نہیں بدلتا رہا۔ کبھی یوں گلتا تھا جیسے نیند میں ہو، کبھی یوں جیسے پینا دیکھ رہا ہو اور کبھی پتا چلتا تھا کہ سو رہا ہو نہ جاگ رہا ہو نہ پینا دیکھ رہا ہو۔ بس سوچ کی وادیاں میں گم ہو۔ جیسے وہ رات کی چھاؤں میں نہیں مونہ کی سیاہ زلفوں میں چھپا ہوا ہو۔

صبح پانچ بجے اچانک ہی فون کی تھنپی بجنے لگی۔ وہ دوڑتا ہوا رضا مراد کے کمرے میں گیا۔ مراد رسیور اٹھا کر بات کر رہا تھا۔ اس نے کہا ”یقیناً مونہ نے فون کیا ہو گا۔ پانچ بج رہے ہیں۔ پاکستان میں دس بج رہے ہوں گے۔ وہ روانہ ہو رہی ہو گی۔ اس سے پہلے مجھے فون کر رہی ہے۔ مجھے رسیور دو۔“

رضا مراد نے ہاتھ میں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”تمہارا فون نہیں ہے۔“

وہ دوسری طرف کی باتیں سننے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ ”اچھی بات ہے۔ ماما! آپ انتظار کریں۔ گاڑی آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔“

اس نے رسیور رکھ کر کہا۔ ”کاش! مونہ کی فلاٹ یہاں ایک بجے کے بعد پہنچے گی۔ تم وقت نہیں گزار سکو گے۔ لٹرا خود کو مصروف رکھو۔ ابھی گاڑی لے کر ریسٹ اسٹریٹ چلے جاؤ۔ وہاں ہوٹل سے فیئر کے کمرہ نمبر دو سو بیس میں اٹلی کی ایک فلمی اداکارہ ٹھہری ہوئی ہے۔ اس نے ہماری گاڑی چھ مٹھے کے لیے انویٹ کی ہے۔ تم چھ مٹھے آسانی سے گزار لو گے۔ مناسب آمدنی بھی ہو جائے گی لٹرا فوراً نہ ہاتھ دھو کر لباس تبدیل کرو۔ آدی بنو

اور گاڑی لے کر یہاں سے نکل جائے۔

وہ دوست بھی تھا، پاس بھی تھا، کاروباری بھی تھا۔ یہ وقت گزارنے کا مشغلہ بھی تھا۔ دوستانہ مشورہ نہایت ہی معقول تھا۔ اس طرح چھ گھنٹے آسانی سے گزر جاتے اور آمدنی بھی ہو جاتی۔ اس نے پندرہ منٹ کے اندر ہی منہ ہاتھ دھو کر لباس تبدیل کیا۔ پھر جانے لگا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے براد نے کہا۔ "کاروبار کی طرف بھی دھیان دو۔ جس کے پاس جا رہے ہو، وہ ایک قلمی اداکار ہے۔ مہ روزانہ کلاتی ہے۔ اگر وہ چھ گھنٹے کے بعد ساتویں گھنٹے بھی گنج رکھنا چاہے تو انکار نہ کرنا۔ مونا آٹھ گھنٹے سے پہلے نہیں پہنچے گی۔" ~~پھر وہ دوپہر سے سیدھے ایئرپورٹ چلے آئے~~ میں وہیں انتظار کروں گا۔

کامران نے ایئر ٹک سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم کاروبار کی فکر نہ کرو۔ میں تمہارے کسی بھی کسٹمر کو ہارنا نہیں کروں گا لیکن میری غیر موجودگی میں مونا کا فون آیا

تعمار دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مونا اس وقت طیارے میں سفر کر رہی ہو گی۔ فون کے ذریعے تو نہیں ہاں خیالوں میں جھیں دیکھ رہی ہو گی۔ تم بھی اسے دیکھتے چلے جاؤ۔" وہ چلا گیا۔ راضی مراد وہیں کھڑا ہوا اسے جاتے دیکھا کہ وہ سوچتا رہ گیا محبت اسے کہتے ہیں۔ کیا کامران میرے مقابلے میں زیادہ خوش نصیب ہے۔ اسے پیار کرنے والی عورت ملی جو اپنے رشتے داروں کو اپنے بچپن کے ماحول کو اپنے ملک کو چھوڑ کر اس کی محبت میں سات سمندر پار چلی آ رہی ہے۔ کیا داد میری محبت کرنا جانتی ہے؟

اس کے دماغ میں الجھن سی ہوئی تھی۔ یوں لگا "شینہ آمد می بن کر چلی آ رہی ہے۔ اس نے فوراً ہی خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ تیزی سے چلا ہوا کالج کے اندر آیا۔ پھر ہاتھ روم میں پہنچ کر شاور کو کھول کر اس کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ غسل کرنے کے بعد اس نے ناشتا کیا۔ اس دوران اس کے دماغ کے دروازے پر دیکھیں ہوئی رہیں۔ شینہ آنا چاہتی تھی، وہ دروازہ کھولنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مونا کی فلاحیت کے وقت تک خود کو کاروباری معاملات میں مصروف رکھنے کی کوشش کی۔ چھ گھنٹے کے بعد اس نے گھڑی دیکھی۔ ساتواں گھنٹہ گزر رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کامران ساتویں گھنٹے کے لیے بھی گنج رکھا گیا

ہے۔

فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسور اٹھایا۔ اس کی مٹی کب ابجی کا ایک ملازم کہہ رہا تھا۔ "سرا ہماری گاڑی کا ایکسپرنٹ ہو گیا ہے۔ کامران صاحب ڈنمارک مل کے کنگس کالج ہسپتال میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ فوراً وہیں پہنچیں۔"

"کیا اسے سخت چوٹیں آئی ہیں؟"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ ہسپتال سے ہماری ابجی کے نمبر پر اطلاع دی گئی۔ میں آپ کو اطلاع دے رہا ہوں۔"

اس نے ریسور رکھ کر گھڑی دیکھی۔ ڈیڑھ گھنٹے کے اندر ایئرپورٹ پہنچنا ضروری تھا۔ اس سے پہلے ہسپتال جانا اور کامران کے حالات معلوم کرنا ضروری تھا۔ اس نے اپنی گاڑی کی چابی لی۔ کامران کے سوٹ کیس کو کھول کر اس اہم کو دیکھنا چاہا جس میں مونا کی تصویریں تھیں لیکن سوٹ کیس مقفل تھا۔ کامران کے دوسرے سامان میں اور اس اتارے ہوئے لباس میں چابی نہیں ملی۔ ایک بار کامران نے اسے اہم دیکھنے کے لیے کہا تھا مگر اس نے اہم کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور اب مونا کی تصویر کی ضرورت تھی۔ اس کے بغیر وہ اپنے دوست کی دہن کو نہیں پہچان سکتا تھا۔

وقت ضائع کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے کالج کو لاک کیا۔ اپنی گاڑی میں بیٹھا۔ پھر تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا ہسپتال پہنچا۔ پتا چلا وہ جنرل وارڈ میں زخموں سے پچھڑ ہے۔ ڈریسنگ وغیرہ ہو چکی ہے۔ اب دوا کے اثر سے سو رہا ہے۔ اس وقت اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس نے فون کے ذریعے ڈاکٹر جان بنکر کامران کے متعلق بتایا۔ پھر کہا۔ "تم یہاں کے ڈاکٹروں سے معلوم کرو" یہ کب تک بیدار ہو گا۔ اگر تھوڑی دیر بعد آنکھ کھلے گی تو یہ زخموں کی پردا کیے بغیر ایئرپورٹ جانا چاہے گا۔ کسی روک ٹوک کو خاطر میں نہیں لائے گا۔ تم ڈاکٹروں کے ذریعے اسے یقین دلا سکتے ہو کہ میں مونا کو لے کر سیدھا ہسپتال آؤں گا۔"

ڈاکٹر بنتر سے بات طے کر کے جب وہ ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہوا تو طیارے کی آمد کا وقت ہو چکا تھا۔ شاید وہ اچکا ہو گا۔ مونا پہلی بار آ رہی تھی، اس کے استقبال کے

لے کوئی اہانہ ہوتا تو پریشان ہو جاتی۔ خاص طور پر اینگریشن والے اسے پریشان کر سکتے تھے۔ بہر حال وہ اینٹروپورٹ پہنچا تو ظیادہ دن دسے پر اتر رہا تھا۔ اس نے گاڑی کو پارکنگ ایریا میں چھوڑا۔ تیزی سے چلا ہوا عمارت کے اندر آیا۔ وہاں سے گریڈز لابی میں پہنچا۔ پھر ریٹنگ کے ساتھ کھڑا رہ کر آنے والے مسافروں کو دیکھنے لگا۔ ابھی زیادہ مسافر نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا، 'مونا کو کیسے پہچانے گا۔ اس فلائٹ سے پاکستانی مرد، عورتیں اور بچے زیادہ آئے تھے۔ ایسی پاکستانی لڑکیاں نظر آ رہی تھیں جن کے تعلق یہ فیصلہ کر دشوار تھا کہ وہ شادی شدہ ہیں؟ کنواری ہیں؟ یا بیٹی بیچتا ہیں؟'

پھر یکبارگی اس کے ذہن کو جھکا سالگ۔ مسافروں کی بھیڑ میں ٹھینہ نظر آ رہی تھی۔ اس لابی کی طرف چلی آ رہی تھی۔ آتے آتے کبھی کسی مسافر کی آؤں میں چھپ جاتی تھی، کبھی جھپکنے لگتی تھی۔ اس کا وجود ہر عام کہہ رہا تھا۔ 'تم نفرت کرتے رہو' میں آنکھ پھولی جاتی رہوں گی، آتی رہوں گی۔"

رضا مراد نے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھا۔ پتا چلا، ٹھینہ نہیں ہے کوئی اور ہی بے انتہا کی حسین لڑکی ہے، جو ٹھینہ کی طرح جھپکتی ہے اور اپنے حسن کا سکہ بھی بھرتی ہے اور وہ حسن کا سکہ جھانسنے والی مونا تھی۔

مونا اگرچہ ٹھینہ سے مشابہت نہیں رکھتی تھی۔ دونوں کے چہروں اور ناک نشتوں میں واضح فرق تھا۔ آنکھ لڑکیاں قد، جسامت اور رنگ روپ میں ایک جیسی ہوتی ہیں لیکن ٹھینہ سے ایک مماثلت تھی۔ مونا اس کی طرح ساری ہنسنے ہوئے تھی۔ ساری ہنسنے کے انداز میں ایسی دلکشی تھی، جیسے وہ مومیں مادی ہوئی نہ ہو۔ اس کی لہریں کرن کرن چمک رہی ہوں اور وہ لہر لہر بہتی چلی آ رہی ہو۔

وہ گریڈز لابی میں آگئی تھی۔ کبھی آس پاس کبھی دور دور تک ملاحظا نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کوئی اپنا نظر نہیں آ رہا تھا۔ رضا مراد کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ دماغ کستا تھا، وہ ٹھینہ نہیں ہے۔ دل تھا، ٹھینہ دوسرے روپ میں آ رہی ہے۔ دیے وہ کوئی بھی ہو آخر ٹھینہ کی ذات تو ہے، عورت تو ہے اور عورت وہ بلا ہے۔ جس سے شدید نفرت کرتے رہنے کے باوجود غیر شعوری طور پر محبت کرتے رہنے کا انکشاف ہوتا ہے۔

اس کے دماغ میں آمدنیاں سی چلنے لگیں۔ وہ سوچ رہا تھا، 'مونا کہ یہ حسن مجسم ٹھینہ نہیں ہے لیکن میں رضا مراد کب ہوں؟'

اور اگر یہ مونا ہے تو میں کامران مرتضیٰ ہوں۔

مونا بڑی بڑی کنوڑہ سی سیاہ آنکھوں سے ادھر ادھر پریشان ہو کر دیکھ رہی تھی۔ کامران کو تلاش کر رہی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے ایک ہنسی جھلک کا راستہ بھول کر شہروں میں آ پھنسی ہو۔ اب کھلی دعوے ہے، کوئی بھی شکاری آگے بڑھ کر شکار کر لے۔

اس کی صورت، اس کا سرایا، اس کی سنجیدگی، اس کی دل آویز شخصیت اور رعب حسن ایسا تھا کہ نظریں اس پر سے ہٹا نہیں جاسکتی تھیں۔ رضا مراد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ 'ٹھینہ کیا ہے؟ لیرا کیا ہے؟ شہانہ کیا ہے؟ ان تینوں کے حسن کا کاک ٹیل بنایا جائے تب جا کے مونا کے نام کے جام گھرانے جاسکتے ہیں۔'

وہ غزالی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ 'یہ قیامت کی نظر کسے ڈھونڈ رہی ہے؟'

جواب ملا۔ "مجھے ڈھونڈ رہی ہے۔ کیونکہ میں کامران مرتضیٰ ہوں۔"

جو کامران مرتضیٰ ہسپتال میں پڑا ہوا ہے، وہ پاکستان میں مونا کا شوہر تھا۔ وہ شوہر برطانیہ میں غیر قانونی ہے۔

میں قانونی شوہر ہوں۔ کیونکہ یہ میری برطانوی شہریت کے ذریعے آئی ہے۔ میرے لیے آئی ہے، ہاں میرے لیے آئی ہے۔"

اچانک اس کے دل میں درد ہونے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ سے دل کی جگہ سینے کو بکڑ لیا۔ وہ قرقر کر رہا تھا۔ دوسرا ہاتھ جیب میں ڈال کر چھوٹی سی ڈیبے نکال رہا تھا۔ پھر اس نے ڈیبے سے سرخ رنگ کی گولی نکالی اور اسے منہ میں رکھ لیا۔

ہوتا ہے، ایسا ہوتا ہے، کوئی ارادہ بدلتا ہے، کوئی فطرت بدلتا ہے، کوئی نظر بدلتا ہے، ابھی وہ تیار بدل رہا تھا۔

مونا کی تلاش نظریں بھٹکتے رہنے کے بعد رضا مراد پر ٹھہر گئیں۔ مراد کا نامراو دل دھک سے رہ گیا۔ ابھی ابھی اس نے دل کو آرام پہنچانے کے لیے ایک گولی

”میں آگے بیٹھ کر گاڑی چلاؤں گا اور تم پیچھے بیٹھو گی تاکہ لوگ مجھے تمہارا شوہر! تمہارا ملازم سمجھیں۔“

”لوگ یہ بھی تو سمجھ سکتے ہیں کہ میں ملازم ہوں، اپنے مالک کی کار میں پیچھے بیٹھ کر جارہی ہوں۔“

”ہم لوگوں کو یہ کیوں سمجھنے دیں؟ ساتھ بیٹھنے میں ہرج کیا ہے؟“

وہ بکھٹ اداس ہو گئی۔ بڑے دکھ سے بولی۔ ”جس کے ساتھ مجھے بیٹھنا چاہیے، تقدیر جانتے کیوں اس سے دور کرتی جارہی ہے ہماری شادی ہوئی تب بھی ہم ساتھ نہیں رہ سکے۔ میں اتنی دور چلی آئی، اب بھی ان سے دوری ہے۔“

”مونا! میں تمہارے دکھ کو سمجھتا ہوں۔ یہ تقدیر اور تقدیر کی جنگ ہے۔ تم دونوں مل بیٹھنے کی تدبیر کرتے ہو۔ تقدیر اپنی ستم طرینی سے باز نہیں آئی۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ تم کسی اور کے ساتھ نہ بیٹھو۔“

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ رضا مراد نے ہاتھ اٹھا کر کہہ دیا۔ ”ایک بات اچھی طرح یاد رکھو۔ میں صرف تمہارا کامران ہی تمہارے لیے سب کچھ نہیں ہے۔ میں کامران کا بہت گہرا، بات پیارا دوست ہوں۔ اس رشتے سے تم بھی مجھے پیاری ہو۔“

مونا نے چونک کر سر اٹھاتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”میرا مطلب ہے مجھے بہت عزیز ہو۔ یہ مانا کہ تمہاری نظروں میں کامران سب کچھ ہے لیکن میں زندگی گزارنے کے لیے میرے سارے کی بیوش ضرورت بڑے گی۔ اگر تم مجھ سے تعاون نہیں کرو گی تو خواہ مخواہ پریشانیوں کا سامنا کرنی پڑے گی اور میں تمہیں پریشان نہیں دیکھنا چاہتا۔ پلیز! بیٹھ جاؤ۔“

وہ بیٹھ گئی۔ اس نے دروازے کو بند کیا۔ پھر دوسری طرف سے محووم کرائیئر تک سیٹ سنبھال لی۔ گاڑی اشارت کر کے آگے بڑھانے لگا۔ مونا سوچ رہی تھی۔ رضا مراد درست کہہ رہا ہے۔ اتنی بڑی دنیا میں صرف شوہر پر مجروسہ نہیں کیا جاتا ہے دوسرے رشتے داروں اور شوہر کے دوست انجاب پر بھی مجروسہ کرنا پڑتا ہے۔ پھر یہ پایا دلس ہے۔ میں مراد کے حوالے سے آئی ہوں۔ لہذا اس پر کسی نہ کسی حد تک اعتماد کرنا ہی ہو

گ۔

مراد نے کہہ۔ ”معلوم ہوتا ہے میرے دوست نے میرے متعلق کچھ زیادہ نہیں بتایا ہے۔ اگر وہ مکمل تعارف کرادیتا تو تم یہاں آتے ہی آنکھیں بند کر کے مجھ پر اعتماد کرنے لگتیں۔“

”میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی، جس سے بے اعتمادی ظاہر ہو، اگر ساتھ بیٹھنے سے انکار کیا ہے تو یہ بے اعتمادی نہیں بلکہ عورت کا مزاج ہے۔ خصوصاً مشرقی عورتوں کا مزاج ہے جو فاصلہ رکھنے کی عادی ہوتی ہیں۔“

وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ کیا عورت ہے۔ دیکھا ہوں تو پھول ہے، سمجھتا ہوں تو پتھر ہے۔ اصل میں عورت کو بڑی سہولت سے موم کرنا پڑتا ہے۔ میں مونا کو دیکھتے ہی کچھ زیادہ جلد باز ہو گیا ہوں۔ مجھے بڑے قفل سے کام لینا چاہیے۔ اگر میں اس کے مزاج کو اور اس کی اہم ضروریات کو سمجھ لوں تو اسے اپنی طرف مائل کرنا آسان ہو جائے گا اور ضروریات کو سمجھنا یہ کیا ہے۔ یہ پردیس میں آکر صرف کامران پر اعتماد کر رہی ہے۔ اگر کامران نہ ہو تو کس پر اعتماد کرے گی؟ اگر کامران مجبور ہو جائے، محتاج ہو جائے اور اسے سارا دینے کے قابل نہ رہے تو یہ کس کا سارا ڈھونڈے گی۔ کیوں کہ میرے ہی حوالے سے یہ یہاں آئی ہے۔ میرے بغیر پردیس میں یہ ایک قدم نہیں چل سکے گی۔ میری مرضی کے بغیر کسی کی انگلی بھی نہیں تھام سکے گی۔

وہ ہسپتال پہنچ گئے۔ کامران خواب آور دوا کے زیر اثر نہیں تھا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ ڈاکٹر جان ہنر، اس کے پاس بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”اگر میں نہ آتا تو تم ایک سپاہی کی طرح اتنے سارے زخم جتانے بیوی سے ملنے چلے جاتے۔“

”ڈاکٹر! پلیز مجھے جانے دیجئے۔ مونا آگئی ہو گی۔“

”میں کہہ چکا ہوں، مراد اسے لینے گیا ہے، آئی ہی ہو گ۔ تمہاری دیوانگی دیکھ کر سوچ رہا ہوں، کاش مراد میں بھی ایسی دیوانگی کسی کے لیے پیدا ہو جاتی تو وہ ذہنی مریض نہ رہتا۔ بالکل نارمل ہو جاتا۔“

کامران بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک بار نظر اٹھاتے ہی اس کے

”تم ایسا بات کہہ رہے ہو جو دوستوں کے اعتماد کو ختم کر رہی ہے۔“
”میں اپنے دوست کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت فروغ دل ہے۔ اسے یہ معلوم ہو جائے کہ مونا میری دوا ہے تو ہو سکتا ہے وہ اس سے دستبردار ہو جائے۔“
”اگر تمہیں یہ اعتماد ہے تو جاؤ اور کامران سے بات کر لو۔“

”حوصلہ نہیں ہو رہا ہے۔ تم ڈاکٹر ہو۔ ایک ڈاکٹر کی زبان سے اسے سمجھا سکتے ہو کہ مونا میری زندگی کے لیے کتنی اہم ہے۔ اگر وہ مونا کو چھوڑ دے گا تو اس کا کچھ نہیں بچے گا۔ میں اس کا بڑے سے بڑا مطالبہ پورا کروں گا۔ دو سنی ایسے ہی وقت اسحاق لیتی ہے۔ میں اس کے کام آؤں گا۔ ہر طرح کام آؤں گا۔ وہ میرے کام آ جائے۔“
”مسٹر مراد! مونا کو تم نے ابھی دیکھا ہے۔“

اس نے کلمہ ”تعلیق کلائی کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ میرا نام مراد نہیں کامران مرتضیٰ ہے۔“

ڈاکٹر نے اسے تشویش بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر کلمہ ”تم ہمارے لیے مراد ہو۔ تم نے ایک دوست کی خاطر اپنا نام تبدیل کیا ہے۔“

”جب میں دوست کی خاطر سب کچھ کر سکتا ہوں تو کیا وہ میری خاطر یہ نہیں کر سکتا؟“

”تم مجرد عقل سے کام لو۔ میں یہ کہنے جا رہا تھا کہ ابھی مونا آئی ہے۔ پہلی بار تم نے دیکھا ہے۔ پہلے اپنے آپ کو پرکھنے کی کوشش کرو۔ یہ عقل جذباتی معاملہ تو نہیں ہے۔ جذباتی نہ ہو مگر لگاؤ ہو جائے تب بھی مشورہ دوں گا کہ اسے ذہن سے نکالنے کی کوشش کرتے رہو۔ یہ ابھی بات نہیں ہے کل مجھ سے ملاقات کرو۔ میں تمہیں.....“

اس نے پھر بات کاٹ کر کلمہ ”ڈاکٹر! کل بہت دور ہے۔ میں آج کا دن کیسے گزاروں گا۔ رات مجھے نیند نہیں آئے گی۔ مجھے وہ خواب آؤں گویاں دوں کہ میں کھا کر سو سکوں۔“

”میں ابھی اسی ہسپتال سے ایک گولی لا کر دے دوں گا۔“

”ایک سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے کم از کم تین چار گولیاں چاہئیں۔“

”کیا خودکشی کا ارادہ ہے؟“

”میں کم از کم دو کھانوں کا تاکہ کمری نیند آ سکے۔“

”میں ایک ہی گولی دیتا ہوں اور تم نے بار بار آزمایا ہے، ایک سے ہی تمہیں کمری نیند آ جاتی ہے۔“

”آج نہیں آئے گی۔ آج جاگتا رہوں گا۔ تب بھی وہ نگاہوں کے سامنے ہو گی۔ سو تاروں کا گتہ بھی خواب میں آئے گی۔“

ڈاکٹر نے ایک کمری سانس لے کر کلمہ ”تمہارا کس پھر گز رہا ہے۔ میں سمجھ رہا تھا“ غافل ہو رہے ہو۔ کسی لڑکی کو پسند کرنے کی وجہ سے اس کے بعد تمہیں میرے علاج کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہر حال انتظار کرو۔ میں تمہارے لیے دوا لے کر آتا ہوں۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ رضا مراد چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ پھر وہ بیٹھا نہ رہ سکا۔ ڈیننگ روم سے نکل کر اس جنرل وارڈ کے دروازے پر پہنچا جہاں ایک بستریہ کامران پڑا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک مونا کے ہاتھوں میں تھا۔ میاں بیوی کا انداز بنا ہی مجھو پنا۔ تھا۔ مراد کا دل سینے میں اچھل اچھل کر پوچھ رہا تھا۔ ”کیا یہ انداز میرے لیے نہیں ہو سکتا؟“

پہلے کامران کا ہاتھ مونا کے ہاتھوں میں تھا۔ پھر کامران نے بڑی محبت سے مونا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ وہ سر جھکا کر شرمائے لگی۔ زیر لب مسکرائے لگی۔ پتا نہیں صرف ایک ہاتھ اپنے محبوب کے ہاتھوں میں آئے ہی کیا ہو گیا تھا حالانکہ کس پہلے بھی جاری تھا مگر اب کچھ اور بات تھی۔ وہ حیا سے سرخی مائل ہو رہی تھی۔ چہرے پر ہلاکی رونق آگئی تھی جیسے کامران کے ہاتھ نہ ہوں“ الاؤ ہوں۔ جو اسے سہا رہے ہوں۔ اسے روشن کر رہے ہوں۔

ایک جذبہ جو کسی کے لیے محبت کا سبب بنتا ہے، وہ کسی کے لیے نفرت کا باعث بن جاتا ہے۔ وہ دانت پر دانت جھامتے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ دیکھتا نہیں چاہتا تھا مگر دیکھ رہا تھا۔ آدی آگ سے پچتا چاہتا ہے مگر آگ تپتا بھی چاہتا ہے۔ وہ کشش میں تھا۔ پھر اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہاں سے جانے لگا۔ اسی وقت کامران کی نظر اس پر پڑی۔ اس

نے آواز دی۔ ”مراد“

وہ رک گیا۔ راستہ گم کرنے والا یہی چاہتا ہے، کوئی پیچھے سے آواز دے۔ اس کا ہاتھ پکڑے۔ اسے بتائے۔ راستہ ادھر نہیں ادھر ہے ہماری طرف آؤ۔
وہ ڈک گیا تھا مگر پلٹ کر دیکھ نہیں رہا تھا کہ کارن نے آہستگی سے کہا۔ ”مونا اسے بلاؤ۔ شاید تمہاری وجہ سے بھجک رہا ہے۔“

اس نے سربراہ اٹھ رکھتے ہوئے آواز دی۔ ”مراد صاحب!“ وہ خوش ہو گیا۔ جذبہ حلق سلامت تھا۔ وہ پکار رہی تھی جیسے بچتا رہی ہو۔ کہ رہی ہو۔ ”صاحب! آپ تو تابق ناراض ہو کر جا رہے ہیں۔ لیجئے ٹپ کے پاس آئیں۔“

وہ اس کے قریب آگئی تھی۔ وہ بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ مونا نے پوچھا۔ ”تیس یقین نہیں آتا؟ نو میرا ہاتھ تھام لو۔ یہ کارن کے لیے نہیں، تمہارے لیے ہے۔“

اس نے آہستگی سے ہاتھ بڑھایا۔ اس کی تھیلی جھیلی ہوئی تھی۔ اس میں کانڈ کا ایک ننھا سا بیگٹ آگیا۔ ڈاکٹر ہنر نے کہا۔ ”یہ خواب آور گولیاں ہیں۔ انہیں رکھ لو۔“

وہ خیالات سے چونک گیا۔ مونا دور اپنے کارن کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ڈاکٹر کھڑا ہوا تھا۔ کارن اپنے بستر سے آواز دے رہا تھا۔ ”بھئی تم دونوں وہاں کھڑے ہو، یہاں آ جاؤ۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں اپنے مریضوں کے پاس جا رہا ہوں۔ تم وڑی دیر بعد آؤں گا۔“
وہ چلا گیا۔ مونا نے کہا۔ ”مراد صاحب! آئیے۔“

وہ کھنچا ہوا چلا آیا۔ کارن نے پوچھا۔ ”تم ہم سے دور کیوں ہو؟ کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟“

”میں سوچ رہا ہوں۔ تمہاری مونا کے آنے سے بڑی پریشانوں میں اور مصیبتوں میں پھنس جاؤں گا۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“

”درست کہہ رہا ہوں۔ یہ اب تک کئی بار مجھے مراد کے نام سے مخاطب کر چکی ہیں جبکہ میں مراد نہیں رہا۔“

کارن نے کہا۔ ”مونا! یہ بات واقعی غلط ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”انتہائی غلط ہے۔ فرض کرو میں کسی کے ساتھ بیٹھا کارن مرتضیٰ کی بیٹ سے برنس ڈیل کر رہا ہوں ایسے میں مونا مجھے مراد کے نام سے مخاطب کرے تو مجھ سے ڈیٹک کرنے والا میں بن جاتا ہوں گا۔“

”میں ایسی غلطی نہیں کروں گی۔“

”تم ایسا جان بوجھ کر نہیں کرو گی۔ مجھے کارن نہیں سمجھو گی، مراد سمجھو گی تو یہ اختیار کسی محفل میں میرا نام لے سکتی ہو۔ میں دوستوں میں، اپنی محفل میں، اپنے کاروبار میں، اپنی سوسائٹی میں لوگوں سے کیا کہوں؟ میرا کیا نام ہے؟ جو نام تھا وہ ایک دوست نے چھین لیا اور جو نام مجھے ملا ہے، اسے دوست کی بیوی تسلیم نہیں کرتی۔“

”مراد صاحب! آپ مجھے ایک بار آنا کر دیکھ لیں۔ میں اچھی یادداشت رکھتی ہوں۔ کبھی کسی کے سامنے آپ کو مخاطب نہیں کروں گی۔ آپ کو مخاطب کرنے کا موقع آنے ہی نہیں دوں گی۔“

”مونا! ایسا کرو، تم میرے دوست کو کارن نہیں کہہ سکتی تو مراد بھی نہ کہو۔ کسی اور طرح سے مخاطب کر لو۔“
”اور طرح سے؟“

”ہاں، میں تمہارا کارن مرتضیٰ ہوں تو مراد کو کالی کہہ کر مخاطب کرو۔“
”یہ بھی تمہارے نام کا حصہ ہے۔ میرا بس چلے تو میں دنیا کے کسی بھی شخص کو یہ نام نہ رکھنے دوں۔“

مراد نے طنز سے لہجے میں کہا۔ ”یہ بات تمہارے بس میں تھی۔ اس کے باوجود تم نے پاکستان میں رہ کر میرا نام کارن مرتضیٰ تسلیم کیا۔ تسلیم نہ کرتیں تو یہاں نہ پہنچتیں۔“
”آپ کا نام میں نے نہیں بدلا۔ یہ آپ دوستوں کی ملی بھگت سے ہوا ہے۔“

کارن نے کہا۔ ”بھئی تم دونوں کسی اور بحث میں الجھ گئے ہو۔ مسئلہ یہ ہے کہ مونا تمہیں کس طرح مخاطب کرے۔“

”میں کہہ چکی ہوں۔ انہیں مخاطب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“

مراد نے پوچھا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اشاروں سے گونگوں کی طرح مجھے مخاطب کیا کرو گی؟“

وہ پریشان ہو گئی۔ کسی اور طرح سے کیسے مخاطب کر سکتی ہے اکثر عورتیں اپنے شوہروں کے نام لیتی ہیں۔ بعض نہیں لیتیں۔ اگرچہ ممانعت نہیں ہے۔ وہ اپنے جیون ساتھی کو دل دے دیتی ہیں۔ اپنے وجود کی تمام کائنات سونپ دیتی ہیں۔ اس پر کائنات کے تمام بھید کھول دیتی ہیں۔ اس کے بلجود شرابی ہیں۔

وہ اپنے اوپر شرم طاری نہیں کرتیں۔ یہ عورت کا بے اختیاری جذبہ ہوتا ہے۔ اس کی ذات شرم و حیا کی سدا ببار کھیتی ہے۔ کوئی حیا کی فصل کاتتا ہے لیکن کھیتی خالی نہیں ہوتی۔ کسی دوسرے پہلو سے حیا کی نئی فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ وہ پھر فصل کاتتا ہے۔ پھر کسی نئے پہلو سے فصل تیار ہو جاتی ہے۔ مرد آج تک جسے کات نہ سکا وہ عورت کی حیا ہے۔

وہ حیا کی مادی اپنے کامران کو بھی بعض اوقات کامران یا کالی کہتے ہوئے شرابی تھی۔ ایسے ہی وقت عورت اپنے شوہر کو کسی اور طرح سے مخاطب کرتی ہے۔ مثلاً کچھ کہتا ہو تو کہتی ہے۔ بٹنے۔ کچھ دکھانا ہو تو کہتی ہے دیکھیے۔ اگر رازداری سے مخاطب کرنا ہو تو ہولے سے کھٹکار دیتی ہیں۔ کبھی خاموش نظروں سے یوں پکارتی ہیں جیسے کوہِ خدا سے جلاد آ رہا ہو۔ اکثر زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کبھی ادا میں زبان بن جاتی ہیں اور کبھی وہ انہل کو حرکت دے کر متوجہ کر لیتی ہیں۔

اور طرح سے مخاطب کرنے کے کئی انداز ہیں۔ کتنی ہی ادا میں ہیں۔ کتنی ہی زبانیں ہیں۔ کتنے ہی اشارے اور کتنا ہے لیکن یہ سب کے سب اپنے شوہر کے لیے ہوتے ہیں۔ شوہر کے دوست کے لیے نہیں ہوتے۔ اس لیے وہ مراد کو مرادی کہہ سکتی تھی۔ کسی اور طرح مخاطب نہیں کر سکتی تھی۔ اور طرح کا حق دار صرف کامران تھا۔

کامران نے پوچھا۔ ”تم کیا سوچنے لگیں؟“

”سوچ رہی ہوں“ انسانی تہذیب نے ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کے لیے مقدس رشتوں کو بچان دی ہے۔ میں کسی کو باپ اور کسی کو بھائی کہہ سکتی ہوں لیکن جب

میں مذہب اصولوں کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بالآخر بچھٹنا پڑتا ہے۔ ابھی آثارِ تار رہے ہیں کہ آئندہ چل کر ہمیں بت بچھٹنا ہو گا۔ کامران مرتضیٰ میرے مجازی خدا کا نام ہے مگر میں ایک ایسے کامران مرتضیٰ کے حوالے سے آتی ہوں جس سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں اس کامران مرتضیٰ کو جیون ساتھی نہیں کہہ سکتی۔ اس سے پہلے مر جانا پسند کروں گی اور میں اس کامران مرتضیٰ کو بھائی نہیں کہہ سکتی۔ اس لیے کہ بیوی بن کر آئی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ روئے لگی۔ آنکھ میں منہ چمپا کر اپنے آنسوؤں کو چھپانے لگی۔ چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر کامران نے کلمہ۔ ”بلیئر، مونٹا آنسو پوچھ لو۔ چپ ہو جاؤ۔ جو ہو گیا ہے اسے نہا ہوا ہو گا۔“

مراد نے کلمہ۔ ”مونٹا تم نے رانی کا بہت بنا لیا ہے۔ یہ ایسی بات نہیں ہے کہ اس کا حل تلاش نہ کیا جاسکے۔ تم کسی طرح بھی مجھے مخاطب نہیں کرو گی“ چلو کی سی۔ رونے یا بچھٹانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ آنسو پوچھ لو۔ یہ ہچٹال کا جھڑل وارڈ ہے۔ آنے جانے والے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے اور اب تو ملاقات کا وقت بھی ختم ہو رہا ہے۔“

کامران نے کلمہ۔ ”تم یہاں آتے ہی رونے لگو گی تو مجھے اپنی بے بسی پر افسوس بھی ہو گا۔ میں تمہیں صرف رلاتا ہوں۔ اپنا ہانا کہ اپنے سے دور رکھتا ہوں۔ یہ کیسی مجبوری ہے کہ میں ہچٹال میں پڑا ہوں اور تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“

مونٹا نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کلمہ۔ ”میں یہ نہیں چاہتی کہ آپ خود کو بے بس لگا لیا اور مجبور سمجھیں۔ میں آپ کی ساتھی ہوں۔ ہر حال میں آپ کا ساتھ دوں گی۔ جو آپ کہیں گے وہ کروں گی۔“

”تو پھر تم مراد کے ساتھ جاؤ۔ یہ میرا سب سے قائل اعتماد دوست ہے۔ یہ ایک طرح سے اندھا ہے کیونکہ عورتوں کو دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ یہ بڑھ ہے۔ کسی عورت کی آواز سننا پسند نہیں کرتا۔ یہ گونگا ہے۔ اپنی زبان پر عورت کا نام تک لانا نہیں چاہتا۔ تمہیں ایسے آدمی کی قدر کرنی چاہیے۔ اس پر اعتماد کرنا چاہیے۔ جاؤ کل یہاں آ جاؤ۔“

”تمہیں یہاں سے کب تک جھٹی لے گی؟“
 ”ڈاکٹر کہہ رہا تھا، دو دن تو لگ ہی جائیں گے۔ ایک تو دواؤں کا اثر ہے۔ دوسرے
 تمہاری آمد سے بڑی توانائی محسوس کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کل ہی اٹھ کر چلنے پھرنے کے
 قابل ہو جاؤں۔“

وہ بے ڈھنگے بن سے ہنسنے لگا۔ اس پر موناکو نمسی آگئی اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے
 کن اکبیں سے اسے دیکھ کر پھر گمری سانس لے کر بولا۔ ”تھیکس اے لاٹ۔ کفر ٹوٹا
 خدا خدا کر کے موٹا اس طرح تم خوش ہو کر ہنسنے سکرارتے ہوئے، دنیا دانوں کو بھی ہنسنے
 سکرانے کا موقع دو گی۔ سوسائٹی میں یہ نہار اشت کردار ہو لگ ہم چھوٹی چھوٹی نیکیاں کر
 کے ہی ایک دوسرے کے دل میں گھر کر سکتے ہیں۔ مثلاً میں نے تمہارے لیے نیکی کی۔ اپنا
 نام بدل لیا۔ اسی طرح تم میرے لیے نیکی کر سکتی ہو۔ میرے لیے بھی سکرارتی ہو۔“

”میں کوشش کرتی رہوں گی۔ دراصل یہاں پہنچنے ہی کامران کو اتنے پورٹ پر نہ دیکھ
 کر پھر اس کے ہسپتال پہنچنے کی خبر سن کر بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔ اس لیے آپ کو
 شکایت کا موقع ملا۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔“
 ”کوئی بات نہیں۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آتا ہے لیکن تم تو چند گھنٹوں میں واپس آ
 سکتی ہو۔“

وہ پھر ہنسنے لگی۔ مراد نے دیر ہی گڈ کہتے ہوئے ایک جگہ گاڑی روک دی۔ موناکو نے
 پوچھا۔ ”یہاں کیا ہے؟“
 ”یہاں ایک ٹیلی فون بوتھ ہے۔ ابھی ہم اس بوتھ کے اندر جائیں گے۔ تم ریسیور
 اٹھاؤ گی۔ میں ہسپتال کے نمبر ڈائل کروں لگ تم اس سے کوئی کہ کامران مرقضی کو فون دیا
 جائے۔ تم اسے بتاؤ گی کہ سکرارتی ہو۔ فون دے دو۔ حالات سے سمجھو کہ رہی ہو اور
 تم ایک دلیر عورت ہو۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”آپ کتنے اچھے ہیں۔ مجھے اس اجنبی اور نئے ماحول میں جینے
 کا حوصلہ دے رہے ہیں۔“
 وہ ٹیلی فون بوتھ کے اندر گئی۔ انہوں نے ہسپتال کی انکوائری سے رابطہ قائم کیا۔ موناکو
 ریسیور تھامے کھڑی ہوئی تھی۔ جیسے ہی رابطہ قائم ہوا، اس نے جزل وارڈ کا نمبر اور

وہ اسے تسلیاں دیتا رہا۔ پھر ملاقات کا وقت ختم ہونے پر موناکو اس سے چھڑنا پڑا۔
 اب تو یہی لگ رہا تھا، زمین پر آسمان پر سمندر کے پانی پر لکھ دیا گیا ہے کہ ملنے رہو اور
 لہن کی ریت نہا بنے سے پہلے چھڑ جایا کرو۔
 وہ اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مراد کا ڈرائیو کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک ان کے
 درمیان خاموشی رہی۔ پھر مراد نے کلمہ ”تم میں بہت ساری خوبیاں ہیں لیکن ایک خامی
 ہے۔“

وہ جواباً کچھ نہ بولی۔ خاموش رہی۔ اس نے کلمہ ”اگر تم حالات سے سمجھو نہ کرنا
 سیکھ لو تو تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ کیا تم سمجھتی ہو، تمہارے خاموش رہنے سے یا
 موجودہ حالات سے سمجھو نہ کرنے سے حالات کو یا لگد کہ تو تم پر ترس آنے کا اور کامران
 ابھی ہسپتال سے اٹھ کر دوڑتا ہوا تمہارے پاس چلا آئے گا؟“

”میں کب ایسا کرتی ہوں؟“
 ”نہیں کہتی ہو لیکن سمجھتی ہیں کہ تمہارے افسوس کرنے سے ناجی انداز میں
 خاموش رہنے سے کامران صحت یاب ہو جائے گا؟ میں تم دونوں کا ہمدرد ہوں۔ غم گسار
 ہوں۔ کیا میں بہت خوش رہوں گا؟ کتنا اچھا موزہ بنا رکھا ہے تم نے۔“
 ”آپ تسلیاں دینے کی بجائے طعنے دے رہے ہیں۔“

”میں تسلیاں بھی دے رہا ہوں۔ سمجھا بھی رہا ہوں مگر تم سمجھنا نہیں چاہتیں۔ اگر
 میرے مشورے پر عمل کرنا چاہتی ہو۔ اگر کامران کو بھی خوش دیکھنا چاہتی ہو تو ہنسی بولتی
 رہو۔ ہنسنے بولنے سے مریض بھی جلد صحت مند ہو جاتا ہے۔ دوسرے بھی خوش رہتے
 ہیں۔“

”آپ درست کہتے ہیں۔ میری مایوسی میرے مسائل کا حل نہیں ہو سکتی۔ میں

کامران کا بیڑ نہر تاتے ہوئے کلمہ "میں مسٹر کامران سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ کیا ان سے گفتگو کرنی جا سکتی ہے؟"

فون اینڈ کرے والی کسی خاتون نے کلمہ "آپ کا مریض اس قاتل نہیں ہے کہ کاؤنٹر تک آئے اور نہ ہی ہم ریسیور دہلی تک پہنچا سکتے ہیں۔"

مونہ نے ہاتھ چپیں پر ہاتھ رکھ کر مراد سے کلمہ "ان سے بات نہیں ہو سکے گی۔" اس نے ریسیور لے کر اپنے طور پر بات کی اسے بھی ہائی سی ہری۔ اس نے کلمہ "تم مسٹر کامران تک ہمارا پیغام تو پہنچا سکتی ہو۔"

"ہاں! یہ کر سکتی ہوں۔"

"تو پیغام ہے، ایک دل کی گمراہیوں سے نکلا ہوا قلمبند، جو تیار کو صحت مند بنا دیتا ہے اور نامراد کی جھولی مرادوں سے بھر دیتا ہے۔ کامران سے کہنا، تمہاری مونہ بہت خوش ہے۔ فون ری ہے اور تمہاری صحت یابی کے لیے دعا کر رہی ہے۔ یقین نہ ہو تو سنو۔ مونہ فون ری ہے۔"

اس نے ریسیور بڑھا کر ہاتھ کے اشارے سے کلمہ "فون! خوب بسو۔"

مونہ بچہ اختیار ہونے لگی کہیں کہ وہ اپنے کامران کے لیے فون ری تھی۔ حترمہ بنی کا پیغام ایک تیار تک پہنچا رہی تھی اور اپنی ہنسی کو مٹا دینا کریش کر رہی تھی۔ وہ فون ری تھی۔ بھول کی طرح کل رہی تھی اور مراد کے اندر ایک ذمہ کی طرح کل رہی تھی۔

وہ ہاتھ سے باہر آئے مراد نے اس کے لیے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کلمہ "تم نے لندن کی ایک بھگت دان میں دیکھی ہے۔ اب تاریکی چھل رہی ہے۔ اسے رات کی بھگت دان ہوئی روٹھنیوں میں دیکھو۔ میں تمہیں سیر کرانوں گے اس کے بعد کسی فرسٹ کلاس رستوران میں کھانا کھائیں گے۔ تمہارا وقت اس طرح گزرتا جائے گا کہ سوچے اور پریشان ہونے کا موقع ہی نہ ملے گا پھر رات کس طرح گزر جائے گی۔ صبح کیسے آئے گی اور کبھی طرح تم اپنے کامران تک پہنچ جاؤ گی، جس پر ہمتی نہیں چلے گی۔"

وہ بہت خوش تھی کیونکہ مراد، کامران کے حوالے سے باتیں کر رہا تھا۔ مونہ کا

مزاج بھی تھا۔ اسے اس کی محبت کا حوالہ مل رہا تھا۔ وہ خوش ہو رہی تھی۔ اسی لیے مراد بڑی حد تک قابل برواقت اور قابل اعتماد ہو چلا تھا۔

رات ساڑھے نو بجے دو دنوں مکان میں پہنچ گئے۔ مونہ نے کلمہ "آپ کے ساتھ کیسے اتنا وقت گزر گیا کچھ، اسی نہ چلا۔ ویسے میں تھک گئی ہوں۔"

"تھکن کا بہترین علاج ہے ایک کپ کافی۔"

"نہیں! اب میں سونا چاہتی ہوں۔"

"میں نے کب روکا ہے۔ پہلے ایک ایک کپ کافی ہو جائے اس کے بعد تم اپنے بیڈ روم میں چلی جاؤ۔ اسے اندر سے لاک کر دینا اور آرام سے صبح تک سوئی رہنا۔"

اس نے ایک چابی اس کی طرف بڑھائی۔ "یہ ہے اس بیڈ روم کی چابی اور وہ بیڈ روم تمہارے لیے ہے۔"

مونہ نے اس سے چابی لیتے ہوئے کلمہ "تھینک یو۔ میں ابھی کافی بنا کر لاتی ہوں۔"

وہ کچن کی طرف گئی۔ چھوٹا سا مکان تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ کچن کس طرف ہے۔ اس کے جانے کے بعد اس نے جیب سے دوسری چابی نکالی، اسے دیکھا اور پھر مونہ کے لیے مخصوص بیڈ روم کی طرف دیکھ کر مسکرائے لگا۔

وہ جلد ہی ایک ٹرے میں کافی کی دو پیالیاں لے کر آگئی۔ اسے میز پر رکھ کر ایک پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔ دوسری پیالی خود اپنے پاس رکھ کر پینے لگی۔ مراد نے اپنی پیالی اٹھائی۔ ایک چمکی لی۔ پھر اس کے ڈانٹنے کو محسوس کرنے کے بعد کلمہ "چینی کم ہے۔ اگر مائٹ نہ کرو تو شوگر پاٹ لے آؤ۔"

وہ پھر کچن کی طرف چلی گئی۔ جیسے ہی نظروں سے اوچھل ہوئی، مراد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ نفاسا سیکٹ نکالنا چاہا۔ اس میں خوب اور گولیاں تھیں، لیکن اس جیب میں بیکٹ نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دو بیکری جیب میں بھی بیکٹ نہیں تھا۔ وہ پریشان ہو کر کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے لگا۔ کبھی اس جیب میں کبھی اس جیب میں۔ وہ غلٹ اور پریشانی میں کچن کی طرف نہ دیکھتا جا رہا تھا کہ کہیں وہ کچھ

نہ جانے آخر وہ تنہا سا پکٹ مل ہی گیا۔ اس نے پکٹ میں سے دو خواب آور گولیاں نکالیں۔ پھر جلدی سے انھیں مونہ کی پیالی میں ڈال کر پیچھے سے ہلانے لگا۔

وہ گولیاں کافی میں یوں حل ہو رہی تھیں جیسے وہ پیالی نہ ہو، مونہ کا دل ہو اور، خود گولیوں کی طرح اس کے دل میں حل ہوتا جا رہا ہو۔

وہ اس کے ساتھ ہسپتال سے مکان آنے تک کتنی ہی تفریح گاہوں میں گھومتا رہا۔ اس کے ساتھ ایک مضحکہ ریز ستوران میں بیٹھ کر کھانا بھی کھایا۔ اس نے طرح طرح سے اس کا دل بسلانے کی کوشش کی۔ اس کے دل میں اترنے کے کتنے ہی راستے تلاش کرتا رہا لیکن مونہ اس کے ساتھ ہنسنے بولنے کے باوجود ایک فاصلہ رکھتی تھی۔ اپنے آپ کو اتنا ریزور رکھا کہ وہ کسی بسلانے سے بھی اس کا ہاتھ نہ تھام سکا۔

اس کی نگاہوں کے سامنے ہسپتال کا منظر تھا جہاں کا این بستر پر لیٹا ہوا تھا اور مونہ نے پہلے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ اس کے بعد کامران نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا تھا لیکن وہی ہاتھ مراد کے ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا مونہ کی بیداری اسے دور کرتی تھی۔ اگر وہ خوابیدہ ہو تو؟

وہ فوراً ہی اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ کیوں کہ قدموں کی آہٹ سنا لی دی تھی۔ مونہ کچن سے آ رہی تھی۔ وہ آتے ہی بولی۔ ”میں کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گئی ہوں۔ حلال کہ آپ نے میرا دل بسلانے کی بے انتہا کوشش کی۔ یہی دیکھیے، ابھی کچن میں شوگر پاٹ رکھ کر آئی تھی۔ وہاں جا کر دیکھتی ہوں تو نظر نہیں آ رہا ہے۔ جانے کہاں رکھ دیا ہے۔ میری یادداشت کمزور ہو گئی ہے۔“

”کون سی نہیں، میں پچھلی کافی پی لی ہوں گا۔“

”ایسی بھی کیا بات ہے۔ دو قدم چل کر کچن میں جا بیٹے اور خود تلاش کر لیجئے، ورنہ

آپ کو پچھلی کافی پلانے کا مجھے افسوس ہو گا۔“

وہ ہنسنے ہوئے اٹھ کر بولا۔ ”میں ابھی آیا۔“

وہ کچن کی طرف گیا۔ جیسے ہی نظروں سے اوچھل ہوا، مونہ نے اپنی پیالی اٹھا کر اس کی جگہ رکھی اور اس کی پیالی اپنے پاس رکھ لی۔ دراصل شوگر پاٹ اسے کچن میں مل گیا

تھا۔ وہ لے کر آ رہی تھی لیکن دروازے پر ٹھک گئی تھی۔ اس نے دیکھا، مراد کوئی چیز اس کی پیالی میں ڈال رہا تھا۔ پھر پیچھے سے بلا رہا تھا۔ چپ بھانے کے دوران اس نے کچن کے دروازے کی جانب دیکھا تو وہ پیچھے ہٹ گئی تھی۔ اسے نظر نہیں آئی تھی۔ چپ چاپ کھڑی سوچ رہی تھی، ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے؟ کیا غصہ دکھانا چاہیے؟ لیکن غصہ دکھانے سے اس کا کیا بگڑے گا۔ بلکہ وہ انتقام اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ وہ اکیلے ہے۔ پردیس میں ہے۔ برائے گھر میں ہے۔ اسے خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔

چند لمحوں تک سوچنے کے بعد وہ واپس گئی۔ وہاں شوگر پاٹ کو برتنوں کے پیچھے چھپا دیا۔ پھر واپس آکر مراد کو اس کے لیے کچن میں جانے پر مجبور کر دیا۔ یہاں یاں بدلنے کے بعد اس کی پیالی سامنے رکھی ہوئی تھی۔ وہ کسی کا بھونکا پینا گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے آدمی پیالی کو ہاتھ میں لیے یوں بیٹھی رہی جیسے آہستہ آہستہ چسکی لیتی جا رہی ہو۔ اتنے میں وہ آگیا۔ کتنے کتنے لگا۔ ”نہیں شوگر پاٹ کہاں رکھ دیا ہے۔ میں یونہی پی لی ہوں گا۔ کچھ زیادہ پچھکی نہیں ہے۔“

وہ اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے پیالی اٹھا کر ایک گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

”تم نہیں پی رہی ہو؟“

اس نے اپنے ہاتھ کی پیالی ذرا آگے بڑھا کر دکھاتے ہوئے کلمہ ”آدمی پی چکی ہوں۔“

وہ مطمئن ہو گیا۔ ٹھہر ٹھہر کر پینے لگا۔ مونہ اسے باتوں میں لگا رہی تھی۔ کبھی اپنی پیالی ہونٹوں تک لے جاتی تھی۔ جیسے کافی پی رہی ہو۔ پھر اسے رکھ دیتی تھی۔ مراد بازی پلٹنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے اطمینان سے ایک ایک گھونٹ پیتے ہوئے اس نے پیالی ختم کر دی۔

مونہ نے پوچھا۔ ”کیا خالی ہو گئی؟“

”ہاں۔ تم نے ابھی تک خالی نہیں کی؟“

”میں کسی کا بھونکا نہیں جیتی۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”میں سمجھاتی ہوں۔ یہ پیالی جو میرے سامنے ہے، اس کی آدمی کافی میں نے اور گل دان میں اتریل دی۔ آدمی جوں کی توں رکھی ہوئی ہے۔“
 وہ کہنے کہتے رک گئی۔ فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ مراد نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھاتے ہوئے ہیلو کلمہ پھر اپنے فون کا نمبر دہراتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کس سے باتیں کرنا چاہتے ہیں؟“
 ڈاکٹر جان بنز کی آواز سنائی دی۔ ”میں نے ٹھیک نو بجے اس نمبر پر فون کیا تھا لیکن تم نہیں تھے۔“

”ہم سوا نو بجے یہاں پہنچے ہیں۔“
 ”کیا مونا تمہارے ساتھ اچھا وقت گزار رہی ہے؟“
 ”بے شک۔۔۔“

”میں اس سے دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

مراد نے ریسیور مونا کی طرف بڑھاتے ہوئے کلمہ ”ڈاکٹر جان بنز ماہر نفسیات ہیں۔ میرا علاج کرتے ہیں۔ تم ہسپتال میں ان سے مل چکی ہو۔ وہ بات کرنا چاہتے ہیں۔“
 مونا نے ریسیور اٹھا کر کلمہ ”ہیلو ڈاکٹر! میں مونا بول رہی ہوں۔ کیا آپ کامران کے پاس ہیں؟“

تھوڑی دیر پہلے وہیں تھا۔ وہ عجیب ہے۔ اگر دواؤں نے خاطر خواہ اثر دکھایا تو کل تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا۔“

”کیا آپ ایک ایسی عورت کی کسی طرح مدد کر سکتے ہیں؟ جو آپ کے ملک میں آئی ہو۔ تمنا ہو۔ بے یار و مددگار ہو؟“

”یقیناً“ میں اس کے کام آ سکتا ہوں لیکن یہ بات تم اپنے حلقہ کہہ رہی ہو، لیکن میں کچھ اور کرنا چاہتا ہوں۔ مراد ایک نفسیاتی مریض ہے۔ وہ کسی کے لیے خطرناک نہیں ہے۔ اس سے کوئی ایسا ویسی حرکت سرزو ہو یا وہ ایسی بات کہہ دے جو تمہارے مزاج پر گراں گزرے تو اسے اپنے شوہر کی خاطر برداشت کر لیں۔“

”اچھا ہوا ڈاکٹر آپ نے یہ بات پھیر دی۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں، ایک

اپنی مریض چائے میں یا کافی میں ایسی کن سی دوا ملا کر دے سکتا ہے جس کے بعد اس کی طرف سے خطرہ محسوس نہیں ہوتا چاہیے۔“

”وہ تمہیں کبھی ذہن نہیں دے سکتا۔ تم اس کی مسمان ہو۔ دوست کی بیوی ہو۔ وہ اس حد تک کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اگر اس نے کوئی چیز ملائی ہے تو اس کے پاس خواب آور گولیاں ہیں۔“

”میرا بھی اندازہ یہی تھا۔ میں نے تمہارے ذہنی مریض کی چال واپس کر دی ہے۔ اپنی پیالی اس کی جگہ رکھ دی تھی اور اس کی پیالی اپنے پاس۔ یوں اس نے خواب آور کافی حلق میں اتار لی ہے۔“

ادھر مونا کہہ رہی تھی، ادھر مراد حیرانی سے سن رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے حلق پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کلمہ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تم نے واقعی پیالیاں بدل دی تھیں؟“
 مونا نے ریسیور کے ماؤتھ پر ہاتھ رکھ کر کلمہ ”جی ہاں، اب آپ رات بھر آرام سے سوتے رہیں۔“

دوسری طرف ڈاکٹر نے کلمہ ”سمز کامران! تم مراد کو احساس دلاؤ کہ اس نے خواب آور گولیاں استعمال کی ہیں۔ اب وہ گمراہی ختم ہو جائے گا۔“
 ”ڈاکٹر، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ گولیاں کھانے کے بعد مریض جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو اور سونے کے بجائے اٹھ کر ٹھٹھا شروع کر دے یا دوڑنا شروع کر دے تو اس کا اثر زائل ہو جائے۔“

”ایسا ہوتا ہے لیکن مراد کچھ اور طرح کا مریض ہے۔ میں جو دوا جس مقصد کے لیے دیتا ہوں، وہ استعمال کرتے ہی اس کے زیر اثر آ جاتا ہے۔ یقیناً ابھی ان گولیوں کے اثر سے سوجائے گا۔“

مراد ان کی باتیں نہیں سن رہا تھا لیکن پریشان ہو رہا تھا۔ بڑبڑا رہا تھا۔ ”میں نہیں، میں سونا نہیں چاہتا۔ میں ابھی چاہتا ہوں۔“

اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مونا نے ریسیور اس کی طرف پھینک دیا۔ اس سے دور ہو گئی۔ وہ بولا۔ ”ڈاکٹر! میں مونا کا دشمن نہیں ہوں۔ میں چاہتا

تھا، یہ پریشان ہے، کامران کے متعلق بہت زیادہ سوچ رہی ہے۔ لہذا اسے آرام سے سلا دوں۔“

”میں سمجھتا ہوں، تم بہت اچھے ہو۔ اپنے دوست کی بیوی کے آرام کا پوری طرح خیال رکھو گے۔“

”مونا نے پیچھے ہٹ کر کچن کے دروازے پر پہنچ کر کلمہ ”تم بھوٹ ہو لے ہو۔ تمہیں میرے آرام کا خیال نہیں ہے۔ تم ایک مریض ہو ذہنی مریض ہو۔ پاگل ہو۔“ مراد نے سختی سے ہونٹوں کو ہینچ کر اس کی طرف دیکھ لیا۔ وہ بھارتی ہوئی کچن کے اندر چلی گئی۔ اس نے کلمہ ”ڈاکٹر! مونا مجھ پر شک کر رہی ہے۔ مجھ سے دور بھاگ رہی ہے۔“

”غصہ“ میں ابھی آتا ہوں۔“

اس نے ریموور رکھ دیا۔ کچن کی طرف جاتا ہی چاہتا تھا کہ وہ دروازے پر نظر آئی۔ اس بار اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ وہ دانت پیسنے کے بعد بولی۔ ”میں جان پر کھینا جانتی ہوں اور جان لینا بھی جانتی ہوں۔ میرے قریب آؤ گے تو اچھا نہیں ہو گا۔“

”مونا! پلیز مجھ پر شک نہ کرو۔ میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں میں تمہارے شوہر کا دوست ہوں۔“

یہ ایک قدم آگے بڑھا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”میں کبھی ہوں آگے نہ بڑھتا۔ کچن کی یہ چھری تمہاری جان نہیں لے سکے گی لیکن جتنے بھی زخم لگیں گے، وہ ساری زندگی کے لیے یادگار بن جائیں گے اس کے ساتھ ہی پھر میں جتنا شروع کر دوں گی۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ ہم قمار بن جائیں تم یقین کرو۔“

”زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری کوئی بات سنوں گی، نہ کسی بات کا یقین کروں گی۔ ایک سوال کرتی ہوں۔ اگر میں بیڈ روم میں جا کر خواب آور گولیوں کے زیر اثر سو جاؤ تو تم کسے میں کیسے آتے جبکہ ایک چالی میرے پاس ہے۔ کیا

دوسری چالی تمہارے پاس نہیں ہے؟“

وہ جواب نہ دے سکے۔ ہچکچائی لگ۔ مونا نے کہا۔ ”میں نے اس وقت دھیان نہیں دیا تھا۔ ایک چالی لے کر رکھ لی تھی لیکن تمہاری اس خواب آور گولیوں والی حرکت نے چونکا کر دیا اور عقل آگئی کہ مکان کے ہر کمرے کی دو چالیاں ہوتی ہیں۔ ہر محل دوسری چالی بھی مجھے دے دو۔“

اس نے ایک گہری سانس لی۔ جیب میں ہاتھ ڈال کے اسے نکالتے ہوئے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ ڈنٹ کر بولی۔ ”رک جاؤ۔ چالی کو میز پر رکھ کر پیچھے ہٹ جاؤ۔“

”تم بہت محتاط ہو۔ میں چاہوں تو چھری کی پروانہ کرتے ہوئے تم سے چھین لوں لیکن میں تمہارا بننا نہیں چاہتا۔ پلیز مجھ پر اعتماد کرو۔“

”جو۔“ وہ رہی ہوں۔ وہ کرو۔“

اس نے چالی میز پر رکھ دی۔ پھر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ آگے بڑھ کر چالی اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”میں یہاں سے ہسپتال جاسکتی ہوئی۔ یہ نہ سمجھنا کہ اجنبی ہوں، بنگ جاکوں گی۔ میرے پاس لندن شہر کا پورا نقشہ موجود ہے۔ ایسی گاڑی بک ہے جو مجھے میرے کامران تک پہنچا دے گی لیکن میں اتنی رات کو وہاں جا کر اس کے لیے پریشانی کا سبب نہیں بننا چاہتی۔ وہ مجھ اور بے بس ہے اور ایک دوست کی بددلتی کے جواب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں اسے بے بسی اور بے چارگی کے احساس میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی۔ میں چاہتی ہوں وہ آرام سے وہاں رہے۔ محنت مند ہو جائے۔ میں اپنی حفاظت کرنا چاہتی ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے وہ اپنے بیڈ روم کے پاس گئی۔ دروازے کو کھولتے ہوئے کلمہ ”میں صبح تک اپنے کمرے میں سو رہی ہوں گی اور تمہیں تو خواب آور گولیاں سلا دیں گی۔ تم جاگنے کی انتہائی کوشش کرتے رہو گے لیکن بیدار نہیں ہو سکو گے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے وہ گولیاں ضرور اثر کریں گی کیوں کہ اس قسم کی ہر دو تم پر اثر کرتی ہے۔“

اس نے دروازے کو اندر سے لاک کر دیا۔ اس پر بھی اطمینان نہ ہوا تو دروازے کے پاس رکھتے ہوئے ایک چھوٹے سے فیمل کو کھینچ کر دروازے سے لگا دیا۔ اس کے بعد وہ کرسیاں بھی وہاں لگا دیں تاکہ وہ تلا توڑ کبھی آتا چاہے تو دروازہ آسانی سے کھل نہ

نکے یا اتنی آواز ہو کہ وہ بیدار ہو جائے۔

وہ بند دروازے کے سامنے کھڑا مٹھیاں بیچ رہا تھا۔ جب تک مونا لگا ہوں کے سامنے تھی، وہ اسے خوش مزاجی سے متاثر کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ دروازہ اس کے سامنے یوں بند ہوا جیسے منہ پر طمانچہ پڑا ہو۔ وہ غصے سے جھنجھلا رہا تھا۔ پھر دہلیں سے پاؤں پٹختا ہوا اپنے بیدار روم میں گلیڈ یہ تو جانتا ہی تھا کہ پاکستان میں شراب پر مکمل طور پر پابندی ہے۔ دہلیں کی عورتیں بھی شراب پینے والوں کو پسند نہیں کرتیں۔ لہذا اس نے مونا کو اپنی شراب نوشی کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ اب غصے میں شراب پینا چاہتا تھا۔ اس نے کمرے میں آکر الماری کھولی۔ اس میں سے ایک بوتل نکالی۔ پھر کچن سے ایک گلاس لا کر شراب اٹھائے لگا۔

اسی وقت یاد آیا کہ خواب آور گولیاں کھانے کے بعد شراب نوشی کی جائے تو یہ ہلاکت کا باعث بنتی ہے۔ وہ شراب اٹھائے کے دوران رک گلیڈ وہ عورتوں سے جنسی نفرت کرتا تھا؟ زندگی سے اتنی ہی محبت کرتا تھا۔ جب سے مونا کو دیکھا تھا؟ زندگی اور حسین نظر آنے لگی تھی۔ ابھی وہ مونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بوتل واپس رکھ دی۔ دہلیں سے پلٹ کر دروازے کے پاس آیا۔ پھر دوسرے بیدار روم کے بند دروازے کو دیکھنے لگا اسے دیکھتے ہی جھنجھلاٹ طاری ہو گئی۔ وہ ادھر سے ادھر ٹھٹھنے لگا۔ پھر بسزے کے سرے پر بیٹھ گلیڈ اس کے اندر کوئی کہہ رہا تھا۔ ”اسے سو جانا چاہیے۔ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ ڈاکٹر جان بٹرنے کوئی دوا دی ہو اور اس کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا ہو۔ اس کا بھی اثر ہو گا اور وہ سو جائے گا لہذا اسے بسزے پر آرام سے لیٹ جانا چاہیے۔“

وہ نہ چاہتے ہوئے لیٹ گلیڈ سونا نہیں چاہتا تھا؟ لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ بند دروازے کو توڑ نہیں سکتا تھا۔ کسی کے دل میں اس کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

فلکست کا احساس شدت اختیار کر لے تو نیند اڑ جاتی ہے اور یہی فلکست کا احساس غم حال کر دے، تھا ماسے تو آری کزور پڑ جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ نیند آنے لگتی ہے اور پھر نیند کیوں نہ آتی جبکہ اس پر دواؤں کا اثر ہو رہا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر جان بٹرنے کاٹیج کے سامنے آکر دیکھا۔ دروازہ بند تھا لیکن دروازہ روشنی تھی۔ دونوں ہی بیدار روم روشن نظر آ رہے تھے۔ اس نے کال بیل کا بٹن دبایا لیکن جواب نہیں ملا۔ کوئی دروازہ کھولنے نہیں آیا۔ اس نے دوبارہ بٹن کو دبایا۔ تھوڑی سی انتظار کرنے کے بعد دستک دی۔ آواز بھی دی۔ ”مسٹر مراد! دروازہ کھولو۔ میں تمہارا میزبان ہوں۔ پلیز! دروازہ کھولو۔“

جواب نہیں ملا۔ اس نے پھر آواز دی۔ ”مسز کامران! اگر تم جاگ رہی ہو تو مجھے آواز سے بچاؤ۔ میں ڈاکٹر جان بٹرن ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم سے فون پر بات کر چکا ہوں۔ اگر مراد سو رہا ہے تو سونے دو۔ میں اپنے اس مریض کے سلیپ میں تم نے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

اندر گمری خاموشی تھی۔ وہ ادھر سے گھوم کر ایک روشن کمری کی طرف آیا۔ کمری کے شیشوں کے پیچھے پردہ تھا۔ پردے کے باوجود روشنی جھلک رہی تھی لیکن کمرے کا اندرون منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کس کا بیڈ روم ہے؟ اسے نہیں معلوم تھا۔ اس نے کمری کے شیشے پر دستک دی۔ ”مراد دروازہ کھولو۔ یا کمری کھول کر یہی باتیں کرو۔ کیا واقعی سو گئے ہو؟“

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر وہ ذرا سا سرک گیا مونا نظر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کا یہ انداز نہیں دیکھا تھا۔ وہ کچن کی چیمری ہاتھ میں لیے کمری تھی اور ڈاکٹر کو غرا کر دیکھ رہی تھی۔ وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”مسز کامران! یہ کیا؟ پلیز دروازہ کھولو۔ میں ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

مونا نے کمری کو کھولتے ہوئے کہا۔ ”میں شریف آدمیوں سے نہیں ڈرتی کیوں کہ وہ خود اپنی عزت سے ڈرتے ہیں۔ اتنی جرات نہیں کر سکتے کہ کسی کی مرضی کے خلاف کمرے میں قدم بھی رکھ سکیں۔ اس کے باوجود میں تم پر عبور نہیں کر سکتی۔ میں نے کامران کے ایک دوست کو آڑیا ہے۔ دوسرے کو آڑنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ پلیز آپ چلے جائیں۔“

”انتانتا دو“ مراد کہاں ہے۔ کیا کر رہا ہے؟“

”وہ جنم میں گیا۔ میں نہیں جانتی کہ کہاں ہے۔ کیا کر رہا ہے۔ میں نے اس سے بیڑہ دم کی دونوں چابیوں لے لی ہیں۔ دروازے کو اندر سے لاک کر کے میزاور کرسیاں لگا دی ہیں۔ اب وہ کمرے میں نہیں آ سگے گا۔ آئے گا تو یہاں سے اس کی لاش نکلے گی۔“

”اوہ گاؤں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فوت یہاں تک پہنچے گی۔ مزموم کا مرانا! میں تسلیم کرتا ہوں یہاں آتے ہی تم پر کچھ زیادتیاں ہوئی ہیں لیکن خوش میں رہ کر خون خرابے کی بات کرو گی یا مراد کو نقصان پہنچاؤ گی تو اپنے کامران کے ساتھ جیل میں جاؤ گی۔ کوئی تمہیں بچانے والا، کوئی تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہو گا۔ تم میاں یو پی پھر ایک دوسرے سے نہیں مل سکو گے۔“

”مجھے کچھ سمجھانے سے پہلے تم ایک بات سمجھ لو۔ کوئی بھی شریف آدمی رات کے وقت کسی جوان عورت کو مشورے دینے نہیں آتا۔ لہذا دن کی روشنی میں بات ہو گی۔ گڑ بٹ۔“

اس نے کھڑکی ایک جھٹکے سے بند کر دی۔ پردے برابر کر دیے اب وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک مصروف رہنے والے ڈاکٹر کو کیا پڑی تھی کہ ان کے معاملات میں اس حد تک دلچسپی لیتا اور اپنا وقت بھی برباد کرتا رہتا۔ دراصل رضا مراد اسے معقول معاوضہ ادا کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر کوئی کیس اپنے ہاتھ میں لے کر اسے بہ احسن و خوبی کامیابی کے ساتھ انجام دیتا چاہتا تھا۔ اس کے پاس آنے والے کتنے ہی دماغی مریض نارمل زندگی گزار رہے تھے۔ اس طرح اس کی شہرت میں اضافہ ہوتا تھا۔ لوگ چرسچہ کرتے تھے۔ پورے وقتوں سے کہتے تھے کہ ڈاکٹر جان ہنر اپنے مریض کے دل کی دماغ کی گہرائیوں تک پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی گھل مل کر رہتا ہے۔ جیسے اسی کے خاندان کا فرد ہو۔ اس طرح وہ اس کی ذاتی زندگی اور خاندانی حالات کی بہت سی چھپچھپکیوں سے واقف ہو جاتا ہے۔ ایسے طریقہ کار سے علاج میں بڑی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اتنی رات کو مراد کے سلسلے میں وہاں چلا آیا تھا۔ بہر حال اسے یقین ہو گیا کہ مونا صبح تک اپنے بیڑہ دم میں بند رہے گی اور محفوظ رہے گی۔ دوسری طرف اس کا مریض رضا مراد گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کی دی ہوئی گولیاں خواب آور نہیں تھیں۔ ڈاکٹر جان

ہنر اپنے مریضوں پر نفسیاتی اثر ڈالنا خوب جانتا تھا۔ دوسری صبح مراد کی آنکھ کھلی۔ وہ چند لمحوں تک بستہ پر چپ چاپ پڑا رہا۔ پھر بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسے یاد آ گیا کہ پچھلی رات دوا کے زیر اثر سو گیا تھا اور مونا نے اپنے بیڑہ دم کے دروازے کو اندر سے لاک کر دیا تھا۔ وہ فوراً ہی بستہ سے اتر کر تیزی سے چلا ہوا کمرے کے باہر آیا۔ دوسرا بیڑہ دم ابھی تک بند تھا۔ مونا نے باہر نکلی بھی ہے یا نہیں۔ اس نے پہلے کچن میں جا کر دیکھا۔ پچھلی رات جو چیزیں جہاں رکھی ہوئی تھیں وہیں موجود تھیں۔ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ مونا ابھی تک بیڑہ دم میں ہے۔

اس نے آ کر دروازے پر دستک دی۔ ”مونا دروازہ کھولو۔ دن نکل آیا ہے۔ پچھلی رات جو کچھ ہوا“ مجھے اس پر ندامت ہے۔ بانی گاؤں، تم باہر آؤ۔ مجھے ایک بدلا ہوا انسان پاؤ گی۔“

جواب نہیں ملا۔ وہ خوش مزاجی سے کہہ رہا تھا مگر جواب نہ ملنے پر غصے سے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے دروازے کو بیٹھا شروع کیا۔ دو دھبے سے کوئی ایک بات تھی یا تو وہ اندر تھی یا باہر نہیں آتا چاہتی تھی۔ اس سے سہمی ہوئی تھی یا اس کی نیند کے دوران ہی صبح اٹھ کر اس کا کالج سے چلی گئی تھی۔

وہ تیزی سے چلا ہوا باہر آیا۔ دوسری طرف جا کر اس نے بیڑہ دم کی کھڑکی کو دیکھا۔ اندر سے بند تھی۔ شیشے کے پار پردے نظر آ رہے تھے۔ پردوں کے پیچھے کمرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کھڑکی پر بار بار دستک دی۔ بار بار آوازیں دیں۔ کمرے کی پراسرار خاموشی نے اسے اور بھی جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔

وہ کالج میں واپس آیا۔ فوراً ہی تیار ہو کر دروازوں کو لاک کیا۔ پھر کار میں بیٹھ کر اسے ڈرائیور کرتے ہوئے سوچنے لگا۔ وہ بہت چالاک ہے۔ میرے بیدار ہونے سے پہلے ہی کالج سے چلی گئی ہے۔ یقیناً کامران کے پاس گئی ہو گی مگر اس کے پاس جا کر میرا کیا بگاڑ لے گی۔ میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ جس پر نکیہ کر رہی ہے، وہ اس کا کوئی نہیں ہے۔ اس کے کسی کام نہیں آ سکتا۔ جو کچھ ہوں میں ہوں۔ میں ہی اس کے ہر طرح کام آ سکتا

اس کی شخصیت سے محبت کرتی ہے۔ وہ لالچی نہیں ہے۔ اس کی نظروں میں میری دولت اور میرے کاروبار کو کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کو کامران پر قربان کر دینا چاہتی ہے۔

”تمہیں اس سے کچھ لینا چاہیے کہ وہ کامران کو دل و جان سے چاہتی ہے۔“

”یہ بے لوث چاہت ہے۔ میں ایسی ہی لڑکی کو چاہتا ہوں۔ ایسی لڑکیاں بازاروں میں نہیں ملتیں۔ لاکھوں میں ڈھونڈو تو ایک ملتی ہے۔ میں اسے کامران سے بانگ لوں گا۔“

”ایسی حماقت نہ کرنا۔“

”آپ میرے معاملے ہیں۔ آپ کامران کو یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ میرا علاج کیسی ہے۔ مجھے یہی مونا چاہیے جو صرف میری ذات سے محبت کرے۔ میرے کاروبار کو میری دولت کو نہ دیکھے۔“

”وہ وفادار اور محبت کرنے والی عورت ہے۔ صرف کامران سے محبت کرتی ہے۔“ وہ شمسے سے بولا۔ ”کیا محبت کرنے والی وفادار عورتیں میرے نصیب میں نہیں ہیں۔“

”ضرور ہیں۔ ڈھونڈنے سے مل جائیں گی۔“

”مل گئی ہے۔ تقدیر نے خود اسے میرے پاس پہنچا دیا ہے۔“

”میں تم سے اچھا کرتا ہوں۔ کامران سے ہرگز ایسی بات نہ کرنا۔ میری نصیحت کو یوں سمجھو کہ مونا اب نرم پڑی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ نری دوستی میں بدل جائے۔ تم ضرور حق سے انتقاد کیوں نہیں کرتے۔ شاید وہ تمہاری طرف مائل ہو جائے۔“

”ہاں“ یہ غور کرنے کی بات ہے۔ میں تمہارے مشورے پر غور کروں گا۔ ابھی کامران سے کچھ نہیں کہوں گا۔“

”شبائش، چلو ہم اس سے ملتے ہیں۔“

وہ کامران کے پاس آ گئے۔ مونا اسی طرح کامران کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت کامران اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر اور مراد کو دیکھتے ہی خوش ہو

کر کھل ”میں ٹھیک ہو گیا ہوں۔ دیکھو! اب اٹھ کر بیٹھ گیا ہوں۔ کل رات تھوڑی دیر بیٹھ کھڑا رہا۔ صبح اس سانسے والی دیوار تک گیا تھا۔ پھر دایبھی میں تکلیف ہوئی لیکن خود بھی یہاں تک آ گیا۔“

ڈاکٹر نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا ”حوصلے سے بڑھ کر کوئی دوا نہیں ہے۔ تم جلد ہی پلٹے پھرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔“

کامران نے کہا ”مراد! ابھی مونا تمہاری تعریفیں کر رہی تھی۔ میں کس زبان سے شکر یہ ادا کروں۔ تم قدم قدم پر میرے ساتھ تعاون کر رہے ہو۔ ایک بہترین دوست ہونے کا ثبوت پیش کر رہے ہو۔“

اس نے کہا ”آج تم غیروں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ دوست جب دوستی نبھاتا ہے تو وہ احسان نہیں کرتا۔ میں یہ نہیں دیکھا کہ تمہارے کام آنے کے لیے کس قدر نقصان اٹھانے پڑے گا۔ میں نے اپنے باپ دادا کے رکھے ہوئے نام کو تمہاری خاطر بدل دیا۔ تمہارے نکاح نامے کے مطابق اپنی ولایت بھی بدل دی۔ گویا کہ اپنے باپ سے بھی انکار کیا۔ اس سے بڑی قربانی کوئی ہو سکتی ہے؟“

”واقعی۔ تمہارے جیسے دوستوں کو ہی جاں نثار کہتے ہیں۔ کبھی موقع آیا تو میں بھی اپنی دوستی کا ثبوت دوں گا۔“

مراد نے اہٹت میں سر ہلاتے ہوئے۔ ”ہاں! ایسا موقع آئے گا بہت جلد آئے گا۔“

”کیا واقعی، مجھے بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟“

مراد نے مونہ کی طرف دیکھ کر مونا نے فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔ ہچکچانے لگی۔ ڈاکٹر نے پریشان ہو کر مراد کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا جیسے خاموشی سے سمجھا رہا ہو۔ ”پلیز! ابھی کچھ نہ کہنا۔“ مراد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم صحت یاب ہو جاؤ۔ ہسپتال سے آ جاؤ۔ پھر طبیعتان سے باتیں کریں گے۔“

ڈاکٹر اور مونا نے طبیعتان کی کمری سانس لی۔ پھر ڈاکٹر نے کہا ”میرا خیال ہے‘ میاں پیوی کو کچھ دیر تھما چھوڑ دینا چاہیے۔ آؤ باہر گارڈن میں بیٹھیں۔“

وہ باہر جانے لگے۔ انکوائری کاؤنٹر کے پاس سے گزرتے وقت استقبالیہ کلرک نے کلمہ ”ڈاکٹر آپ کا فون ہے۔“

اس نے ریسپور لے کر دوسری طرف کی باتیں سنیں۔ ان کا جواب دیا۔ پھر ریسپور رکھتے ہوئے مراد سے کلمہ ”مجھے ایک اہم مریض کو اینڈیز کرنا ہے۔ اس لیے جا رہا ہوں۔ تم تھوڑی دیر گارڈن میں وقت گزار لو۔ ملاقات کا وقت ختم ہوتے ہی موٹا کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔“

ڈاکٹر چلا گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک کھڑا دور اس داری کی طرف دیکھتا رہا جہاں موٹا کو کامران کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں سینہ خالی قتلہ دل رقیب کے ہاتھوں میں چھوڑ آیا تھا۔

موٹا کا ہاتھ ابھی تک کامران کے ہاتھوں میں قتلہ صرف ہاتھ ہی ہاتھوں میں آسکتا تھا۔ حالانکہ لندن کی فضا میں مرد، عورتوں کو، میاں بیوی کو بڑی آزادی ہوتی ہے۔ وہ سرعام بھڑور محبت کا اظہار کر سکتے ہیں لیکن کامران کی تہذیب اور موٹا کی شرم یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے کلمہ ”تم نے میرے دوست کو آخر آزما لیا۔ کل اعتراض کر رہی تھیں۔ آج اس کی دوستی کی قائل ہو گئیں۔“

”ہاں، ملاقات انسان کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔ قائل ہونا پڑتا ہے۔“

”تھیں اور کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟“

”ہو گی بھی تو نہیں بتاؤں گی۔ تم یہاں اسپتال میں رہ کر کیا کر لو گے؟“

”میں تمہارے لیے یہاں سے بھاگ آؤں گا۔“

”بھی تو نہیں چاہتی۔ میری محبت تمہیں دوڑنے پر مجبور کرے گی لیکن تم دوڑ نہیں سکو گے۔ میں تمہیں بے بسی اور بے چارگی کے احساس میں جلا نہیں کرنا چاہتی۔“

”تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے، مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ مجھے پریشان نہیں کرنا چاہتیں۔“

”یہ درست ہے کہ تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی دیے کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔“

”کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟“

”بالکل سچ کہہ رہی ہو۔ ہاں اگر کوئی بات ہوئی تو میں تمہیں کیوں پریشان کروں گی۔ تمہارے دوست جو موجود ہیں۔ تمہیں ان پر اعتماد ہے۔ مجھے بھی اعتماد ہے۔ کیا مسٹر مراد میرے کام نہیں آئیں گے؟“

”کیوں نہیں؟ وہ تو جی جان سے کام آئے گا۔ تم اس کا دوستانہ جذبہ دیکھ ہی چکی ہو۔“

”ہاں، دیکھ رہی ہوں۔“

اسپتال کے باہر گارڈن میں مراد کھڑا ہوا اس داری کی طرف دیکھ رہا تھا، جیسے اس کی نگاہیں ایک سرے کی طرح وہاں پہنچ رہی ہوں جہاں موٹا بیٹھی ہے وہ کامران کے لیے بیٹھی ہوئی ہے۔ اس وقت پوری کی پوری کامران کے لیے ہے۔ اس کی کٹنگو، اس کا لوبہ، اس کی محبت کامران کے لیے ہے۔ میں الو کا چٹا ہوں کہ یہاں کھڑا ہوا اس کا انتظار کر رہا ہوں۔

کبھی وہ بہت ہی جارحانہ انداز میں سوچتا تھا، جی چاہتا تھا فوراً ہی اسے جبین جبین کر اپنی ملکیت بنا لے۔ اکثر لوگ جذباتی ہوتے ہیں۔ جنونی ہوتے ہیں لیکن اس حد تک نارمل ہوتے ہیں کہ جنونی ارادوں پر عمل نہیں کر سکتے۔ موٹا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ شریف آدمی اپنی عزت سے ڈرتا ہے۔ جب انسانوں کی سوسائٹی میں وہ کر اپنی پسند کی صورت کو حاصل نہیں کر سکتا تو سوچتا ہے، کاش وہ کسی چھوٹے سے جزیرے میں اسے لے جائے۔ جزیرے میں کوئی نہ ہو۔ چاروں طرف پانی ہی پانی ہو گا۔ نہ کوئی آسکے گا نہ وہ جاسکے گی۔ اس کی اپنی وہ کر رہ جائے گی۔

وہ سالانہ کا اندھا تھا۔ اس لیے ہریالی سوجھ رہی تھی۔ گارڈن کی ہریالی پر کبھی وہ ٹھٹھا تھا۔ کبھی بیٹھ کر انتظار کرتے لگتا تھا۔ آخر ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ موٹا مسکراتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ اس طرح ہلکی سی مسکراہٹ سے اس کا تمام سر ہلکا مسکراتا ہوا لگتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ غصہ بھول گیا۔ جیسے وہ صبح کی بھولی بھئی شام کو آگئی ہے۔ قحط غصہ تھوک دینا چاہیے۔ معاف کر دینا چاہیے۔

وہ بے اختیار مسکرانے لگا۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں اس وقت سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ اگر تم نہ آئیں تو میں یہیں انتظار کرتا رہ جاؤں۔ خواہ دن گزر جائے۔ رات گزر جائے۔ صدیاں گزر جائیں۔“

موتا ہنسنے لگی۔ کتنی سرلی، کتنی مدھر ہنسی تھی۔ اس کی سنجیدگی اور خاموشی میں بڑی جاہلیت، بڑا دھار تھا اور اس کی ہنسی میں بلا کی تزیین تھی۔ وہ جیسا بھی روپ، جیسا بھی مزاج اختیار کرتی، دیوانے کے لیے قابل قبول ہوتا۔ اس لیے وہ ہنس کر بول کر ان آزمائشی مرحلوں سے گزر جاتا جانتی تھی۔

.. وہ اس کے ساتھ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کہاں چلو گی؟“

”میں تمہارے بس میں ہوں۔ جہاں لے چلو۔“

اس کی ہاتھیں کھل اٹھیں۔ سوچنے لگا۔ اگر یہ میرے بس میں ہے تو میں اسے بے بس کر سکتا ہوں۔ یہ سوچتے ہی اس نے کہا۔

”کالچ چلتے ہیں۔“

”وہاں جا کر کیا کریں گے؟“

”یونہی تھائی میں وقت گزاریں گے۔“

وہ ہنسنے ہوئے بولی۔ ”آپ تھائی کا مطلب نہیں سمجھتے۔ ورنہ کالچ جانے کی بات نہ کرتے۔ تھائی تو اس کار میں بھی ہے۔ باہر سے کوئی ہماری اس تھائی میں غل نہیں ہو سکتا۔ ہم کسی گاڑوں میں جا کر بیٹھیں گے، کوئی ہمارے قریب نہیں آئے گا۔ ہم کسی رستوران میں جائیں گے، وہاں بھی کوئی تیسرا نہیں آئے گا۔ ہماری میز پر تھائی ہوگی۔ ایسے بے شمار مقامات ہیں جہاں لوگ موجود تو ہوتے ہیں لیکن وہ دوستوں کو ان کے درمیان تھائیاں میسر ہوتی رہتی ہیں۔ یہ تھائیاں منڈب ہوتی ہیں، محافظہ ہوتی ہیں۔ بدنامی سے بچاتی ہیں۔“

اس کی باتیں سن کر مراد کو ڈاکڑ کی باتیں یاد آئیں۔ اس نے کہا تھا۔ پہلے محبت نہیں ہوتی، پہلے دوستی ہوتی ہے۔ پھر یہی دوستی رفتہ رفتہ محبت میں بدل جاتی ہے۔ لہذا مبر

و قحط سے کام لو۔ رفتہ رفتہ مائل ہونے دو۔

اس نے قائل ہو کر کہا۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو۔ محفل میں بھی تھائی ہوتی ہے۔ ہمیں ہلکی ہی تھائیوں کو پسند کرنا چاہیے جہاں دوستی پر الزام نہ آئے۔“

وہ اسے لندن کی سیر کرانا رہا۔ دوسرے کاموں نے ایک جگہ کچل کھینچا۔ پھر اس نے موتا سے پوچھا۔ ”کیا تم بچ کے بعد آرام کرتی ہو۔“

”اگر مسلسل کام کے بعد تھک جاؤں تو کھانے کے بعد آرام کرتی ہوں لیکن یہاں تو تھکن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم تفریح کر رہے ہیں۔ آرام ہی کر رہے ہیں۔“

وہ مایوس ہو گیا۔ لندن کی بھری آبادی میں موتا کے ساتھ تھائی میسر تھی۔ اس کے باوجود وہ کالچ جانا چاہتا تھا اور وہ جانے سے کترا رہی تھی۔ شام سے کچھ پہلے اس نے کہا۔

”اب تم کامران سے ملاقات کرنے ہسپتال جاؤ گی، ہسپتالے کالچ چل کر لباس تبدیل کر لو۔“

اس نے معصومیت سے پوچھا۔ ”اس لباس میں کیا خرابی ہے؟“

”میں نہیں چاہتا کہ صبح جو لباس پہنا ہے وہ.....“

موتا ایک دم سے اداس ہو کر دیگر اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔ پھر بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ ”جیسے سب کچھ مل سکتا ہو اور اسے کچھ نہ ملے تو وہ ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بھل جاتا ہے۔ اس کے سامنے کنگھی چوٹی کرنے اور اپنے آپ کو بنا ستوار کر پیش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔“

مراد اس کی کمری سنجیدگی کے پیش نظر کچھ نہ کہہ سکا۔ یہ سوچ کر مبر کرنے لگا کہ وہ تمام دن اس سے کترا رہے لیکن رات کو کالچ میں جانا ہی ہو گا۔ یہاں اس کا کوئی دوسرا ٹھکانہ نہیں ہے۔

وہ دونوں کامران کے پاس پہنچے۔ وہ ہسپتال نہیں تھا۔ قریب ہی ایک کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا کبھی باہر دیکھ رہا تھا۔ کبھی ہر آہٹ پر پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ پھر موتا اور مراد کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو میں ہسپتالے آٹھ سکتا ہو۔ چل سکتا ہوں۔ انشاء اللہ کل صبح تک چلتے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔“

مونا خوشی سے کھل گئی لیکن مراد مریض گاہک اسے توقع نہیں تھی کہ وہ دوا ہی دن میں بستر سے اٹھ جائے گا۔ مونا خوش ہو کر اس کی طرف بڑھنے لگی۔ کامران بھی دونوں بازو پھیلائے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اگرچہ اس کے چہرے سے گزردی اور چال سے ڈگمگاہٹ ظاہر ہو رہی تھی، تاہم وہ مسکرا رہا تھا۔ خود آگے چل کر محبت کو پا لینے میں جو مسرت حاصل ہوتی ہے، وہ مسرت زخموں کو اور پیاریوں کو بھلا دیتی ہے۔ آگے بڑھ کر آنے والی کے استقبال کا حوصلہ دیتی ہے۔

کامران کے ہاتھوں میں مونا کا ہاتھ یوں آیا جیسے پھول آیا لیکن پھول کے ساتھ کاٹنے بھی آتے ہیں۔ اچانک مراد کے دو ہاتھوں نے ان دونوں کے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لیا جیسے وہ بھی ہاتھ ملا رہا ہو۔ اس وقت تینوں کے ہاتھ ایک دوسرے کی گرفت میں تھے۔ مونا نے فوراً ہی اپنے ہاتھوں کو کھینچ لیا۔ الگ ہو گئی۔ مراد نے جینپن کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں تھیں صحت یاب ہونے کی مبارک باد دیتا ہوں۔ شاید دو چار روز میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔“

اس نے مسکرا کر کہا۔ ”تم دو چار دن کی بات کرتے ہو، میں کل ہی صحت سے چھٹی لینے کی کوشش کروں گا۔ میں مونا سے دور نہیں رہ سکتا۔“

وہ ہنسنے ہوئے بولا۔ ”تم جب سے مونا کی زندگی میں آئے ہو۔ میں دعوے کرتے رہے ہو لیکن ہمیشہ دور رہتے آئے ہو۔“

”یہ تو تقدیر کو منظور تھا۔ شاید اب منظور نہ ہو۔“ اس نے مونا کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب ہمارے لمن کی گھڑی آنے لگی ہے۔“

وہ سر جھکا کر شرمیلی تھی، مسکرا رہی تھی۔ اس کی یہی ادائیں جان لیتی تھیں اب وہ شرمائے نہ، مسکرائے نہ، کوئی ادا دکھائے نہ تو پھر وہ عورت کس کام کی؟ وہ دیکھنے والوں کو یہ تو نہیں کہتی تھی کہ وہ دیکھیں اور دیوانے بن جائیں۔ اب مراد اس کی ایک ایک ادا پر قربان ہو رہا تھا تو اس میں اس بچاری کا کیا قصور تھا؟

مراد سوچتی ہوئی نظروں سے کبھی مونا کو اور کبھی کامران کو دیکھ رہا تھا جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے تیزی سے پلٹ کر جاتے ہوئے کہا۔ ”میں باہر انتظار کر رہا

ہوں۔“

وہ یوں کہہ کر گیا جیسے مونا پر فیصلہ چھوڑ رہا ہو کہ میں ہسپتال کے باہر ہوں، کامران اندر ہے۔ کھل آؤ گی؟ کتنی جلدی آؤ گی؟ اگر دیر سے آؤ گی تب بھی آنا ہی ہو گا۔ کامران کی زندگی سے لکھنا ہی ہو گا۔ یہ تقدیر کا بھی فیصلہ ہے اور موجودہ حالات کا بھی۔

اس کے جانے کے بعد مونا نے پوچھا۔ ”کیا ہسپتال سے کل چھٹی لے سکتے ہو؟“

”مجھے یقین ہے کہ کل میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ تمہارے ساتھ ہسپتال سے باہر جا سکتا ہوں۔“

”کیا بریڈ فورڈ بچنے کے لیے زیادہ چلنا پڑے گا؟“

وہ ہنسنے ہوئے بولا۔ ”لندن میں پیدل چلنے کی ضرورت قدم قدم پر پڑتی ہے اور چلنے والے تو میلوں پیدل چلتے ہیں۔ ویسے ہم بس کے ذریعے بریڈ فورڈ جا سکتے ہیں اور برٹش ریل کے ذریعے بھی۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”ہم ریل کے ذریعے سفر کریں گے۔“

”جب مراد کی کار موجود ہے۔ ہم اس میں آرام سے سفر کر سکتے ہیں تو پھر.....“

وہ بات کٹ کر بولی۔ ”میں کسی کا زیادہ احسان لینا نہیں چاہتی۔ مراد صاحب نے ہمارے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اگر ہم اکیلے سفر کریں تو کیا ہرج ہے؟“

”میں پوری طرح چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوں۔ جتنے آرام سے بریڈ فورڈ پہنچ سکو اتنا ہی بہتر ہے۔“

وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ ”میں مراد کا احسان لینا نہیں چاہتی۔“

”عجیب بات ہے۔ کل تم اس پر مجبور ہو نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ صبح آکر اس پر مجبور کرنا شروع کیا۔ اس کی تعریفیں کیں۔ اب تمہارے تیور پھر بدل رہے ہیں۔ کیا میرے دوست سے کوئی غلطی ہوئی ہے؟“

”غلطی ہم سے ہوئی ہے۔ تم نے مجھے مراد کے حوالے سے بلایا۔ میں تمہارے پاس آنے کے لیے ایسی دیوانی تو نہیں تھی۔ کیا ہمیں اس کے غلط نتائج کا سامنا نہیں

کرنا پڑے گا؟

”کیسے غلط نتائج؟ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

”میں نے سنا ہے، کنکلیوں میں پڑھا ہے، دوسروں کو بھی دیکھتی آئی ہوں جو غلطی کرتے ہیں، وہ ضرور بچھتا ہے۔ کیا ہماری غلطی کا کوئی غلط نتیجہ نہیں نکلے گا؟“

”تم خواہ تو وہ پریشان ہو رہی ہو۔ ضروری نہیں کہ ایک غلطی مجبوری کی حالت میں کی جائے تو اس کا نتیجہ ہماری توقع کے خلاف نکلے۔“

”نکلے گا تو ہم کیا کر سکیں گے؟“

”حالات کا مقابلہ کریں گے، ہم کمزور نہیں ہیں۔“

مونانے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ اس کے ہاتھ پاؤں اور سر پر جگہ جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس کا جسم زخموں سے سجا ہوا قتلہ بے شک وہ کمزور نہیں تھا لیکن حالات اسے کمزور بنا سکتے تھے۔ وہ ایک کمری سانس لے کر بولی۔ ”مجھے بات ہے، نتیجہ سامنے آنے کا تو دیکھا جائے گا۔ ابھی بحث فضول ہے۔“

”مونا! شاید ہمارے جیسے دولہا دلن کوئی نہ ہوں۔ شادی کو اتنا عرصہ گزر گیا لیکن ہمیں ایک پل کی تھلائی میسر نہیں ہوئی۔“

مونا کی آنکھیں میچنے لگیں۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی مگر آنسو بھری آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ میں نے سناگ کی پہلی رات تمہارے ساتھ یوں گزار کی کہ تم تم نہیں تھے۔ ایک سایہ تھے جسے میں دیکھ سکتی تھی، پکڑ نہیں سکتی تھی۔

تجوی اپنے شوہر کے سامنے میں رہتی ہے۔ دوسری رات نہ تو میں تمہارے سامنے میں تھی اور نہ ہی تمہارا وہ سایہ میرے ساتھ قتلہ پہلے میں پکڑ نہیں سکتی تھی۔ صرف دیکھ سکتی تھی۔ اب دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔

اس کے بعد ہر شب باقی سنا رہا کوئی کسی کے کنکلیوں کو دیکھ کر روتا ہے۔ میں سماگ کے سرخ جوڑے کو دیکھ دیکھ کر روتی رہی۔

آج میرے سماگ کے آنکھل کا ایک سرا ایک نام نوا شوہر کی گرفت میں ہے۔ وہ آنکھل کھینچ رہا ہے۔ میرا سر نکلا ہو رہا ہے۔ یہ مکافات عمل ہے، ہم نے ویس میں جو بویا، وہ

پولیس میں کٹ رہے ہیں۔

کامران نے آہستہ سے کہہ ”آنسو پونچھ لو۔ لوگ کیا کہیں گے؟“

وہ منہ پر آنکھل رکھ کر آنسو پونچھنے لگی۔ ملاقات کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ اس نے رخصت ہوتے ہوئے کہہ ”مجھے یقین ہے، کل تم میرے ساتھ چلنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ میرا سارا لے کر چلو گے تو کم از کم ساتھ رہے گا۔ میں تمہاکی کے رحم و کرم پر نہیں رہ سکتی۔“

وہ بڑی محبت سے رخصت ہو گئی۔ باہر گاڑوں میں مراد انتظار کر رہا تھا۔ شام کی تاریکی چھیل رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھا جیسے یہ دوسری رات بڑی مرادوں کے بعد آ رہی ہے۔ اس نے کار میں بیٹھتے ہوئے پوچھا ”کالچ چلو گی؟“

”تھوڑا دیر گھومنا چاہتی ہوں۔ کچھ کھانے کے بعد چلیں گے۔ کیا گھر میں جا کر پکھنے کا ارادہ ہے؟“

”کامران ہسپتال سے آ جائے تو ہم گھر میں پکائی گے اور۔ خوب انجوائے کریں گے۔“

وہ رات کے کھانے کے بعد تقریباً دس بجے کالچ میں پہنچا۔ مراد بہت خوش تھا۔ ہولے ہولے گنگنا رہا تھا۔ لطیفے بنا کر اسے بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کالچ کے سامنے پہنچ کر اس نے گاڑی روکی۔ مونانے اس دوران اس کے ساتھ بیٹھنے بولنے رہنے کی کوشش کی تھی لیکن اندر ہی اندر ذرا خوف زدہ اور پریشان تھی۔ ایک اجنبی میزبان کے ساتھ یہ دوسری رات تھی۔ سوچ رہی تھی، کسی طرح یہ رات عزت و آبرو سے گزر جائے تو زندگی ایک سخت امتحان سے گزر جائے گی۔

وہ کالچ کے دروازے پر پہنچا۔ پھر اسے کھولتے ہوئے بولا۔ ”آج تم سے اپنی زندگی کی سب سے اہم گفتگو کروں گا۔“

”کیا ان باتوں کا تعلق مجھ سے ہے؟“

”خاص تم سے ہی ہے۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”پھر تو میں جانتی ہوں، آپ میرے نقصان کی باتیں نہیں کریں

دروازہ کھل گیا۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”کیا تمہیں مجھ پر اتنا احمق ہے؟“

”آپ مجھے اتنی دیر تک بٹاتے رہے۔ خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر بھلا دکھ پہنچانے کی باتیں کیوں کریں گے؟“

وہ اپنے کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ پھر چونک کر بولی۔ ”اوه میں اپنا پرس تو کار میں بھول آئی۔ ابھی لے آئی ہوں۔“

”فہرہ! میں لا رہا ہوں۔“

وہ کالج کے باہر آیا۔ اس نے کار کو لاک کر دیا تھا۔ دروازہ کھول کر اگلی سیٹ پر بڑے ہوئے پرس کو اٹھالیا۔ وہ بہت ہلکا رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ جب یقین ہو گیا کہ مونا وہیں نہیں ہے تو فوراً ہی اسے کھول کر تلاش کرنے لگا لیکن وہ خالی تھا۔ اسے برا تعجب ہوا۔

اس نے پرس کو بند کیا۔ پھر کار کو لاک کرنے کے بعد کالج کے اندر آیا۔ مونا وہیں نہیں تھی۔ اس نے پکارا۔ ”مونا!“

بیڈ روم کے اندر سے آواز آئی۔ ”میں یہاں ہوں اور میں نے اپنے دروازے کو اندر سے لاک کر لیا ہے۔ رات زیادہ ہو گئی ہے۔ ہم دونوں تھکے ہوئے ہیں۔ لہذا آرام سے سو جانا چاہیے۔ صبح ملاقات ہوگی۔ شب بخیر۔“

مرد حیران پریشان بند دروازے کو دیکھنے لگا۔ اب اسے خالی پرس کی وجہ سمجھ میں آ رہی تھی۔ مونا نے پہلے ہی بیڈ روم کی دونوں چابیاں اور نقد رقم وغیرہ کو اپنے پاس چھپا لیا تھا۔ خالی پرس کو گاڑی میں چھوڑ دیا تھا۔ اس نے جھنجھلا کر پوچھا۔ ”کیا تم نے مجھے بے وقوف بنانے کا منصوبہ پہلے ہی بنا لیا تھا؟“

اندر سے جواب ملا۔ ”تم نے بھی کافی میں خواب آور دوا ملانے کا منصوبہ پہلے ہی بنا لیا تھا۔ میں نے اپنی حفاظت کے لیے پیشگی منصوبہ بندی کی اور اس پر عمل کر رہی ہوں۔“

”مونا! یہ میرے لیے چیلنج ہے۔ میں تمہیں سمجھاتا ہوں، مود کو کبھی نہ بھڑکایا کرو۔“

اگر میں بھڑک گیا تو دروازے کو توڑ کر رکھ دوں گا۔“

”تم تو بڑا شروع کرو گے، میں جتنا شروع کروں گی۔ لوگ جمع ہو جائیں گے۔ میرے دل سے تنہائی کا خوف جاتا رہے گا۔“

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ موجودہ حالات پر غور کرتا رہا۔ اگر وہ شوہر کی حیثیت سے دروازہ کھولنے پر مجبور کرتا تب بھی ناکامی ہوتی۔ مغربی ممالک میں شوہر اپنی بیوی پر خواہ مخواہ رعب نہیں ڈالتے۔ اس کی اجازت کے بغیر بیڈ روم میں بھی نہیں جاسکتے۔ پھر بھلا وہ دروازہ کیسے توڑ سکتا تھا۔ وہ تو محض دھمکی دے رہا تھا اور وہ دھمکی بے اثر ہو گئی تھی۔

وہ جھنجھلا کر اپنے بیڈ روم میں آیا۔ غصے سے ٹھٹھنے لگا۔ اسے کسی طرح قرار نہیں آ رہا تھا۔ پھر اس نے الماری کھولی شراب کی بوتل نکالی۔ اس کے بعد گلاس میں ایک پیکی لے کر پینے کے پہلے اس نے فہرہ کو ایک پیکی حلق سے اتارا۔ کچھ سکون محسوس ہوا۔ وہ آرام اور سہولت سے موجودہ حالات کا تجزیہ کرنے لگا۔ پھر وہ اطمینان سے چلا ہوا اور دوسرے بیڈ روم کے دروازے میں پہنچا۔ دنگ دیتے ہوئے کہنے لگا۔ ”مونا! میری بات سن لو۔ کل میں نے تمہاری کافی میں خواب آور گولیاں ملائی تھیں۔ یہ میری دشمنی نہیں تھی۔ میری دیوانگی تھی۔ میری حماقت تھی۔ ایک حصول کا جذبہ تھا۔ تم میری اس حرکت کو دشمن کی نظر سے دیکھو تو میں برا ہوں۔ دوست کی نظر سے دیکھو تو میں کامران سے بھی زیادہ تمہارا جھلجھلا رہا ہوں۔“

وہ چند لمحے چپ ہو کر جواب کا انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ”میری طلب وقتی نہیں ہے۔ پائیدار ہے۔ میں تمہیں بیشک کے لیے اپنا چاہتا ہوں۔ میں اپنا نام اپنی عزت اپنی شہرت اپنی دولت اپنا سب کچھ تمہارے نام کرنا چاہتا ہوں یقین نہ ہو تو پہلے سب کچھ اپنے نام کر لو۔ پھر چاہو تو مجھے لکھال بنا کر دھککار دو۔ میں پھر بھی ثابت قدم رہوں گا اور آخری سانس تک تمہیں تم سے طلب کرتا رہوں گا۔“

اس نے پھر جواب کا انتظار کیا۔ پھر بیڈ روم کے اندر خاموشی رہی۔ وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں آیا۔ دوسرا پیکی بنا کر اسے حلق سے اتارنے لگا۔ محسوس ہوا جیسے قطرہ

تقرہ شراب کوئی اثر نہیں دکھا رہی ہے۔ اس نے بوتل کی گردن دبوچ لی۔ جیسے مونکی گردن ہاتھ آگئی ہو۔ پھر اس نے بوتل کو منہ سے لگالیا۔ غصہ و دھار گھونٹ حلق سے اتار کر مری سانس لینے لگا۔ دو گھونٹ اور پینے کے بعد وہ بندہ روم سے باہر آکر لڑکھاتی ہوئی زبان میں بولا۔ ”اے میں جانتا ہوں، تم جاگ رہی ہو۔ تم کیا سمجھتی ہو؟ کیا میں کتا ہوں۔ بھوک رہا ہوں۔ اس لیے جواب نہیں دیتا چاہیے۔ میں پھر تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ مجھے بھوکے اور پھر کانٹے پر مجبور مت کرو۔“

وہ لڑکھاتے ہوئے قدموں سے چٹا ہوا دروازے کے قریب آیا۔ بوتل کو منہ سے لگا کر دو گھونٹ حلق سے اتارے۔ پھر آستین سے منہ پونچھتے ہوئے بولا۔ ”تم میرے کھینچے میں ہو۔ یہاں میری بیوی ہو۔ میں چاہوں تو ایک لمبے کے لیے تم کامران سے نہیں مل سکتیں۔ اگر ابھی تم نے دروازہ نہ کھولا تو کل سے میں اپنے قانونی حقوق استعمال کروں گا۔“

اس نے بوتل پھر منہ سے لگائی۔ پھر دو گھونٹ پینے اور آستین سے منہ پونچھنے کے بعد کلمہ ”میں جانتا ہوں“ تسماری اجازت کے بغیر میں ازدواجی حقوق حاصل نہیں کر سکتا ہوں۔ تم بھی یہ مان لو کہ میری اجازت کے بغیر تم کامران کی بیوی نہ بن سکو گی۔ یہ میرا دعویٰ ہے۔“

بندہ روم کے اندر مونا ایک دم سے گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اب تک وہ آرام سے لیٹی ہوئی تھی۔ مراد کی باتوں کو بکواس سمجھ کر نظر انداز کر رہی تھی لیکن یہ آخری پلٹتے دل کو لگ رہی تھی۔ یہ درست تھا، وہ قانونی شوہر بن کر اس کے اور کامران کے درمیان ایک ایسی دیوار بن سکتا تھا جسے کوئی نہیں گرا سکتا تھا۔ یہاں اس کا کامران بے بس تھا اور رضا مراد کو قانون کی پھر پور حمایت حاصل تھی۔

وہ چنگ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں آج بھی کامران کا بہترین دوست ہوں۔ میں نے پہلے بھی اس کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ اب بھی دے سکتا ہوں۔ کیا وہ میرے لیے اتنی قربانی نہیں دے سکتا کہ میرے حق میں تم سے دستبردار ہو جائے؟ اور وہ ضرور قربانی دے گا۔ دوستی امتحان لیتی ہے اور وہ

اس امتحان میں ہار نہیں ہو گا۔“

مونا انگار میں سر ہلاتے ہوئے دروازے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ وہ خاموش اداؤں سے کہہ رہی تھی۔ ”میں نہیں۔ کامران کبھی ایسی قربانی نہیں دے گا جس سے محبت پر حرف آئے۔ جس سے عورت کی حیا نظام کا مال بن جائے۔ ہرگز نہیں۔ کامران کبھی ایسا نہیں کرے گا۔“

باہر سے پھر مراد کی لگا لڑائی دی۔ اس بار آواز بہت زیادہ لڑکھاتی ہوئی تھی۔ وہ بمشکل الفاظ ادا کر رہا تھا کہ رہا تھا۔ ”اے“ تم سونگئی ہو یا مرگئی ہو؟ میں جانتا ہوں تم نہیں مر گئی۔ تم نے مجھے مار ڈالا ہے۔ باہر آؤ اور مجھے محبت سے راتی رہو۔ میں مرنا رہوں گا۔ خدا کرو گی تو تمہارے اور کامران کے درمیان آج بھی اور کل بھی سات سمنہ کا فاصلہ قائم رہے گا۔“

وہ دروازے سے لگ گئی تھی۔ پریشان ہو کر سوچ رہی تھی۔ اپنے سر کو تھام کر دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ ”میں پیدا کیوں ہوئی؟ پیدا ہوئی تو جوان کیوں ہوئی؟ جوان ہوئی تو بے نام سامکن کیوں بنی؟“

یہ سوچنے کے دوران دروازہ ہولے سے لرز گیا۔ جیسے دوسری طرف سے دھکا دیا گیا ہو۔ جبراً اسے کھولنے کی کوشش کی گئی ہو۔ وہ آہستہ آہستہ بیٹھ گئی۔ کی ہول سے آنکھ لگا کر دیکھنے لگی۔ پہلے مراد کی پشت نظر آئی۔ وہ دروازے سے ذرا دور جا رہا تھا۔ پھر ایک جگہ رک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے ہاتھ میں شراب کی بوتل پکڑی ہوئی تھی۔ اب وہ بوتل کو منہ سے لگا کر ایک ایک گھونٹ پی رہا تھا۔ دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جھجھکا رہا تھا۔ پھر اس نے گھونٹا دکھاتے ہوئے کلمہ ”میں دروازے کو نہیں توڑ سکتا مگر قانون کے ایک گھونٹے سے تمہاری ازدواجی زندگی کو ریڑھ کر سکتا ہوں۔“ اس نے ایک ہنگلی لی۔ نشے میں لڑکھایا پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کی ہول سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ یقیناً لڑکھانے کے بعد اونٹ سے منہ گرا ہو گا۔ ہلکی سی دھپ کی آواز سنائی دی تھی۔

وہ کی ہول کے پاس سے ہٹ گئی۔ جنس پیدا ہوا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ کیا کرنے

والا ہے۔ کیا نشہ اس پر غالب آئے گا یا وہ نشہ اسے دیوانہ بنا کر دروازہ توڑنے پر مجبور کرے گا۔ پتا نہیں آج رات کیا ہونے والا ہے؟

اس نے سوچ آف کیا۔ اپنے بیڑہ روم کی جی بھا دی۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کھڑکی کے پاس آئی۔ اس کے پردے کو زوراً ساہٹا کر شیشے کے پار دیکھ لیا وہ فرش پر اونٹن چڑھا ہوا تھا۔ اب آہستہ آہستہ بیڑیاں ہوا کرکٹ بدلتا ہوا چاروں شانے چپت ہو رہا تھا۔ کھلی ہوئی بوتل اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس میں سے گری ہوئی شراب اس کے گریبان کو بھگو رہی تھی۔ اس نے پھر بوتل کو منہ لگا لیا۔ شراب اس کے قلع میں اترنے لگی۔ اس کا بہت سا حصہ فرش پر اور اس کے لباس پر بہہ گیا تھا۔ ذرا سی دیر میں بوتل خالی ہو گئی۔ اب ایک قطرہ بھی نہیں گر رہا تھا۔ اس نے جھنجھلا کر بوتل کو زور سے سامنے والی دیوار کی طرف دے مارا۔ پھر اٹھنے لگا مگر اٹھ نہیں پا رہا تھا۔ بار بار گر جاتا تھا۔ پھر اس نے فرش پر کھٹی لیگی۔ اس کے سارے اٹھنے کی کوشش کی۔ اٹھنے کے دوران اس نے پھر دروازے کی طرف دیکھ لیا۔ اس کی طرف گھومنا دکھانا چاہا لیکن نشہ اس قدر زیادہ تھا کہ ہاتھ پاؤں اس قدر ڈھیلے پڑ رہے تھے کہ وہ گھومنا دکھانے کے لیے مضی نہیں باندھ سکتا تھا۔ وہ اٹھنے اٹھنے پھر لڑکھڑا کر اونٹن سے منہ کر پڑا۔ اس بار وہ اٹھ نہ سکا۔ وہیں بیڑیاں رہا۔ آہستہ آہستہ اس کی آواز ذوق جاری تھی۔ مونچھ چپ کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ سسے ہوئے انداز میں سوچ رہی تھی۔ کیں شراب کی زیادتی اسے مار نہ ڈالے۔ اگر یہ مرجائے گا تو کیا ہو گا؟

ہو گا کیا؟ ایک مصیبت ٹل جائے گی۔ ایک دشمن مرجائے گا لیکن اس کاٹھ میں اس کی موجودگی میں دشمن کی موت اس کے لیے پریشانی کا باعث ہوگی۔ اگرچہ اس کی موت کی ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوگی۔ تاہم وہ کامران مرتضیٰ عرف مراد کی بیوہ کھلائے گی۔ اس کی موت کے بعد لندن میں رہنے کا کیا جواز رہے گا؟ کیا وہ اپنے مرحوم شوہر کی منی کیب ایجنسی کا کاروبار سنبھال سکے گی۔ تو یہ تو بہہ مراد کو اپنا مرحوم شوہر تسلیم کیوں کرے گی۔ جب کہ اسے زندہ شوہر تسلیم نہیں کر رہی ہے لیکن قانون کے آگے بے بس ہوگی۔

پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس نے مراد کے کاروبار کو سنبھال لیا تو اپنے کامران مرتضیٰ کے ساتھ کیسے ازدواجی زندگی گزار سکے گی؟ وہ لندن میں اس کا قانونی شوہر نہیں کھلائے گا۔ ہاں، ایک بات ہے کہ وہ مرحوم کامران مرتضیٰ کے حوالے سے یہاں کی قانونی اور باقاعدہ شہری رہے گی۔ اگر اپنے کامران مرتضیٰ کو یہاں کا باقاعدہ شہری بنانا چاہے تو اس سے شادی کر سکتی ہے۔ ایک بیوہ جو باقاعدہ شہری ہو وہ کسی بے قاعدہ شہری سے شادی کر کے اسے یہاں کے شہری ہونے کا قانونی حق دلا سکتی ہے، مگر کیا وہ اپنے شوہر کامران مرتضیٰ سے دوبارہ نکاح پڑھائے گی؟

توبہ توبہ! انگریزیشن کے قوانین سے کھیلنے کے لیے، قانون کے محققوں کو ایک فریب دیا۔ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہاں چلی آئی۔ اب ایک فریب کے بعد آئندہ ہی فریب کے جال پھیلنے جا رہے تھے۔ پتا نہیں اسے کیا کچھ کرنا ہو گا۔ یہ سمجھ میں آ گیا تھا، جو کچھ بھی کرنا ہو گا وہ اخلاق، تہذیب اور قانون کے خلاف ہی ہو گا۔

وہ فرش پر اونٹن سے منہ پڑا ہوا تھا۔ بالکل بے حس و حرکت تھا۔ کھڑکی کے ذرا دور تھا۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سانس چل رہی ہے یا نہیں؟ کیا وہ مرجھا ہے؟ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی۔ پردے کو برابر کر کے اندھیرے میں کھڑکی کچھ سوچنے لگی۔ اس کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے باہر ایک بیت پڑی ہے۔ وہ ایسے گھر میں ہے جو آسپ زدہ ہو چکا ہے۔ کیا اس کی روح بھٹک رہی ہو گی؟ کیا وہ نہ آسکا؟ اس کی روح تو کمرے کے اندر آئے گی۔

وہ سہم کر تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ اگرچہ وہ ضعیف الاعتقاد نہیں تھی۔ پھر بھی ان حالات میں جانے کیسے کیسے خیالات دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ اس کی پریشانی میں اضافہ کر رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ آج کر دیا۔ کمرے میں روشنی ہو گئی۔ وہ خواہ کتنی ہی حوصلہ مند ہو تاریکی میں نہیں رہ سکتی تھی۔

رات گزر رہی تھی۔ ادھر مراد فرش پر پڑا ہوا تھا۔ ادھر وہ کمرے میں ٹل رہی تھی۔ کبھی بیٹھ رہی تھی، کبھی اٹھ رہی تھی۔ آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ پھر پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ مراد کے جسم میں ذرا سی حرکت پیدا ہوئی۔ وہ کراہنے لگا۔ آہستہ آہستہ

آکھیں کھولنے لگا۔ وہ جہاں پڑا ہوا تھا وہاں سے بلب کی روشنی نظروں میں دھندلا رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا سر پکڑا رہا قتلہ درو دیوار کھوٹے ہوئے سے نظر آ رہے تھے۔ ہر چیز آہستہ آہستہ گردش کر رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ وہ بند دروازے کو کھول نہیں سکا تھا۔ اس نے لڑکھائی ہوئی نالی سے کلمہ ”آجاؤ“ دروازہ کھول کر آجاؤ۔ اگر یہ دروازہ آج نہ کھلا تو دوستی کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔ کل سے دشمنی کے دروازے کھل جائیں گے۔“

وہ کہتے کہتے دگ گیلہ بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ دروازہ کھلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ بھی نظر آ رہی تھی۔ اگرچہ سر پکڑا رہا قتلہ دماغ قابو میں نہیں تھا پھر بھی لگ رہا تھا جیسے وہ حقیقت ہو، جیسے خواب ہو۔ جو کوئی بھی ہو، اس کی دھمکی کے مطابق دروازہ کھل چکا تھا۔ وہ سامنے آگئی تھی۔

وہ دونوں ہاتھ فرش پر ٹیک کر اٹھنے لگا۔ اگرچہ ڈمگا رہا تھا۔ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکا تھا پھر بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جب مطالبہ پورا ہو رہا ہوا ہاتھ سے نکلنے والی چیز پھر ہاتھ آ رہی ہو تو ایسے میں توانائی حاصل ہو ہی جاتی ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ پیچھے ہٹ کر ایک طرف جاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ تم نے دروازہ کھولنے کے لیے کہا“ میں نے کھول دیا۔ پاس آنے کے لیے کہا“ آئی۔ اب بولو کیا چاہے ہو؟“

وہ سرخ لباس میں تھی۔ کل پاکستان سے سرخ ساری میں بلبس آئی تھی۔ آج اس نے سرخ شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ ایسی ساکن تھی جو صرف لباس سے ساگ کا بھرم رکھ رہی تھی۔ وزن، جس کی منکوحہ تھی، اس کے من میں تھی اور جس کی منکوحہ نہیں تھی، اس کے گھر میں تھی۔ نہ اسے حاصل ہو سکتی تھی۔ نہ اسے مل سکتی تھی۔ وہ لڑکھاتے ہوئے آگے بڑھل دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

سرخ پوش کہ لب بام نظری آید

نہ بزور و نہ بزادری نہ بزوری آید

وہ جو سرخ لباس میں نظر آ رہی ہے، وہ لب بام ہے۔ میری پہنچ سے دور ہے۔ نہ میری قوت سے حاصل ہو سکتی ہے نہ آہ زادری سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ ہی قریح مل

سکتی ہے۔ بیک شاعر نے ایسے ہی حالات کے لیے درست کہا ہے لیکن وہ شاعریہ نہیں جانتا تھا کہ جو کسی طرح حاصل نہ ہو وہ چلائی کے مل سکتی ہے۔

رخسار کا ہاتھ جیب سے باہر آیا۔ پھر ایک کٹاکٹ سے اچانک ہی چاقو کھل گیا۔ وہ چپتے ہوئے بولا۔ ”تم نے پہلے ہی منصوبہ بنایا تھا کہ مجھے بے وقوف بنادو گی اور بیڈ روم میں جا کر بند ہو جاؤ گی۔ میں بھی سوچ کر آیا تھا کہ کل تم نے کچن کا چاقو دکھلایا تھا، آج میں چاقو دکھاؤں گا۔ کل تمہاری چال کامیاب ہوئی تھی، آج میری ہو گی۔“

وہ گھبرا کر بولی۔ ”میں چیخنا شروع کر دوں گی۔“

”اس سے پہلے ہی یہ چاقو تمہارے جسم میں اتر جائے گا۔ اگر اپنی زندگی چاہتی ہو تو چپ چاپ میرے پاس چلی آؤ۔“

”تم ابھی محبت سے کہہ رہے تھے کہ..... دروازہ کھولوں گی تو دوستی قائم رہے گی۔ ورنہ دشمنی کی ابتدا ہو گی۔ میں نے تمہاری بات مان لی۔ کیا پھر بھی دشمنی کرو گے؟“

”ہاں“ ایک بار ہاتھ سے نگلی ہوئی چیز دوبارہ ہاتھ آ جائے تو پھر دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ میں اب قریب نہیں کھاؤں گا۔ میں اتنا اناڑی نہیں ہوں۔ آج تمہیں حاصل نہ کر سکا تو کل ہاتھ تیار ہواؤں گا۔“

وہ آگے بڑھل یہ پیچھے ہٹنے لگی لیکن پچ کر کہاں جا سکتی تھی۔ چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اسے پکڑ لیا۔ دھمکی دی۔ ”اگر شور مچاؤ گی تو جان سے جاؤ گی۔“

پھر بھی اس نے ایک پیچ باری۔ اس کے ساتھ ہی اس نے چاقو سے حملہ کیا۔ پہلے حملے سے وہ پیچ پیچ کر لیکن پہنچنے کے ساتھ ہی پیچھے دیوار سے ٹکرائی۔ بدحواسی میں بھگنے کا راستہ نہ ملا۔ دوسرا حملہ ہوا۔ پھر اس کے جسم میں پے در پے چاقو کا پھل اترتا رہا۔ جسم سے خون کے چھینٹے اڑتے رہے۔ دیدے پھیلے رہے۔ وہ ساکت ہوتی رہی۔ ساکن کا سرخ جواڑا لہو کی سرخی میں بھینکا چلا گیا۔

انسان سوچتا کچھ ہے، ہوتا کچھ ہے جب اس نے پہلی بار چاقو سے حملہ کیا تو شیشہ ایک چھانکے سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے پے در پے حملے کیے۔ مونا لیزا زخمی

ہوتی مٹی اس کی تصویر پر جالبہ جاسور اُرخ پڑتے گئے لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے دیوار پر
مونا لیزا کی تصویر نہیں تھی بلکہ مونا دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ دیے مونا ہو یا مونا لیزا
مسکراہٹ کو ہر دور میں قتل کیا جاتا ہے اور وہ قتل کر رہا تھا۔ جنونی انداز میں چاقو سے حملے
کر رہا تھا۔ پھر وہ تھک کر ہانپنے لگا گھور کر دیکھنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اس کے ہاتھ سے
چاقو جھوٹ کر گر پڑا۔ وہ اچانک ہی دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ روتے روتے دیوار سے
لپٹ کر کہنے لگا۔ ”آہ! میں نے یہ کیا کیا؟ تمہیں مارا ڈالا۔ میں تمہارا قاتل ہوں۔ میں تمہارا
قاتل ہوں۔ مگر میں کیا کر رہا تھا؟ تم زندگی میں میرے ہاتھ نہیں آ سکتی تھیں۔ مگر میری ہاتھ
لگ سکتی تھیں۔ دیکھو! اب تم بے جان ہو گئی ہو۔ اب تم مدافعت نہیں کر سکو گی۔ مجھے
قریب آنے سے نہیں روک سکو گی۔ اس لیے تم میری سانسوں کے قریب ہو۔ میرے
جسم و جان میں سائی ہوئی ہو۔“

وہ دیوار سے لپٹ رہا تھا اور نشے کی حالت میں آہستہ آہستہ بڑبڑاتا ہوا بیٹھتا جا رہا
تھا۔ پھر وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد فرش پر لڑھک گیا۔ وہاں تھوڑی دیر تک خاموشی
چھائی رہی۔ آخر اس کے خراٹے سنائی دینے لگے۔

مونا بیڈ روم کے اندر سہی ہوئی تھی۔ اس کی بک بک سنتی رہی تھی۔ باتوں سے
ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے پاس چاقو ہے اور وہ چاقو سے کہیں حملے کر رہا ہے۔ اب وہ اس
کے خراٹے سن رہی تھی۔

وہ خراٹے رات کے اندھے سینے میں تیز خنجر کی طرح اتر رہے تھے۔ وہ راتیں
کیسی ہوتی ہیں جو سانپ گزرتی ہیں۔ یہ رات کیسی ہے جو ایک اچھا گن گزار رہی ہے۔

☆ ----- ☆

کامران اپنے بستر پر گم مسم بیٹھنا رہا تھا اور مونا اسے سن رہی تھی۔ ایک ہوتا ہے
بات کہنا اور ایک ہوتا ہے بات سنانا۔ وہ کبھی سولت سے کہتی جاتی تھی اور کبھی خوب
سٹاتی جاتی تھی۔ پھر ایک ہوتا ہے دکھنا۔ روٹنا۔ کہنے اور سنانے کے دوران وہ روتی بھی جاتی
تھی۔

اس کی مکمل روداد سننے کے بعد کامران نے کہا۔ ”میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ
مراد جیسا دوست ایسی حرکتیں کر سکتا ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔“
وہ غصے سے بولی۔ ”میں نے قیامت کی دو راتیں گزاری ہیں اور تمہیں یقین نہیں
آ رہا ہے۔ کیا تم نے مجھے اسی لیے بلایا ہے کہ میں اکیلی کمزور عورت تم سے دور شیطانوں
کی پناہ میں رہوں؟“

”مونا! یہ بات نہیں ہے۔ میں تمہاری ایک بات کا یقین کرتا ہوں۔“
”یقین کرتے ہو تو ابھی ہسپتال سے پھنسی لے کر چلو۔ پھنسی نہ لے تو مجھے بڑے فوراً
کے مکان کا پتا بتاؤ۔ میں تمہارا جا کر رہوں گی۔“
”تم تنہا کیسے جاؤ گی؟ یہ شہر شیطان کی آنت کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ پھر تمہیں مراد
کے ہاں سے اپنا سلمان بھی لے کر آنا ہو گا۔“

”میں نے اپنا اور تمہارا تمام سلمان وہاں سے سیٹ لیا ہے۔“
”کیا وہ سب کچھ اپنے ساتھ لائی ہو؟“
”میں نے وہ سلمان ریلوے اسٹیشن کے لاکر میں رکھ دیا ہے۔ لاکر کی چابی میرے
اِس ہے۔“

”تم اپنے بیٹے روم میں اندر سے بند ہو گئی تھی۔ پھر کچھ لے نکل کر آئیں۔ کیا مراد نے نہیں روکا؟“

”میں تمام رات جاگتی رہی۔ وہ تمام رات خزانے لیتا رہا۔ میری نیند اڑ گئی تھی اور شراب نے اسے سلا دیا تھا۔ صبح میں نے اپنے کمرے سے نکل کر دیکھا، وہ اسی طرح فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنا اور تمہارا تمام سامان سمیٹا۔ فون کر کے ٹیکسی کو بلایا۔ پھر تمام سامان باہر نکل کر اس کاٹج کو لاک کر دیا۔ مراد کی جیب سے کاٹج کی دوئوں چابیوں نکال لیں۔ چیچے کچن کا دروازہ ہے۔ اسے بھی باہر سے لاک کر دیا ہے۔ وہ اب کاٹج سے نہیں نکل سکے گا۔ اگر نکل سکتا تو اب تک میرا پیچھا کرتا ہوا میل پیچھا جاتا۔“ کامران اس کے بھونپن پر مسکرایا۔ پھر کہنے لگا۔

”میں تمہیں ڈاکٹر جان ہنز کا فون نمبر تھا رہا ہوں۔ اس سے رابطہ قائم کرو۔ اسے مختصر حالات بتاؤ اور یہاں آنے کے لیے کہو۔ اس کے ذریعے مجھے فوراً چھٹی مل جائے گی۔ مراد کاٹج میں بند رہ کر زخمی درندے کی طرح غرا رہا ہو گا۔ ڈاکٹر ہنز اسے تھوکر سے کہے گا۔“ اس کی بات ختم ہوتے ہی ڈاکٹر ہنز دروازے پر نظر آیا۔ اس نے وہیں سے مونہ پر ایک نظر ڈالی۔ پھر تیزی سے چلا ہوا اس کے قریب آ کر بولا۔ ”مجھے مراد نے فون کے ذریعے بتایا ہے، تمہاری بیوی اسے کاٹج میں بند کر کے چلی آئی ہے۔ وہ مجھے میں پیچ رہا ہے۔ دباڑ رہا ہے۔ آخر اسے لاک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

مونانے پہلے تو گھوڑی سے ڈاکٹر کو دیکھ کر پھر بڑے قہقارے سے پوچھا۔ ”ڈاکٹر! جنگلی درندوں کو بچھروں میں کیوں بند کیا جاتا ہے؟ ایک جونی انسان کو سلاخوں کے پیچھے کیوں رکھا جاتا ہے؟“

”میں جانتا ہوں، مراد نے کوئی غلطی کی ہو گی لیکن.....“

مونانے بات کٹ کر کہہ۔ ”لیکن آپ حالات پوری تفصیل کے ساتھ نہیں جانتے۔ اتنا ہی سمجھ لیجئے پچھلی دو راتیں میں نے جس طرح اپنی عزت کی حفاظت کرتے ہوئے گزار دی ہیں، شاید کوئی دوسری عورت ہوتی تو حوصلہ ہار جاتی اور تمہارے مریض کی ہوس کا نشانہ بن کر رہ جاتی۔ میری تقدیر اچھی تھی یا بد؟ پھر اچھی تھی، میں بچ کر چلی آئی۔

آپ وہاں جائیں اور کاٹج کھول کر دیکھیں۔ آپ کو وہاں شراب کی بوتلیں ملیں گی۔ چاقو ملے گا اور مونہ لیزا کی تصویر زخمی نظر آئے گی۔ شاید وہ نشے کی زیادتی کے باعث تصویر کی جگہ مجھے دیکھ رہا تھا، مجھ پر حملے کر رہا تھا۔ اس کی بڑبڑاہٹ سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔ اگر واقعی میں اس تصویر کی جگہ ہوتی، یہی کچھ ہوتا۔“

ڈاکٹر سر جھکا کر سوچنے لگا۔ پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مراد بہت اور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ لاعلاج نہیں ہے۔ مجھے آپ دونوں کا تعاون چاہیے۔“

”محاف کیجئے گا ڈاکٹر! میں کسی صورت میں اس کے لیے تعاون نہیں کروں گی۔ میں تو اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“

کامران نے کہہ۔ ”ڈاکٹر! آپ اسے اس طرح ٹسٹ کریں کہ مونہ کو اس کے سامنے نہ جانا پڑے۔“

”تم اس کے دوست ہو، میرے ساتھ بھرپور تعاون کرو۔ میں کو شش کرتا ہوں اس سے مونہ کا سامنا نہ ہونے پائے۔ مونہ کو کسی ہوش و دماغ میں چھوڑ دیا جائے۔“

”میں کیس نہیں جاؤں گی۔ بیٹے فورڈ میں میرے شوہر کی رہائش گاہ ہے۔ میں وہیں رہوں گی۔“

”مزے کامران! میں سمجھتا ہوں، تم کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہتیں لیکن عورتوں پر تو کر سکتی ہو؟ یہاں عورتوں کے بہت سے ہوش ہیں۔ تم چند دن کے لیے وہاں رہ سکتی ہو۔“

مونانے اعتراض کرنا چاہتی تھی۔ کامران نے اسے سمجھایا۔ ”گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ عورتوں کے ہوش میں اجازت کے بغیر کوئی مرد داخل نہیں ہو سکتا۔ صرف میں تمہاری اجازت سے ملنے آ سکتا ہوں۔“

کامران نے سمجھا تو وہ سمجھ گئی۔ ڈاکٹر ہنز نے پہلے تو کامران کو ہسپتال سے چھٹی دلائی۔ پھر دونوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن گیا۔ وہاں کے لاکر سے سامان لیا۔ پھر مونہ کے لیے عورتوں کے ایک اچھے سے ہوشل، میں جگہ حاصل کی گئی۔ وہ اس ہوشل کے ماحول سے مطمئن ہو گئی۔ اسے اچھی طرح اطمینان دلانے کے بعد وہ دونوں

کالج میں پہنچے۔ جب ڈاکٹر کی کار کالج کے سامنے آ کر رکی تو مراد اندر سے دروازے کو پیٹ رہا تھا۔ یقیناً اس نے کار کی آواز سن لی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دروازہ اب ضرور کھلے گا، وہ بے صبری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ بہر حال ڈاکٹر ہنتر نے دروازے کو کھول دیا۔ اس کے کھلتے ہی مراد نے کامران کو دیکھا۔ پھر ایک دم سے چپ ہو گیا۔ دونوں دوستوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائی رہیں۔ کامران نے بڑی آہستگی سے 'بڑی نرمی سے پوچھا۔ "مراد! یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، اس پر مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ کیوں کہ میں تمہاری دوستی پر اب بھی اندھا اعتماد کرتا ہوں۔"

وہ غرا کر بولا۔ "یہ اس وقت کہہ دو اگر اعتماد کرتے تو اسے چمپا کر نہ آتے۔ کمال ہے وہ؟ وہ سمجھتی ہے، مجھے بند کر کے جانے گی تو میں نکل نہیں سکتا گا۔ اس کا بیچھا نہیں کر سکتا گا۔ آخر وہ بھاگ کر کمال جانے کی؟ کیا سمندر میں ڈوب کر مرے گی؟"

ڈاکٹر جان ہنتر نے آگے بڑھ کر اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "دراختل ہے ذرا آرام سے،" انہیں مسٹر مراد اندر آ جائیں۔ ہم سہولت سے بات کریں گے۔"

مراد نے ڈاکٹر کا ہاتھ اپنے شانے پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "وہ سہولت سے کیا بات کر سکتا ہے جس کی بیوی گھر سے بھاگ گئی ہو؟"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"کیا غلط کہہ رہا ہوں؟ کیا مونا میری بیوی نہیں ہے؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ تمہاری بیوی نہیں ہے۔ تمہاری کوئی نہیں ہے۔"

"اور ڈاکٹر! تم بھی اچھی طرح جانتے ہو،" یہاں کے قانون کے مطابق وہ میری بیوی ہے۔ ہاں میری بیوی ہے۔ اس سلسلے میں کوئی مجھے چیلنج نہیں کر سکتا۔ کیوں کامران تم کر سکتے ہو؟"

"مراد! دوستی میں کبھی ایک دوسرے کو چیلنج نہیں کیا جاتا۔ میں دوست کی حیثیت سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"میں بھی دوست کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں۔ میں نے تمہارے لیے بے شمار

قریبائیاں دی ہیں۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت پیش آئی، میں ہر طرح تمہارے کام آیا۔ آج مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ اگر مونا میری زندگی میں آ جائے تو شاید مجھے دواؤں کی ضرورت نہ پڑے۔ کیوں ڈاکٹر! کیا میں غلط کہتا ہوں؟"

"درست کہتے ہو،" لیکن دوا حاصل کرنے کے لیے کسی کو جسمانی طور پر ہلاک کر ڈالنا یا اخلاقی طور پر بار ڈالنا انسانیت کے خلاف ہے۔ ایسی بات کرو جو انسانیت اور تہذیب کے عین مطابق ہو۔"

"کیا یہ بات تہذیب کے خلاف نہیں تھی کہ میں نے ایک دوست کی خاطر اپنے باپ دادا کے نام سے، اپنے خاندان سے، اپنی ذات برادری سے انحراف کیا۔ ان کی عظمتوں سے انکار کیا اور کامران مرتضیٰ کا نام اختیار کیا۔ اس وقت آپ لوگوں نے مجھے تہذیب کے حتمی نہیں سمجھا۔ مونا بھی عورت جو سماج سے ہے لیکن اس نے سماج کی ایک رات نہیں گزار دی۔ یہ شادی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر اس کی زندگی سے کامران نکل جائے اور میں اسے اپنا لوں تو کون سی خلاف تہذیب بات ہوگی۔ کیا صرف اس لیے کہ ایک بار اس کا نکاح کامران سے پڑھایا گیا ہے؟"

یہی سمجھ لو۔"

"یہ سمجھ بھی لوں تو دوسری بار وہ میری منکوحہ سلاتی ہوگی یہاں پہنچی ہے، پھر تہذیب کمال دی۔ تم دونوں کس تہذیب کی باتیں کر رہے ہو؟"

کامران نے دھمکے لہجے میں کہا۔ "محبت اور جنگ میں کبھی خلاف قاعدہ اور کبھی خلاف تہذیب چلی جاتی ہیں۔ ہم نے بہت مجبور ہو کر تمہارا سہارا لیا۔ سہارا لینے کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ ہم نے مونا کو تمہاری منکوحہ بنا دیا ہے۔ ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم عورتوں سے نفرت کرتے کرتے اتنی جلدی مونا کی طرف مائل ہو جاؤ گے۔"

اس نے انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کامران! یہ تم ہو۔ یہ ڈاکٹر ہیں۔ تم دونوں نے مل کر میری زندگی میں ایک عورت کو لانے کی کوششیں کیں۔ تم دونوں نے لیڑا اور شہانہ کی سفارشیں کیں لیکن دل اسی پر آتا ہے جو دل کو بھاجاتی ہے۔"

اندرو اسے یہاں نہیں لاؤ گے تو میں اپنا بیوی کے اغوا ہونے کی رپورٹ درج کراؤں گے۔
ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو مراد؟ اس کا مطلب سمجھتے ہو۔ پولیس والے
مونا کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ اسے تلاش کریں گے۔ وہ مل جائے گی تو اس سے پوچھا جائے
گا اسے کس نے اغوا کیا تھا۔ وہ کس کے ساتھ گئی تھی۔ پھر اس کے بیان کے مطابق
کامران بھی قانون کی گرفت میں آئے گا۔“

”اسی لیے وقت سے پہلے سمجھا رہا ہوں، اسے دو گھنٹے کے اندر لے آؤ۔ اگر
پولیس پیچھے پڑ گئی تو وہ اغوا کالیں ہو گا۔ اگر مونا نے بیان دے دیا کہ وہ اپنی مرضی سے
کامران کے ساتھ گئی تھی تو پھر یہ بھی بیان دے گی کہ وہ مجھ جیسے شوہر کے ساتھ رہنا پسند
نہیں کرتی۔ شاید مجھ سے طلاق لیتا چاہتی ہے۔ میں نے اگر طلاق دی تو اس ملک میں اس
کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہو گی۔ اسے یہاں سے واپس جانا ہو گا۔“

کامران دونوں باتوں سے سر ہٹا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر کہنے لگا۔ ”مراد مجھے تم
سے ایسی توقع نہیں تھی۔ تم ہمیں معیتوں میں جلا کر لے جاتے ہو۔ ہمیں کیا مل جائے گا؟
کیا مونا مل جائے گی؟ مرکز نہیں۔ خدا کی قسم وہ ایسی عورت نہیں ہے۔ وہ اپنی جان دے
دے گی مگر تمہارا سایہ بھی اپنے آپ پر نہیں پڑے دے گی۔“

”تم مجھے خبیث کر رہے ہو اور غصہ دلا رہے ہو۔ میں اسے حاصل کر کے رہوں
گا۔“

ڈاکٹر ہنسنے کہہ۔ ”تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارا دوست کامران کتنا بد نصیب ہے
اپنی بیوی کے ساتھ ساگ رات بھی گزار نہ سکا۔ وہ یہاں آئی تو یہ ہسپتال پہنچ گیا۔ آج
ہسپتال سے آیا ہے تو تم ایسی دیوار بن گئے ہو جسے یہ گرا نہیں سکتا۔“

”ڈاکٹر تم صرف ڈاکٹر کی حیثیت سے بات کر دو۔ میں تمہارا مریض ہوں۔ تم اپنے
مریض کی مجبوریوں کو سمجھو۔ مجھے ایک مونا ملی ہے۔ کامران کو مونا جیسی کئی لڑکیاں مل
سکتی ہیں۔ اگر میں ایسا کیا کرنا ہوتا تو آج میں لیزا یا شبنم میں سے کسی ایک کو اپنا چکا ہوتا
لیکن ٹیڈ کے بعد ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ اب مونا پر دل آیا ہے۔ تم اچھی طرح سمجھتے
ہو، میرا علاج صرف مونا ہے۔“

”اگر تم محبت کی بات کرتے ہو تو محبت کے حوالے سے ہی سمجھو۔ جسے میں نے
دل دیا وہاں سے چلا اور جو مجھے دل دیا وہاں سے چاہتی ہے، وہ تمہیں بھی دے گی ہی محبت کیسے
دے سکتی ہے۔ اب رہ گئی میری دوستی کی بات تو دوست ہر طرح کی قربانی دیتے ہیں۔ اپنی
جان پر بھی کھیل جاتے ہیں لیکن اپنی گھریلو عزت کا نہ تو سودا کرتے ہیں، نہ اسے جبراً کسی
دوست کے حوالے کرتے ہیں۔ یہ مونا کے دل کا معاملہ ہے۔ اگر حالات ایسے ہوتے کہ وہ
مجھے پسند نہ کرتی، تمہیں پسند کر لیتی تو خدا کی قسم میں اس سے دستبردار ہو جاتا لیکن مراد
دل کے معاملات کو سمجھو۔ میں اپنا سب کچھ تم پر قربان کر سکتا ہوں، تمہاری خاطر مونا کا
دل نہیں پھیر سکتا۔“

”دل کے معاملات نے مجھے بڑا دھوکہ دیا۔ میں سمجھتا تھا، ٹیڈ مجھے دل سے چاہتی
ہے۔ کسی اور کی طرف مائل نہیں ہو گی لیکن وہ میرے بھائی کے کاروبار کی طرف مائل
ہو گئی۔ اس نے دل کو نہیں دیکھا دولت کو دیکھا۔“

”مونا ایسی نہیں ہے۔“

”تم کیا جانو؟ وہ کیسی ہے۔ رفتہ رفتہ عورت کے پر پڑے نکلتے ہیں۔ میں اسے اپنی
طرف مائل کر سکتا ہوں۔ دل کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ہمارے مشرق میں ایسی بے شمار شہلیاں
ہوتی ہیں، جہاں دل کے معاملات نہیں ہوتے۔ صرف ان دیکھے رشتے ملے ہوتے ہیں۔
ہونے والے میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتے ہیں لیکن شادی کے بعد
دونوں کے دل مل جاتے ہیں۔“

کامران نے کہہ۔ ”میں اتنا جانتا ہوں، ایک تماکزور عورت کو پردیس میں بلا کر
پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے راستے سے اسے ہٹانا اور اپنی طرف مائل کرنا سراسر
زیادتی ہے۔“

”زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ صاف طور سے آخری بات کہہ دو کہ دوست کی خاطر مونا
سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔ تم میں عرف نہیں ہے۔ تم دوستی بھانا نہیں جانتے۔“

”یہی سمجھ لو۔“

”پھر تم بھی سمجھ لو، مونا کو مجھ سے چھین کر نہیں لے جا سکو گے۔ اگر دو گھنٹے کے

”علاج میں کرتا ہوں‘ دو آئیں میں تجویز کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں‘ تمہارے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نقصان دہ ہے۔“

”مجھے صرف اتنا سمجھا دو کہ موتا میرے لیے نقصان دہ کس طرح ہے؟“

”وہ تمہاری طرف مائل نہیں ہے۔ یوں تمہارے دل پر دوسرا زخم لگے گا۔ ایک زخم ٹہینہ دے چکی ہے۔ موتا بھی تم سے محبت نہیں کرے گی۔ پھر تمہارے دل اور دماغ میں نفرت کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ اسی لیے کہتا تھا‘ جو لڑکیاں تم سے محبت کرتی ہیں‘ ان کی قدر کرو۔ ان میں سے کسی ایک کو اپنا لو مگر تم کل بھی بھنڈے تھے‘ آج بھی بھنڈے ہو اور ضدی مریض کا علاج بہت مشکل سے ہوتا ہے۔“

”تم بہت ہار چکے ہو تو کوئی بات نہیں ہے۔ تمہارے لیے مریض بہت ہیں۔ میرے لیے ڈاکٹروں کی کمی نہیں۔ کوئی دوسرا ماہر نفسیات میرے لیے نسخے میں موتا کو تجویز کرے گا۔“

کامران کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے کہا ”تم نہیں سمجھو گے۔ اپنی ضد پر قائم رہو گے۔ میں جا رہا ہوں۔ تم سے جو ہو سکے وہ کر لیتا۔“

ڈاکٹر نے ہاتھ اٹھا کر اس کا راستہ روکے ہوئے کہا ”معمود‘ تم جہاں بھی جاؤ گے‘ میں تمہیں اپنی گاڑی میں پہنچا دوں گا۔ پہلے تم یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ مراد تمہیں کتنی مصیبتوں میں مبتلا کر سکتا ہے۔ میں وہ اس کی قانونی پیروی ہے۔ تم اسے کہیں نہیں لے جا سکو گے۔“

”ڈاکٹر! ایک بات تم دونوں بھول رہے ہو۔ جب بے موت مرنا ہو تو بزدل مرتے ہیں جو مقابلے کا حوصلہ رکھتے ہیں‘ وہ لڑتے لڑتے مرنا پسند کرتے ہیں۔ اگر ہم ڈویں گے تو مراد کو بھی لے ڈویں گے کیوں کہ مراد بھی ہمارے برابر مجرم ہے۔ اس نے یہاں کی حکومت کو دھوکا دیا ہے۔ موتا اس کی پیروی نہیں ہے۔ اس نے امیگریشن کے قوانین سے کھینچنے کے لیے اسے پیوی بنا کر پیش کیا ہے۔ میں پاکستانی نکاح نامے کے ذریعے اس کا فروغ ثابت کر سکتا ہوں۔ اس طرح صرف میں اور موتا نہیں یہ بھی ہمارے آہنی سلاخوں کے پیچھے جائے گا۔“

مراد نے طنزیہ انداز میں کہا ”تم تو بڑے محب وطن بنیتے ہو۔ پاکستان کے گن گاتے ہو۔ لوگوں سے کہتے ہو‘ ہم غیر ممالک میں جا کر صرف ذمہ داری نہیں کھاتے بلکہ غیر سرکاری طور پر اپنے ملک کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ کیا نمائندگی اس طرح کی جاتی ہے کہ اپنی پیوی کو دوسرے کی پیوی بنا کر یہاں بلایا جائے۔ اگر یہ بات اخبارات میں شائع ہو گی تو تمہاری کتنی نیک نامی ہوگی۔ تم اخلاق سے گر کر اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہو؟“

”مراد! تم بھی پاکستانی ہو۔ پہلی غلطی میں نے کی۔ امیگریشن کے قانون کے خلاف اپنی پیوی کو یہاں بلایا۔ دوسری غلطی تم کر رہے ہو۔ تم پرانی پیوی کو اپنی پیوی کہہ رہے۔ کیا تم پاکستانی نہیں ہو؟ کیا تم اپنے ملک کی نمائندگی نہیں کرتے ہو۔“

”بے شک ہوں۔ اسی لیے تمہیں ڈھیل دے رہا ہوں۔ تمہیں موقع دے رہا ہوں۔ تم نے اپنی پیوی کو میری پیوی بنا کر جو غلطی کی ہے‘ اس غلطی کو درست کر لو۔ میری ہی پیوی رہنے دو۔ اس سے دستبردار ہو جاؤ۔ غلطی کون نہیں کرتا۔ ہر شخص کرتا ہے۔ ہر قوم کے‘ ہر ملک کے لوگ کرتے ہیں۔ ہم نے بھی کی ہے۔ ہماری غلطی اس صورت میں نظر انداز کی جاسکتی ہے کہ ہم اسے درست کر لیں۔ اس کا ایک ہی راستہ ہے۔ جو میں بنا رہا ہوں۔ یہاں برطانیہ کے قانون کے مطابق جب بے طے پا گیا ہے کہ وہ میری پیوی ہے تو اسے میری پیوی رہنے دو۔“

”لیکن پاکستان کے قانون کے مطابق‘ مذہب کے مطابق‘ شرعی طور پر وہ میری پیوی ہے۔ میری پیوی رہے گی اور تمہیں تسلیم کرنا چاہیے‘ تمہیں کہ تم بھی مسلمان ہو۔“

”فضول بحث ہے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ میں آخری بات کہتا ہوں۔ جس ملک میں ہو‘ اسی ملک کے قانون کی بات کرو۔ بڑے سے بڑا مقدمہ ہو یا چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ ہو اسے یہاں کے قانون کے مطابق طے ہونا چاہیے اور ہمارا مسئلہ یہیں کے قانون کے مطابق طے ہو گا۔“

”میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم اپنی ضد سے باز نہیں آؤ گے۔“

”خدا تم کو رہے ہو۔ میں نے جو مصلحت دی ہے‘ اس کے مطابق اسے میرے پاس پہنچا دو‘ ورنہ قانون کے محافظ اسے ڈھونڈ نکالیں گے اور میرے پاس لے آئیں گے۔“

”ایک دوست پر بھروسہ کر کے اپنی بیوی کے نام کو اس سے منسوب کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کی عزت کو بھی منسوب کر دیا گیا ہے۔ کوئی اپنی خوشی سے اپنی عزت کسی کے حوالے نہیں کرتا۔ اگر مونا کو تمہارے سامنے سے بچانے کے لیے مجھے جان پر کھیلنا پڑے تو میں کھیل جاؤں گا۔ قانون سے تو ہم کھیل ہی رہے ہیں۔ اس کے لیے مجھے آپنی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑا تو میں مونا کے ساتھ جاؤں گا لیکن تمہاری دوستی پر تو کوئی رہوں گا۔“

یہ کہتے ہوئے وہ جانے لگا۔ مراد نے کہا۔ ”ایک بات سن لو۔ میری دی ہوئی سلت کے مطابق وہ مجھے نہ ملی تو کل صبح کے اخبارات ہم تینوں کے فراڈ کی داستان سنائیں گے۔ میں بھی سزا پاؤں گا لیکن آج تیرے گھنے کے بعد سے تم دونوں کو کبھی ایک جگہ رہنے نہیں رہنے دوں گا۔ کبھی ایک ساتھ نہیں رہنے دوں گا۔ اور اس لمحہ سے میری دشمنی کو آزمائو۔“

وہ باہر آگیا۔ اسے صحن محسوس ہو رہی تھی۔ ایک آدھ زخم سے ہلکی ہلکی ٹیسس اٹھ رہی تھیں۔ پھر بھی وہ غصے میں تھا۔ زندگی میں پہلی بار دوستی کا زخم کھاکر دوست کے گھر سے نکل رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کیا کرے۔ مونا کی حفاظت کس طرح کرے؟ اس نے غصے میں مراد کا چہنچہ قبول کیا تھا لیکن سمجھ رہا تھا۔ ”آئندہ مونا کے ساتھ ایک منٹ بھی کہیں سکون سے نہیں گزار سکے گا۔“

وہ باہر آکر ایک کچی نما راستے سے آہستہ آہستہ گزرنے لگا۔ ایک ہی بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ مونا کو ایسی جگہ چھپا کر رکھے جہاں مراد کی رپورٹنگ کے مطابق پولیس والے نہ پہنچ سکیں اور مونا محفوظ رہے۔ وہ جی اہم الزام آنے کی بات تو مراد کبھی یہ ثابت نہیں کر سکے گا کہ کامران نے مونا کو اغوا کیا ہے۔

ڈاکٹر ہنری گاڈی اس کے قریب آکر رک گئی۔ وہ کھڑکی سے جھانکتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا۔ اس حالت میں ہیڈل نہ چلانا۔ میں تمہیں پہنچا دوں گا۔ چلو آؤ۔“ وہ اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے گاڈی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ہم اپنے لئے مسائل خود پیدا کرتے ہیں۔ میں مانتا ہوں۔ مسائل حالات کے تحت بھی پیدا

وٹے ہیں لیکن اس میں ہماری تمہاری ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں۔ جیسا کہ اب مونا کے ٹیلے میں ہو رہا ہے۔ تم دونوں ہی دوست اسے یہاں بلائے اور مسائل پیدا کرنے کے لئے اسے وار ہو۔“

”ڈاکٹر! پلیز اسے دوست نہ کہو۔“

”میں دشمن بھی نہیں کہہ سکتا۔ تم دونوں ایک ہی ملک سے تعلق رکھتے ہو۔ ہمارے ملک کے قانون سے کھیلنے کھیلنے آپس میں دشمنی کر بیٹھے۔“

کامران خاموش رہا۔ وہ جواب دیا کہ سکتا تھا جبکہ حقیقتاً یہی ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”اس لیے ہمارا ملک انٹرنیشن کے قوانین میں بڑا سخت ہے۔ لوگ قریب دیتے ہیں۔ طرح طرح کے چور راستے اختیار کر کے یہاں آتے ہیں۔“

”سوال یہ ہے کہ لوگ چور راستے کیوں اختیار کرتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ سیدھا راستہ نہیں ملتا۔ سیدھے راستے پر جب بھی پہرے بٹھائے جائیں گے، آدمی نقب لگائے گا۔ یا پھر چور راستے اختیار کرے گا۔ ڈاکٹر، جس وقت کوئی ڈوب رہا ہو تو صیحت کام نہیں آتی۔ عمل کام آتا ہے۔ ہاتھ بڑھا کر اسے سہارا دے کر ڈوبنے سے بچانا چاہیے۔ کیا تم کسی طرح نہیں بچا سکتے ہو؟“

”ایک ہی راستہ ہے۔ قانون کے محافضوں کے سامنے اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیا جائے۔ مونا کسی وکیل کی خدمات حاصل کر کے تحریری بیان دے سکتی ہے کہ وہ قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر آئی تھی۔ اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ اس لیے واپس جانا چاہتی ہے۔“

”ہو سکتا ہے اسے یہاں کا قانون معاف کر دے، اور اسے واپس بھیج دے لیکن یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے اسے حراست میں لیا جائے گا۔“

”میں اس کی طرف سے ضمانت قبول از گرفتاری پیش کروں گا۔“

”اس طرح یہ بات پریس تک پہنچے گی۔ اخبارات کے ذریعے عام ہو گی۔ ہم اس ملک میں بھی بدنام ہوں گے اور ہمارے ملک کے لوگ بھی ہمیں معاف نہیں کریں گے۔“

”پھر تو کوئی صورت نہیں ہے۔ یہ مت سوچ کہ موناکو چھپاتے بھڑگے تو کامیاب ہو جاؤ گے۔ جب مراد اس کے خلاف رپورٹ درج کرائے گا تو پولیس والے یقیناً اسے تلاش کرتے ہوئے عورتوں کے ہوسٹلوں میں پہنچیں گے وہاں موناکو پائیں گے۔“
وہ ہوسٹل پہنچ گئے۔ وہاں ایک ملاقاتی کرے میں موناکو سے ملے آئی۔ کامران نے اسے مراد کے متعلق بتایا۔ اس کا پہنچنے سننے کے بعد موناکو نے کلمہ ”یوں لگتا ہے ہم نے شادی نہیں کی“ بہت بڑی غلطی کی ہے جس کی سزا ہمیں مستقل دل رہی ہے۔“
ڈاکٹر نے کلمہ ”ہمارے ملک کے قانون سے کھیل کر تو واقعی غلطی کی ہے۔“
کامران نے کلمہ ”جسٹ کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ہمیں فوراً ہی کسی نتیجے پر پہنچنا چاہیے۔“

”میں خود کو گرفتاری کے لیے پیش کروں گی لیکن اس کو خوش ہونے کا موقع بالکل نہیں دوں گی۔“
ڈاکٹر نے کلمہ ”میں نے کامران کو یہی مشورہ دیا ہے۔ تم یہاں قانون کے مخالفوں کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرو۔ ایک وکیل کی خدمات حاصل کرو۔ میں تمہیں گرفتار ہونے نہیں دوں گا۔ اس سے پہلے ہی ضمانت پیش کروں گا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔“
کامران نے کلمہ ”میں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتا جس سے ہمارے ملک کی اور ہماری بدنامی ہو۔ ایک سیدھی سی بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ موناکو یہاں سے فوراً واپس بھیج دوں۔“

وہ بے اختیار نہیں نہیں کے انداز میں سر ہلا کر بولی۔ ”میں واپس نہیں جاؤں گی۔ بڑی مشکلوں سے تمہارے قریب آئی ہوں۔ کیا پھر مجھے سات سمندر پار بھیج دو گے۔ کیا میرے نصیب میں یہی جدائیاں لکھی ہیں۔ کیا اسی لیے میں نے شادی کی تھی؟“

”تم پہلی عورت نہیں ہو جو اپنے شوہر سے بچھڑ رہی ہو۔ لندن میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے میاں بیوی ہیں جو برسا برس سے بچھڑے ہوئے ہیں۔ بے چارہ میاں ادھر پاکستان رہتا ہے، بیوی ادھر ملن کے سینے دیکھتی رہتی ہے۔ سال میں ایک بار عید آتی ہے۔ بیوی کی زندگی میں دو سال، چار سال، جانے کتنے سالوں بعد میاں کی صورت میں عید کی

فوشیاں ملتی ہیں۔ شوہر کو چھٹی ملتی ہے۔ فرصت ملتی ہے یا اتنی رقم جمع ہوتی ہے تو وہ اپنے وطن جا کر اپنی بیوی سے ملاقات کر سکتا ہے۔ پھر بچے ہوتے ہیں تو اور مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ان بچوں کو اپنے ملک میں مل کا سایہ تو ملتا ہے مگر باپ کا سایہ نصیب نہیں ہو سکتا۔ وہ بیٹھ پر کسی باپ کے متعلق سننے ہیں مگر اسے دیکھنے بہت کم ہیں۔“
کامران نے کلمہ ”دنیا کے تمام میاں بیوی اپنے اپنے مسئلے کا شکار ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے مسئلے پر غور کرنی چاہیے۔“

موناکو نے کلمہ ”جب اپنے پاؤں میں کانٹا چبھتا ہے، تو احساس ہوتا ہے کہ دوسرے کتنی لذت میں مبتلا ہوں گے۔ ہماری تو ابھی ابتدا ہے۔ دوسرے نہ جانے کتنی اتنا کو پہنچ رہے ہیں۔ مجھے ہوسٹل میں آکر معلوم ہوا ہے۔ اس شرمیں ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی بیوی کو یہاں بلانے کے انتظار میں پوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو بالکل مایوس ہو چکے ہیں اور اب گمراہ ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں غم غلط کرنے کے لیے شراب ہے۔ دل بھلانے کے لیے طرح طرح کے کلب ہیں۔ راستہ چلتے لڑکیاں مل جاتی ہیں۔ کیا میں یہ پسند کروں گی کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ۔“

کامران نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ آنکھیں کھ رہی تھیں۔ جن عورتوں کے شوہر انھوں سے نکل چکے ہیں، ان سے چارویں کے دلوں پر کیا گزر رہی ہو گی؟ ان کا دکھ میرا دکھ ہے۔ ان کی آنکھوں میں انتظار کا جو کرب ہے، وہ میرا کرب ہے۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ ماناکو غیر قانونی طور پر آئی ہوں لیکن یہاں رہ کر تمہیں اپنی نگاہوں میں رکھ سکوں گی۔ تمہیں بھٹکنے نہیں دوں گی۔ میں کبھی یہاں سے نہیں جاؤں گی۔“

”دوسروں کی گمراہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں بھی تمہیں بھول جاؤں گا۔ میں ایسا نہیں ہوں۔“

”دوسروں نے جب اپنی عورتوں سے شادی کی تو وہ بھی ایسے نہیں ہوں گے۔ وہ اپنی بیویوں سے محبت کرنے والے شوہر ہوں گے۔ یہاں ہزاروں میل کی دوری نے، مجبوری نے اور حالات نے انہیں بھٹکا دیا۔ میں تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“

پھر اس نے ڈاکٹر سے پوچھ ل ”مراد آپ کا مریض ہے۔ کیا آپ اسے کچھ عرصے تک قابو میں نہیں رکھ سکتے؟“
 ”میں ایسا کر سکتا ہوں لیکن وہ جب بھی تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھے گا تو رقابت کی آگ میں جلتے لگے گا۔“

”یوں بھی تقدیر اور حالات مجھے میرے شوہر سے جدا کرتے آرہے ہیں۔ مراد بھی یہی چاہتا ہے تو کچھ عرصہ ان سے الگ رہوں گی۔ میںیں ہو سٹل میں رہوں گی۔ ان سے نہیں ملوں گی۔ کیا مراد ایسی صورت میں مجھے سکون سے رہنے دے گا۔“
 ”ایسی صورت میں ممکن ہے لیکن تم کچھ عرصہ تنہا رہ کر کیا کرو گی؟“

”مجھے جتنا بھی وقت ملے گا‘ ہفتے‘ مہینے‘ سال‘ دو سال یہاں تنہا رہوں گی۔ کوئی ملازمت کر، گی۔ پھر اخبارات کے ذریعے ان ہزاروں مظلوم عورتوں کی حمایت میں آواز اٹھاؤں گی جو اپنے شوہروں سے چھڑی ہوئی ہیں اور ان کے انتظار میں اپنے اپنے ملکوں میں رہ کر بوڑھی ہوئی جا رہی ہیں۔ میں وہاں ہسپتال میں ملازمت کرتی رہی تھی۔ کیا آپ کے ذریعے یہاں ہسپتال میں ایک نرس کی حیثیت سے ملازمت مل سکتی ہے؟“
 ”مل جائے گی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔“

”پرویس میں ایک تو مراد آپ کے قابو میں رہے اور آپ کے ذریعے مجھے ملازمت مل جائے تو اس سے بڑا احسان کیا ہو سکتا ہے؟ میں یہ احسانات کبھی نہیں بھولوں گی۔“
 ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”مشرکامران! میں باہر انتظار کر رہا ہوں۔“
 وہ کمرے سے چلا گیا۔ کامران نے مونا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پوچھ ل ”تم یہاں تنہا رہو گی۔ میں تمہارے بغیر کیسے رہ سکتا ہوں؟“

”کیا میرا سوال ہے؟ میں تمہارے بغیر کیسے رہ سکتی ہوں لیکن حالات نے ہمیں مجبوری اور بے بسی کی زندگی گزارنا سکھا دیا ہے۔ ہم یونہی گزاریں گے۔“
 ”یہ تو بڑی مشکل ہے۔ میں تم سے ملنے آؤں گا اور مراد کو معلوم ہو گا تو وہ انتقام کا رونا دہائی کرے گا۔“

”میں تم سے اچھا کرتی ہوں‘ یہاں نہ آؤں ہم ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ قائم کر لیں

گے لیکن ایک دوسرے کے سامنے نہیں آئیں گے۔ میں نے اپنے دل کو پتھر بنا لیا ہے۔ میں وہ بد نصیب ہوں جو اپنی زبان سے اپنے شوہر کو آنے سے منع کر رہی ہوں۔ اسے ملنے سے روک رہی ہوں۔“

اس کی آنکھیں پینچنے لگیں۔ پہلے وہ ایسی باتوں پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی تھی۔ اب اس حد تک صبر کیا تھا کہ بے اختیار آنسو نہیں بہتے تھے۔ آنسوؤں کو ضبط کرنا‘ دل کو مضبوط کرنا آ گیا تھا۔

وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ اب تک تقدیر نے اتنی رعایت کی تھی کہ انہیں ایک دوسرے کے ہاتھوں کو تھامنے کا موقع دیتی رہی تھی۔ آج کے بعد یہ موقع بھی ہاتھ سے جا رہا تھا۔ اب شاید کامران اسے دور سے دیکھ سکے گا اور اگر دشمن بننے والے دوست نے اس کا بھی موقع نہ دیا تو شاید مونا کو صرف سن سکے گا۔ صرف فون کے ذریعے

وہ دل پر پتھر رکھ کر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ مونا کا دل اس وقت خوب رونے کو چاہتا تھا لیکن وہ اپنے دل کو سمجھا رہی تھی۔ آج تک رو کر کیا ملا جواب ملے گا۔ وہ آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کے چند قطرہوں کو آنچل سے پونچھتے ہوئے اپنے ہو سٹل کے کمرے میں آئی۔ اس کمرے کے چار گوشوں میں چار پینک بجھے ہوئے تھے۔ مونا کے علاوہ وہاں تین اور ایشیائی عورتیں تھیں۔ انگریز عورتیں شاید اس لیے نہیں تھیں کہ مزاج نہیں ملتے ہوں گے۔ کچھ کمرہ میں یورپی ممالک کی عورتیں تھیں۔ مونا کی ہم طبقہ عورتوں میں سے ایک کا تعلق بنگلہ دیش سے تھا۔ اس کا نام لی بانو تھا۔ لی بانو کی شادی ڈیڑھ برس پہلے ہوئی تھی۔ تب سے اس کا شوہر اسے یہاں بلانے کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ درخواستیں دے رہا تھا۔ اپنے سفارت خانے کے ذریعے بھرپور کوشش کر رہا تھا لیکن ملن کا کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ لی بانو اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں دو بار ہائبرڈرپ کے بہانے یہاں آ چکی تھی۔ وہ ہفتے دو ہفتے کے لیے آتی۔ اپنے شوہر کے ساتھ کچھ دن رہتی‘ پھر جلی جاتی تھی۔ اب وہ تیسری بار آئی تھی اور اچانک آئی تھی۔ کسی نے یہی خبر سنائی تھی کہ اس کے شوہر نے لندن میں کسی دوسری عورت سے

بھڑے اور کامران سے کہا تھا کہ وہ کچھ عرصے تک ہوسٹل میں رہے گی اور شوہر سے بچھڑ کر رہنے والی عورتوں کی حمایت میں آواز اٹھاتی رہے گی۔

گنگھنا کے بچے کا نام ریش پانڈے تھا۔ وہ ایک اچھا کاروباری تھا لیکن بدکردار تھا۔ گنگھنا جب بھی میل آتی تو پانڈے اپنی حرکتوں سے باز آ جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کی بیوی سختی تیز طرار ہے۔ اخبارات میں اس کا نام اچھالے گی۔ وہ دیکھتا رہتا تھا اور اس کے کالم پڑھتا رہتا تھا۔ اس جیسے کتنے ہی پانڈوں کے خلاف وہ سخت الفاظ لکھتی رہتی تھی۔

گنگھنا نے چند کافزات مونیا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم بہت ہی عمو لکھ رہی ہو۔ اگر تمہاری تحریر کے یہی تصور رہے تو امیگریشن کے موضوع پر تنہا چا دو گی لیکن ایک آدھ مضمون لکھنے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر مسلسل لکھتے کا عزم کرو اور اخبارات میں شائع ہوتی رہو تو یقیناً ہمارے شمارے دل کی بات عوام سے لے کر حکام تک پہنچے گی۔“

مونیا نے کافزات لیے۔ پھر گنگھنا کا ہاتھ محبت سے تھام کر کہا۔ ”دیدی! تم میری حوصلہ افزائی کر رہی ہو۔ میں ضرور لکھوں گی اور لکھتی رہوں گی۔ دعا کرو کہ مجھے یہاں کچھ عرصے تک رہنے کا موقع مل جائے۔“

گنگھنا اور دوسری عورتوں نے کہا۔ ”ہم سب تمہارے لیے فائٹ کریں گے۔ کون ہے وہ رضا مراد؟ ذرا ہمارے سامنے آئے۔ ہم اس سے منٹ لیں گے۔“

اسی وقت ہوسٹل کی ایک ملازمہ نے آکر کہا۔ ”مسز مونیا کامران؟ تمہارے کامران مرتضیٰ ملے آئے ہیں۔“

مونیا خوش ہو گئی کہ اس سے رخصت ہو کر جانے والا وہ نہ سکا۔ پھر اس سے ملنے آگیا۔ ملازمہ نے کہا۔ ”لیکن عجیب بات ہے۔ پہلے جو کامران مرتضیٰ آئے تھے وہ کوئی اور تھے اور یہ صاحب بھی آپ کے شوہر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ آخر بات کیا ہے؟ اس سے پہلے کہ آپ ایک ہی نام کے کسی دوسرے شوہر سے ملے جائیں، ہوسٹل کا انچارج آپ سے ضروری باتیں کرنا چاہتی ہیں۔“

گنگھنا نے کہا۔ ”میں سمجھ گئی، یہ رضا مراد ہو گا۔ تم فکر نہ کرو۔ مراد سے ملے جاؤ۔ ہم عورتیں ہوسٹل کے انچارج سے ملے جا رہی ہیں۔ ہم تمہاری طرف سے صفائی

شادی کر لی ہے۔ وہ چپ چاپ اس بات کی تصدیق کرنے آئی تھی۔ اس لیے ہوسٹل میں آکر گھبری ہوئی تھی۔

لی بانو کے علاوہ اس کمرے میں دو ہندوستانی عورتیں تھیں۔ ایک کا تعلق مدراس سے اور دوسری کا دہلی سے تھا۔ دہلی والی مسز تارا پرشاد کلماتی تھی۔ اس کے بچے کا نام جاگی پرشاد تھا۔ اس کی شادی کو تقریباً تین برس گزر چکے تھے۔ جاگی پرشاد اولاد کی طرف سے بایوس ہو گیا تھا۔ جب بھی وہ ہندوستان جاتا اور لٹا سے ملتا تو یہی کہتہ ہم دونوں میں سے کوئی بانجھ ہے، اسی لیے اولاد نہیں ہو رہی ہے۔ کبھی تارا لندن آئی تھی اور اسے یقین دلاتی تھی کہ بھگوان نے چاہا تو ضرور اس کی گود ہری ہوگی۔

بچگی باری تارا پرشاد جب اپنے بچے سے مل کر ہندوستان واپس گئی تو دو ماہ بعد پتا چلا اس کے پاؤں بھاری ہیں اور وہ ماں بننے والی ہے۔ اس نے فوراً ہی خط کے ذریعے خوشخبری اپنے بچے کو سنائی۔ لندن سے جاگی پرشاد نے خت لیے جس لکھا۔

”تم مجھے بے وقوف بنانا چاہتی ہو۔ یہاں آئی تمہیں تو کچھ نہیں تھا۔ دو مہینے کے بعد تم ماں کیسے بن رہی ہو۔ دوسرے کا پاپ میرے سر چھوٹنا چاہتی ہو؟“

یہ تارا پرشاد اپنا الزام تھا جسے وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اپنی صفائی پیش کرتے لندن آئی تھی۔ اپنے بچے سے ملاقات کرنا چاہتی تھی لیکن اس نے اپنی رہائش بدل دی تھی۔ ملاقات نہیں ہو رہی تھی۔ بے چاری کو ہوسٹل میں قیام کرنا پڑا تھا۔

مدراس والی مسز گنگھنا پانڈے کلماتی تھی۔ وہ اس کمرے میں مونیا لٹی بانو اور تارا پرشاد کے مقابلے میں عمر رسیدہ تھی۔ ان سب سے زیادہ ذہن اور تجربہ کار تھی۔ اس نے انگلش لٹریچر میں ایم اے کیا تھا۔ وہاں کے ایک انگریزی اخبار کی مستقل کالم نویس تھی۔ ان تینوں عورتوں کو حوصلہ دیتی تھی۔ ”بہت ہارنے سے کبھی منزل نہیں ملتی۔ میں امیگریشن کے سخت قوانین کے خلاف جنگ کر رہی ہوں۔ اس جنگ میں تمہا نہیں ہوں۔ ہزاروں ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی عورتیں جو ایشیا سے تعلق رکھتی ہیں، وہ سب میرے ساتھ ہیں۔ مونیا آج سے تم بھی میرے ساتھ ہو۔“

گنگھنا سے ملنے کے بعد ہی مونیا میں حوصلہ پیدا ہوا تھا۔ اسی لیے اس نے ڈاکٹر جان

پیش کریں گے۔

مونا ملاقات کے کمرے میں آئی۔ اسے دیکھتے ہی مراد زہریلے انداز میں مسکرانے لگا۔ وہ جواباً بڑی معصومیت بڑی محبت سے مسکرانے لگی۔ وہ ایک دم سے بھڑک کھڑا ہو گیا۔ مٹھیاں بچھ کر کہنے لگا۔ ”تم مجھے ابو باری ہو۔ اس طرح مسکراؤ گی تو کیا میں بھول جاؤں گا کہ تم نے مجھے میرے ہی گھر میں لاک کر دیا تھا۔“

مونانے کہ۔ ”دشمن کو ہتھیار سے مار دو وہ فوراً مر جاتا ہے۔ اس کی حالت زار پر مسکراؤ تو وہ جھٹلا کر دھیرے دھیرے مرتا ہے۔ اگر تم دھیرے دھیرے مرتا نہیں چاہتے ہو تو میری مسکراہٹ کو ایک دوست کی نظر سے دیکھو۔“

”کیا اس رات تم نے دوستی کی تھی؟“

”میں دو راتیں تمہارے گھر میں رہ چکی ہوں۔ وہاں تمہارے ارادے کیا تھے تمہاری نیت کیا تھی؟ یہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ جو کچھ میں نے کیا وہ مناسب تھا۔ مراد، تمہیں میرا احسان ماننا چاہیے۔ میں نے ان راتوں میں تمہیں شیطان بننے سے باز رکھا اور تمہیں انسان بنائے رکھا۔“

”میرا نام مراد نہیں کامران ہے۔“

”کیا تمہارے سینے میں کامران کا دل ہے۔ کیا تمہارا دماغ میں محبت کی وہ اعلیٰ ترقی ہے جو مجھے تغیر کر گئی ہے۔“

”ہاں ہے۔ تم مجھے آزنا کر دیکھو۔“

”میں تو آزنا رہی ہوں۔ تم نے مجھے نہیں آزلیا ہے۔“

”تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ میں تمہیں کس طرح آزنا سکتا ہوں۔“

”اس طرح کہ ہم دشمن کی بجائے دوست بن کر رہیں۔“

”وہ کس طرح؟“

”مجھے یہاں بوشل میں رہنے دو۔ یہ خیال دل سے نکال دو کہ تم زور زبردستی کرو گے۔ مجھے اپنی بیوی ثابت کرنے کی کوشش کرو گے تو میں گھبرا جاؤں گی۔ میں یہاں سے واپس چلی جاؤں گی۔ اپنے کامران سے نہیں ملوں گی لیکن تمہارے ہاتھ کبھی نہیں آؤں گی۔“

”کی میں کتنے مضبوط اعصاب کی عورت ہوں؟ یہ تم پچھلی دو راتوں میں آنا چکے ہو۔ آرام سے بیٹھو اور فیصلہ کرو، میں کیا کرنا چاہیے؟“

وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”کیا کرنا چاہیے؟“

”یہی کہ ہم میاں بہی ایک ہو جائیں اور ہمارے ایک ہونے کا سرا تمہارے سر بندھے۔“

”مجھے ایسا سرا پاندھنے کا شوق نہیں ہے۔“

”دوسری صورت میں ہم صرف دوست بن کر رہ سکتے ہیں۔“

وہ ذرا خوش ہو گیا۔ ”میں دوست بننے اور بنائے آیا ہوں۔ جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ۔“

”میں بھول چکی ہوں۔ ہم نئے سرے سے یہاں زندگی گزاریں گے لیکن صرف دوست کی حیثیت سے۔“

”مجھے منظور ہے لیکن ایک شرط ہے۔“

”وہ کیا؟“

”ہمارے درمیان کامران نہیں آئے گا۔“

”تو پھر تم بھی میرے اور کامران کے درمیان نہیں آؤ گے۔ تم اس پر پابندی عائد کرو گے، میں تم پر پابندی عائد کروں گی۔ دوستی کرنا چاہتے ہو تو ہم تینوں کے درمیان ہو گی۔“

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ ”میں ایسی دوستی نہیں کرنا چاہتا جس کی آؤ میں تم کامران سے مل سکوں۔ میں نادان نہیں ہوں۔ تم مجھ سے دوست کے ناطے ملو گی اور اس سے بیوی کے ناطے۔ وہ شوہر ہو گا۔ میں کٹھ پتلا بن کر رہ جاؤں گا۔“

”ہم تینوں ایک دوسرے کی موجودگی میں ملا کریں گے۔ پھر تو کوئی اعتراض نہیں گا۔“

”کامران کی موجودگی میں مجھ سے ملو گی تو تمہارا دل ادھر لگا رہے گا۔ مجھ سے صحیح طرح بات نہیں کرو گی۔ پوری توجہ نہیں دے سکو گی۔ میں جو کہوں گا اس بات کو ہوں“

ہاں کہہ کر ہاتھی رہو گی۔"

"میں اپنی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد ایک محنتہ تمہارے ساتھ تفریح کے لیے چلوں گی اور ایک محنتہ اس کے ہاتھ۔ اس طرح تم تھکائی میں مجھ سے جی بھر کر باتیں کر سکو گے۔ ہمارے درمیان کوئی تیسرا نہیں رہے گا۔ اس طرح میں کامران سے تھکائی میں باتیں کروں گی۔ وہاں درمیان کوئی تیسرا نہیں رہے گا۔ تم سمجھو نہ کرنا چاہتے ہو تو بات بنے گی، ورنہ میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ یہاں سے چلی جاؤں گی اور تم مجھے روک نہیں سکو گے۔"

وہ بھرا سے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ واقعی وہ خدی ہے۔ وہ ضد کرے گا تو کبھی ہاتھ نہیں آئے۔ "ہا۔ محبت سے قائل کرے گا تو شاید کلیا پلٹ جائے۔ عورت کا دل پھرنے میں دیر نہیں لگتی۔ وہ پھر جائے گی۔ ویسے بھی مجھے مرہم کی ضرورت ہے۔ ٹیمنے نے جو زخم لگایا ہے، اسے مونا بھر سکتی ہے۔ یہ بیوی نہ بنے، دوست بن کر ہی رہے تو اطمینان رہے گا کہ یہ میری نہیں ہے تو کسی کی بھی نہیں ہے۔ ٹیمنے بے لگام ہو گئی تھی۔ مونا کی لگام میرے ہاتھ میں ہے۔ یہ مجھے دھوکا نہیں دے سکے گی۔ میں اسے موقع ہی نہیں دوں گا۔"

مراد نے خوب سوچنے اور سمجھنے کے بعد کہہ۔ "مجھے منظور ہے لیکن چند شرائط ہیں۔ پہلی شرط یہ کہ تم کامران سے..... صرف دوست بن کر ملو گی۔ دوسری یہ کہ صرف دن کے وقت ملو گی اور یہ کہ کسی چار دیواری میں نہیں کھلی جگہ ملو گی جتنا دقت مجھے دو گی، اتنا ہی وقت اسے دو گی، اس سے زیادہ ملو گی اور میری شرائط کے خلاف عمل کرو گی تو میں دوست نہیں رہوں گا۔"

"مجھے تمہاری تمام شرائط منظور ہیں۔"

اس نے حیرانی سے پہلے مونا کو دیکھ کر پھر پوچھا "تجربہ ہے۔ تم کامران سے دور رہو گی تم نے میری شرائط پر ذرا بھی اعتراض نہیں کیا۔ بخوشی منظور کر رہی ہو۔"

"بڑی مشکل ہے خوشی سے کوئی بات منظور کرو تب بھی حیرانی ہوتی ہے۔"

"شاید تم سوچ رہی ہو، یہاں کچھ عرصہ اسی طرح رہ کر کسی وکیل کی خدمات حاصل

کر کے ایسا کوئی قانونی نکتہ نکال لو جس کے ذریعے مجھ سے نجات مل جائے۔"

"میں تمہارے سوچنے کے انداز کو بدل نہیں سکتی۔ اتنا سمجھا سکتی ہوں کہ تمہاری موجودہ سوچ ایک دلدل ہے جتنا میرے خلاف سوچتے جاؤ گے اتنا ہی دشمنی چلے جاؤ گے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "ابھی بات ہے۔ ہمارے معاملات طے پا گئے ہیں۔ اس کی نو سے تم ابھی میرے ساتھ تفریح کے لئے چل سکتی ہو۔ ایک محنتہ میرے ساتھ گزار سکتی ہو۔"

"آج معاملات طے پائے ہیں۔ ابھی تو میں غائم خیال ہٹاؤں گی۔ تم آج شام فون کے ذریعے کل ملاقات کا وقت معلوم کر لیتا۔"

وہ چونک کر بولا۔ "اوہ میں تو ٹیلی فون والی بات بھول ہی گیا تھا۔ کامران تم سے ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ جانے تم دونوں کتنی کتنی دیر تک باتیں کرتے رہو اور مجھے خبر نہ ہو۔"

وہ بڑی کتنی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ "مجھے تم پر ترس آتا ہے اس طرح سوچتے سوچتے بیمار پڑ جاؤ گے۔ آخر مجھے کہاں کہاں روکو گے، فون کرنے سے نہیں روک سکو گے۔ تم کتنے پہرے بٹھاؤ گے، کہاں کہاں پابندیاں عائد کرو گے۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اپنی وفاقی اور جسمانی صحت کا خیال رکھو اور اتنی ہی پابندیاں عائد کرو، جتنی تک تمہارا پس چلتا ہے۔ اس سے آگے سوچو گے تو پہلے کڑھتے ہوئے زندگی گزارو گے..... یاد رکھو اگر میں یہاں سے جانے پر مجبور ہو گئی تو صرف کامران ہی نہیں تم بھی میرے لئے ترپے رہو گے۔ اس وقت سمجھ میں آئے گا کہ جو چیز نگاہوں میں تھی۔ نگاہوں میں ہی رہتی۔ بیشک کے لئے دور دیں جا کر ادھم جمل تو نہ ہو جاتی۔"

اس وقت ٹھٹھکا، لالی بانو، تارا پرشاد اور ہوشل کی انچارج وہاں آگئیں۔ انچارج نے کہا "مسٹر کامران! میں نہیں جانتی کہ تمہارا نام کامران ہے بھی یا نہیں لیکن مسز ٹھٹھکا پانڈے اور ان عورتوں کے بیانات سے ہال چل رہا ہے، تم فراڈ فریڈ ہو۔ میں چاہوں تو تمہارے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرا سکتی ہوں۔ اتنا فراڈ کرنے پر تمہیں جیل ہو سکتی ہے۔ تمہاری شہریت منسوخ ہو سکتی ہے۔ تمہارا کاروبار ختم ہو سکتا ہے۔"

مراوے بات کاٹ کر کہہ "ہماری ملاقات کا وقت اپنی جگہ ہے لیکن ہم کبھی اتفاقاً یا ضرورتاً تو مل سکتے ہیں۔"

"کامران بھی اتفاقاً یا ضرورتاً مل سکتا ہے۔ تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے محبت سے التجائی۔ دوسرے لفظوں میں خوشامد کی۔ "مونا! خواہ مخواہ مدد کر رہی ہو۔ اگر میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں، تمہیں آرام سے بیٹھنا چاہتا ہوں تو کیا میرے ایک گھنٹے میں سے وقت کاٹ کر میرا نقصان کرو گی جبکہ میں تمہارا نقصان نہیں کر رہا ہوں۔"

"اگر تم میری مدد کر رہے ہو تو فاضل اوقات میں کامران بھی میری مدد کر سکتا ہے۔"

وہ بے بسی سے بولا۔ "اچھا جتنا وقت ابھی میرے ساتھ گزار دو گی، اتنا ہی فاضل وقت تم کامران کو دے سکتی ہو۔"

"ہاں، یہ انصاف کی بات ہے۔"

"میں دل سے مجبور ہوں۔ تمہارے پاس آ کر تم سے جی بھر کر باتیں کئے بغیر دور نہیں جا سکتا۔ جاؤں گا تو شام تک بے چین رہوں گا۔ آؤ میرے ساتھ بیٹھ چلو۔"

اس نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "ایک بات یاد رکھو میں نے تمہیں چار بجے کا وقت دیا ہے۔ چار سے پانچ بجے تک تمہارے ساتھ رہوں گی۔ ٹھیک پانچ بج کر دس منٹ پر کامران سے ملاقات ہو گی۔ مجھے چھ بج کر دس منٹ پر اس سے رخصت ہونا چاہئے لیکن تمہارے ساتھ گزارا ہوا یہ فاضل وقت اسے دیا جائے گا۔ میں پانچ بجے سے ہی شام کے سائے پھیلنے لگتے ہیں۔ چھ بجے کے بعد رات ہونے لگتی ہے۔ شکایت نہ کرنا کہ میں رات کو اس کے ساتھ رہی۔"

وہ ابھن میں پڑ گیا۔ یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اندھیرا ہونے کے بعد وہ کامران سے ملے۔ اس نے کہہ "تم مجھ سے دوستی کی بجائے دشمنی کر رہی ہو۔ مجھے پریشان کر رہی ہو۔"

"پریشان تو تم نے کیا ہے۔ جو معاملات ملے ہو گئے تھے اس کے خلاف ملنے چلے

آئے۔"

"اچھا یوں کرو جتنا وقت ابھی میرے ساتھ گزرے یہ وقت کل دن کو کسی وقت کامران کے ساتھ گزار لینا۔"

"نہیں۔ آج کا حساب آج کے کھاتے میں جائے گا۔ جب دوستی اور محبت میں حساب کتاب شروع ہو چکا ہے تو پھر ہمیں اس کا پابند رہنا چاہئے۔" وہ غصے سے تھلا کر بولا۔ "جاؤ بس میں چلی جاؤں گی کسی برداشت نہیں کروں گا کہ اچھے بچے کے بعد کامران سے ملو۔"

وہ غصے سے پاؤں پیچھا ہوا اسٹیرنگ سیٹ پر پہنچا۔ اس نے گاڑی اشارت کی پھر اسے تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا اس کی نظروں سے دور ہوتا چلا گیا۔ وہ سختی سے مسکراتے ہوئے آہستہ آہستہ چلے ہوئے بس اسٹاپ کی طرف جانے لگی۔ پبلک سروس کی بلڈنگ عام مرلیوں کے لئے نہیں تھی۔ وہ صرف خاندانی منصوبہ بندی کے لئے مخصوص تھی۔ وہاں ایسے نئے شادی شدہ جوڑے آتے تھے جو فی الحال ماں باپ بننا نہیں چاہتے تھے اور جو بین بچے تھے وہ مزید اولاد کی روک تھام کے لئے آتے تھے۔ وہاں ایسی مائیں بننے والی عورتیں آتی تھیں جن کی صحت برائے نام ہوتی تھی۔ وہ بے حد کمزور ہوتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر فیصلہ کرنا پڑتا تھا کہ ان کا دل بننا لازمی ہے یا ان کی زندگی بچانا ضروری ہے۔ مختصر یہ ہے کہ پبلک سروس بلڈنگ کا تعلق خاندانی منصوبہ بندی سے اور خصوصاً عورتوں سے تھا۔ وہاں مونا کو ملازمت مل گئی۔ پہلے ہی دن شام پانچ بجے سے ڈیوٹی مقرر ہوئی۔ پہلے چھپنے شام پانچ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک۔ رہتے ڈیوٹی بدلتی رہتی اور اسے چھ گھنٹے تک ڈیوٹی انجام دیتے رہنا تھا۔ پہلے ہی دن اپنے کامران سے ملاقات کرنے کا وقت اس کی ڈیوٹی کی نذر ہو گیا تھا۔

وہ ہوسٹل آگئی۔ وہاں سے اس نے مراد کے کالج کے فون نمبر پر رابطہ قائم کرنا چاہا لیکن وہ گھر میں نہیں تھا۔ پھر اس نے ڈاکٹر ہنزے پر رابطہ قائم کیا۔ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہہ "مجھے ملازمت مل گئی ہے۔ آج شام پانچ بجے سے ڈیوٹی پر جاؤں گی لیکن پانچ بجے کامران سے ملنے کا وقت مقرر تھا۔ اب چاہتی ہوں، دن کے کسی حصے میں ایک گھنٹے

کے لئے اس سے ملاقات کروں مگر اس سے پہلے مراد کو اطلاع دینا ضروری ہے ورنہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے گا۔

”مسٹر مراد میرے پاس بیٹھے ہوئے ہیں ان سے گفتگو کرو۔“

چند لمحوں کے بعد ہی مراد کی آواز سنائی دی۔ وہ خوش ہو کر کہہ رہا تھا۔ ”میں جانتا تھا جذبہ عشق سلامت رہے تو محبت کرنے والی کپے دھاگے سے بندھی چلی آتی ہے آخر تم نے مجھے یاد کر لی لیا۔“

مونا نے اپنی مجبوری بیان کی۔ سب کچھ سننے کے بعد اس نے کہہ ”میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ تو کامران کے نصیب ہیں۔ بقول تمہارے آج کا حساب آج کے کھاتے میں جائے گا۔ اس لئے آج تم اس سے مل نہیں سکو گی۔“

”کیوں نہیں مل سکتی؟ میں دن کو کسی وقت بھی ایک گھنٹے کے لئے مل سکتی ہوں۔“

”بقول تمہارے جب محبت اور دوستی میں حساب کتاب شروع ہو چکا ہے تو ہمیں مقررہ وقت کے مطابق عمل کرنا ہو گا۔“

”یعنی ایک ہفتے تک میں شام پانچ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک ڈیوٹی دینی رہوں گی اس طرح ایک ہفتے تک کامران سے نہیں مل سکتی۔“

”میں نے کہا یہ کامران کی بد نصیبی ہے۔ تم ایک ہفتے تک اس سے مقررہ وقت پر نہیں مل سکو گی اور کوئی دوسرا وقت مقرر نہیں کیا جا سکتا۔“

مونا نے اسے اپنی ڈیوٹی کے بدلے ہوئے اوقات کے حعلق بتایا۔ پھر کہہ ”تم بھی نوٹ کر لو۔ اب سے چوتھے ہفتے میری ڈیوٹی دن کے گیارہ بجے سے شام کے پانچ بجے تک ہو گی گویا کہ تمہارے لئے چار بجے سے پانچ بجے تک کا جو وقت مقرر ہے وہ چوتھے ہفتے میری ڈیوٹی کی نذر ہو گا اور تم پورے ہفتے مجھ سے ملاقات نہیں کر سکو گے۔ بولو منظور ہے؟“

وہ چپ رہا۔ جواب نہ دے سکا۔ مونا نے پوچھا۔ ”غاموش کیوں ہو۔ جواب دو۔“
وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”تم اس سے مل سکتی ہو لیکن ملنے کا وقت مجھے بتا

کہ اس کے بعد میں تمہیں اس کے ساتھ نہ دیکھوں۔“

”میں دو بج کر پچیس منٹ پر اس سے ملاقات کروں گی۔ تین بج کر پچیس منٹ پر صحت ہو جائوں گی۔ اس کے پانچ منٹ کے بعد یعنی ٹھیک چار بجے تم سے ملاقات کروں گی۔“

”یہ بھی بتا دو کہاں ملاقات کروں گی؟“

”کامران نے یہ نہیں پوچھا ہے کہ تم سے کہاں ملاقات کروں گی؟“

یہ کہہ کر اس نے رسیور رکھ دیا۔ کامران نے اسے چند فون نمبروں نہ کرائے تھے ضرورت ہو تو وہ ان میں سے کسی نمبر پر رابطہ قائم کر سکتی ہے۔ اس نے ایک نمبر کو ڈیال کر کامران نے کہا تھا ”جب تک وہ پوری طرح صحت یاب نہ ہو جائے“ زخم ابھی بھرنے لگا تھا۔ وہ اپنے ایک اور دوست کے ساتھ رہے گا۔ اس کے ہاسٹل سے زیادہ فاصلہ نہیں رہے گا۔ اس کا دوست ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ فلیٹ آزر سے رابطہ قائم ہو گیا۔ مونا نے کہہ ”آپ کے کرائے دار مسٹر منور کے پاس کامران ٹائی ایک صاحب ہیں۔ پلیر آپ ان سے کہہ دیں کہ وہ مونا سے فون پر رابطہ قائم کریں۔“

یہ کہہ کر اس نے رسیور رکھ دیا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد ہی کامران نے فون کے بل پر رابطہ قائم کیا۔ پھر کہہ ”مجھے ابھی تمہارا پیغام ملا ہے۔ کو کوئی خاص خبر ہے؟“
”ہاں۔ مجھے ملازمت مل گئی ہے“ آج شام پانچ بجے سے رات گیارہ بجے تک ڈیوٹی

”یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔“

”کیسا خوشی میں بھول گئے کہ پانچ بجے مجھ سے ملاقات کرنا ہے؟“

”کیسے بھول سکتا ہوں تم سے جدا ہوتے ہی خیالوں میں ملاقات کرتا رہتا ہوں۔ پانچ بجے تم مصروف ہو تو کوئی بات نہیں۔ کوئی دوسرا وقت مقرر کر لیتے ہیں۔“

دوسرا وقت مقرر کرنے پر مراد کو اعتراض تھا لیکن میں نے اسے راضی کر لیا ہے۔
”دو بج کر پچیس منٹ پر ملیں گے اور ٹھیک تین بج کر پچیس منٹ پر رخصت ہو جائیں گی۔“

”اوہ ہوتا ہے کیا مذاق ہے۔ ہم میاں بیوی ہیں یا مراد کے زر خرید غلام ہیں جو اس کے اشارے پر ناچ رہے ہیں۔“

”اس پر اصرار کر کے تم نے مجھے بلایا ہے اور اس کے حوالے سے بلایا ہے تو اس کے حوالے سے ہی مل سکتے ہیں۔ فون پر زیادہ بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے وقت کا خیال رکھو اور مجھے بتاؤ، مکمل ملاقات ہو سکتی ہے؟“

”تم جس ہوٹل میں رہتی ہو وہاں سے گرین پارک اور ہائیڈ پارک قریب ہیں۔ ہائیڈ پارک میں سرین ٹائن سڑک کے اوپر ایک کٹناؤہ پل ہے۔ وہاں ایک ریسٹوران اور ایک اسٹیک بار ہے تم وہاں میرا انتظار کر سکتی ہو۔ میں ٹھیک وقت پر پہنچ جاؤں گا۔“

وہ ٹھیک وقت پر پہنچ گیا۔ مونا اسی ریسٹوران کے باہر کھلی فضا میں ایک میز کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ کامران نے پاس آکر سمراتے ہوئے ہلے کھلے پھر کئے لگا۔ ”یہ کھلی فضا ہے چلو ریسٹوران کے اندر کسی کیبن میں بیٹھیں گے۔“

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ”مراد بھی مجھے کسی ریسٹوران کے کیبن میں بیٹھنے کو کہے گا۔“

”وہ ابھی نہیں دیکھ رہا ہے۔“

”تم کیا جانو؟ وہ ہمارا پیچھا کبھی نہیں چھوڑے گا۔ کیس نہ کیس چھپ کر ہمیں دیکھتا رہے گا اور ہماری عمر بھر کی تار بے گا۔“

وہ پریشان ہو کر دہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مونا اسے محبت سے اور بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سر جھکا کر بولا۔ ”مجھے اس طرح نہ دیکھو۔ میں خود کو بڑی شدت سے مجرم محسوس کرنے لگتا ہوں۔ تم مجھے اپنی زندگی میں آنے کی اجازت نہیں دے رہی تھیں۔ میں نے جبراً تمہارے دل میں جگہ بنائی، تم نے اجازت دے دی۔ پھر اس ملک کا قانون اجازت نہیں دے رہا تھا۔ یہاں بھی میں نے ضد کی اور غیر قانونی طور پر تمہیں بلا لیا۔ ایسا نہ کرتا تو پتا نہیں تمہارا مستقبل کتنا شاندار ہوتا۔ پتا نہیں کون تمہارا جیون ساتھی ہوتا اور تم اس کے ساتھ.....“

وہ میز پر ہاتھ مار کر بولی۔ ”بس کرو۔ بہت ہو چکا تم کیا سمجھتے ہو؟ بے شمار عورتیں جو

اپنے شوہروں سے چھڑ کر دیس پر دیس میں تنہا زندگی گزارتی ہیں، کیا وہ دوسرے جیون ساتھیوں کے خواب دیکھتی ہیں؟ خواب بدل سکتے ہیں مگر خوابوں میں آنے والا نہیں بدل سکتا اور جب وہ زندگی میں آجاتا ہے تو پھر آخری سانس تک بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تم ناراض ہو گئیں، میرا مقصد یہ نہیں تھا۔ میں تو اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتا ہوں۔“

”مجرم ہم دونوں ہیں۔ ہم دونوں نے غلطی کی۔ ہم دونوں بچتا رہے ہیں۔ اب اس بچتوے سے کس طرح کھٹنا ہے اس کے لئے میں جدوجہد کر رہی ہوں۔ تم بھی کمرے رہو، کسی وکیل سے رابطہ قائم کرو۔“

”ضرور کروں گا آج ذرا آرام کروں۔ کل شاید اچھی طرح چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ پھر کبھی کروں گا۔“

وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر ریسٹوران میں گئے۔ سیلف سروس کے مطابق اپنے کھانے کچھ سینڈویچز اور کافی کی دو پالیاں لیں۔ پھر اپنی جگہ واپس آکر بیٹھ گئے۔ ان کی محبت میں بڑی سنجیدگی آگئی تھی۔ پہلے جیسی بات نہیں رہی تھی کہ ملے تو شامی یا روٹیاں باتیں شروع ہو گئیں۔ اب وہ مستقبل کے منصوبے بنا رہے تھے۔ انہیں کیا کرنا چاہئے؟ مونا نے اپنے کمرے کی ان ساتھیوں کے متعلق بتا رہی تھی جو انگریزین قوانین کی ماری تھیں۔ وہ سب مونا کے دکھ کو سمجھ رہی تھیں اور ہمہ وقت اس کا ساتھ دینے کے لئے تیار تھیں۔

ایک گھنٹہ کیا ہوتا ہے؟ کچھ نہیں ہوتا۔ بلک جھپکتے ہی گزر جاتا ہے کیونکہ یہ وصال کے لمحات ہوتے ہیں۔ وہ وقت سے چندہ منٹ پہلے ہی اٹھ گئے۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پارک سے باہر جانے لگے تاکہ باہر پہنچنے تک وہ وقت پورا ہو جائے۔

اوپن ایئر ریسٹوران کے احاطے سے باہر نکل کر چند قدم چلتے ہی وہ رک گئے۔ ذرا آگے دوچار آدمی کسی شخص کو منبعل رہے تھے۔ وہ جھکا ہوا تھا اور کسی تکلیف میں جھکا نظر آتا تھا۔ کامران نے اسے دور سے پہچانتے ہوئے کہا۔ ”ارے یہ تو مراد ہے۔“

وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے اس کے قریب پہنچے۔ کامران نے ان آدمیوں سے کہا۔ ”میں اسے جانتا ہوں۔ یہ میرا دوست ہے۔“
ایک شخص نے کہا۔ ”تمہیں کھلو، ہم پریشان ہو گئے تھے پلیز اسے فوراً چلی امداد پہنچائیں۔“

اسے ایک گاڑی میں بٹھا کر پارک کے باہر پہنچایا گیا۔ پارکنگ ایریا میں ایک ٹیکسی میں بٹھایا گیا۔ کامران نے بھی بیٹھے ہوئے مونا سے کہا۔ ”تم بھی چلو، ہم اسے ڈاکٹر جان ہنر کے پاس لے چلیں گے۔“

”میں کیسے بیٹھ سکتی ہوں۔ جو وقت تمہارے لئے مقرر تھا“ اس کے چندرہ منٹ مروا کی وجہ سے ضائع ہو رہے ہیں۔ اس کا حساب کیا یہ کرے گا؟“

مرواد اپنے سینے پر ہاتھ رکھے، دل کو تھامے، تکلیف سے کراہتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
”تم جو حساب کرنا چاہو گی، کروں گا پلیز مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔“

”کاش! تم واپس چلے جاؤ۔ کل میں ایک گھنٹے چندرہ منٹ تک ملاقات کروں گی۔“
کاش یوں بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ زخمی حالت میں اپنے گھر سے پارک تک آیا تھا۔ اس وجہ سے تھک گیا تھا۔ مونا کی یہ بات پسند آئی آج کے چندرہ منٹ کل کے ایک کنبے میں شامل کئے جائیں گے۔ وہ چلا گیا۔ مونا مراد کے ساتھ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ٹیکسی وہاں سے روانہ ہوئی۔ اس نے کن اکبیروں سے مروا کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ بیزا رہا تھا۔ ”میں مراد جان کا تو تم مجھے بہت یاد کر دو گی۔ آہ! بہت یاد کر دو گی۔“

مونا نے دل ہی دل میں کہا۔ ”ہم خدا کو یاد کرتے ہیں لیکن شیطان بھی جبراً یاد آتا ہے اور ساری زندگی یاد آتا رہتا ہے۔ تم یاد آؤ گے تو کن سی نی بات ہو گی۔“

وہ بیزا تے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”میں برداشت نہیں کر سکتا۔ جب میں نے خیزد کو دلہن بن کر اپنے ہی بھائی کے گھر میں جاتے دیکھا تو پہلی بار میرے دل میں درواغہ میں تکلیف سے تر پنے لگا۔ آج تمہیں کامران کے ساتھ ریسٹوران میں دیکھ کر پھر یہی حالت ہو گئی۔ میں کیا کروں۔ میں برداشت نہیں کر سکتا۔“

مونا نے ناگواری سے، ذرا ہمدردی سے اسے دیکھا وہ دشمن تھا مگر اس پر ترس آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈاکٹر جان ہنر کے جعبہ میں پہنچ گئے۔ مونا اسے چھوڑ کر جانے لگی۔
تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ ”نہ جاؤ، مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ اب تو چار بج چکے ہیں۔ مجھے سے ملاقات کا وقت ہے۔“

”بے شک، تم سے ملنے کا وقت ہے لیکن چار دیواری میں نہیں۔ میں کھلی فضا میں رہوں گی۔ طبیعت بحال ہو جائے تو چلے آؤ گے۔“
ڈاکٹر نے ایک گولی مراد کو کھانے کے لئے دی۔ پھر مونا سے کہا۔ ”خدا نہ کرے۔“
پھر وہ جاؤ میرے مریض کی سب سے اہم دوا ہو۔“

”اور میری سب سے اہم دوا میرا شوہر ہے۔ اس کے بغیر میں ذہنی طور پر بیمار رہتی ہوں۔ یہاں علاج کے لئے آئی ہوں۔ کیا آپ اور آپ کا یہ مریض میرے لئے وہ دوا چھوڑ کر سکتے ہیں؟“

”دیکھو، تم تینوں کے درمیان سمجھوتہ ہو چکا ہے۔“
”میں اسی سمجھوتے کی ڈو سے کہہ رہی ہوں۔ ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی صرف کھلی فضا میں مل سکتی ہوں۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”مرواد تم خود ہی اپنے حق میں برا کرتے ہو۔ تمہاری شرائط کی ڈو سے یہ درست کہہ رہی ہے۔ اگر تم اسے روکنا چاہتے ہو تو شرائط میں تبدیلی لاؤ اور کہہ دو کہ یہ کامران کے ساتھ بھی چار دیواری کے اندر ملاقات کر سکتی ہے۔“
وہ تکلیف سے کراہ کر بولا۔ ”ہرگز نہیں، چار دیواری کے باہر رہ کر میں مراد جان کو“

مونا نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ پھر باہر چلی گئی۔ ڈاکٹر کی جو دوا نہیں بے ضرر اور اچھے اثر ہوتی تھیں، وہ بھی مراد پر اثر کرتی تھیں۔ اس پر مونا قریب تھی تو پھر اثر کیں نہ ہو سکتی۔ وہ دس منٹ کے بعد ہی ٹھیک ہو گیا۔ بہتر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پوچھنے لگا۔ ”وہ کہاں ہے؟“
ڈاکٹر نے کہا۔ ”باہر گاؤں میں ہے۔“

وہ فوراً ہی اٹھ کر وہاں سے جانے لگا ڈاکٹر نے خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھ کر پھر ایسی سے گردن ہلا کر کہہ۔ ”پورفلو۔ میں اس کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟“
وہ گاڑوں میں موتا کے پاس پہنچ گیا۔ موتا نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ملاقات کے وقت کا آدھا گھنٹہ ختم ہو چکا ہے۔ اب آگے گھنٹے میں ہم یہاں سے کسی میں بیٹھ کر پبلک سروس بلڈنگ کی طرف چلے جائیں گے۔ وہاں پہنچے پہنچے میری ڈیوٹی کا وقت ہو جائے گا۔ چلو۔“

وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ میرا آدھا وقت بیماری میں گزر گیا اور آدھا تمہارے ساتھ جانے میں گزر جائے گا۔“
”میں کیا کر سکتی ہوں۔ تمہارے لئے یہی وقت مقرر تھا۔“
”اگر تم چاہو تو میں رات گیارہ بجے اسپتال آ جاؤں۔ اتنی رات کو تم ہاسٹل واپس جاؤ گی میں تمہیں اپنی گاڑی میں پہنچا دوں گا۔“

موتا نے خوش ہو کر کہا۔ ”ہاں اچھا آئیڈیا ہے۔ آج تم مجھے پہنچا دینا۔ کل رات کو گیارہ بجے کامران آکر مجھے ہاسٹل پہنچا دیں گے۔“
وہ ہونٹوں کو پہنچ کر اسے گھورنے لگا۔ وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ ”اس طرح کیا دیکھ رہے ہو۔ جب تم ایک بات کا حساب کرتے ہو تو پھر ہمارے حساب کرنے پر غصہ کیوں آتا ہے؟“

وہ خاموش رہا۔ آگے جا کر وہ دونوں ایک بس میں سوار ہو گئے۔ موتا ایک سیٹ پر بیٹھے ہوئے بولی۔ ”آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“
وہ اس کے پاس خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ موتا نے پوچھا۔ ”مجھے اسپتال چھوڑنے کے بعد کیا تم گھر جاؤ گے؟“

اس نے چونک کر پوچھا۔ ”کیوں؟“
”اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے تم سوچو گے کہ تمہارے جاتے ہی میں اسپتال سے نکل بھاگوں گی۔ کامران کے پاس پہنچ جاؤں گی یا کامران میرے پاس پہنچ جائے گا۔ تم رات گیارہ بجے تک وہاں ڈیوٹی دیتے رہو گے۔“

وہ سیٹ پر پہلو بدل کر رہ گیا۔ کوئی جواب نہ دے سکا۔ ”میں تمہیں مشورہ دیتی ہوں، کہیں آرام سے بیٹھ کر اس سوال پر غور کرو کہ تمہیں دوست بننا ہے یا جاسوس؟ اگر جاسوس بنو گے تو راتوں کی نیند اڑ جائے گی گیارہ بجے تک میرے لئے اسپتال کے سامنے رات بھر پہرہ دو گے۔ صبح گھر جا کر سونا چاہو گے تو نیند آنے کے باوجود چونک چونک کر اٹھو گے۔ خواب میں بھی تم مجھے اور کامران کو لٹے ہوئے دیکھ کر سو گے۔ جب تک ہم میاں بھئی جدائی کے مدد سے رہیں گے تم ہمارے دماغ کے اندیشوں میں جھلارے کے دماغی مریض بننے رہو گے۔“

”تم چاہو تو اس مریض کو ایک نئی زندگی دے سکتی ہو۔ چاہو تو مجھ سے شادی سے پہلے میری تمام دولت، جائیداد اور کاروبار اپنے نام لکھواؤ مجھے کشتال بنا دو اور یہ دیکھو کہ میں تم پر کتنا اعتماد کرتا ہوں۔ تمہاری ایک ہاں پر ہوت کے چہرے پر بھی دستخط کروں گا۔“

”جب تم مجھے اتنا چاہتے ہو تو میری خوشیوں کا فیصلہ رکھو محبت اس کو نہیں کہتے کہ جس کی طلب ہو اسے حاصل کر لیا جائے۔ محبت لڑائی کا نام ہے۔ تم میری جھولی اپنی دولت سے نہیں، بلکہ قربانیاں دے کر میری خوشیوں سے بھر دو۔ تم جانتے ہو کہ مجھے خوشیاں صرف کامران کی ذات سے حاصل ہو سکتی ہیں کیا حق یہ قربانیاں نہیں دے سکتے۔ یقین کرو قربانی سے تمہاری محبت دائمی اور مثالی بن جائے گی۔“
”تم قربانی کا یہ سبق کامران کو بھی پڑھا سکتی ہو۔“

”ہمارا نکاح نامہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تم نے اپنی محبت میں ایک دوسرے کو حاصل کر لیا ہے۔ اس کے بعد کوئی بھی محبت کا دعویٰ کرنا کڑا ہے۔ محبت میں قربانی دینی ہوگی لیکن بحث فضول ہے تم نہ سمجھو گے نہ تمہیں سمجھنا ہوگا۔“
وہ بس سے اتر گئی۔ پھر اسپتال کی طرف ہٹے ہوئے چلی۔ ”کل چار بجے ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔“

وہ جانے لگی۔ وہ چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اندر چلتا رہا اور سوچتا رہا۔ نہ ملاقات سے حاصل ہوتی ہے نہ دولت سے ملتی ہو جاتی ہے۔ نہ سینہ پیٹ کر آہ

زاری سے حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے سامنے کوئی چھلکا کام آتی ہے۔

وہ سوچتے سوچتے لرزنے لگے۔ مضامین بھیجنے کا جب کوئی حربہ کام نہ آئے تو دیوانگی طاری ہونے لگتی ہے۔ دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگتی ہیں۔ جنونی کیفیت شدت اختیار کرنے لگتی ہے۔ ایسے ہی وقت آدمی یا تو ہارے ہوئے سپاہی کی طرح ہتھیار ڈال دیتا ہے یا ایک دم سے پھٹ پڑتا ہے یا پھر دماغی مریضوں کی طرح بیمار پڑنے لگتا ہے۔ اسے تکلیف کا احساس ہونے لگا۔ اس نے جلدی سے جب میں ہاتھ ڈال کر چھوٹی سی ذبیہ نکالی۔ پھر اس میں سے ایک سرخ رنگ کی گولی نکال کر منہ میں ڈال لی۔

☆ ----- ☆

مونا نے ایمگریشن کے موضوع پر جو مضمون لکھا تھا وہ تیسرے دن ایک معروف اخبار میں شائع ہو گیا۔ یوں تو آئے دن کتنے ہی صحافی اور رپورٹرز انسانی زندگی کے حقائق کو بے نقاب کرتے رہتے ہیں مگر تب کم صحافی اور قلم کار لوگوں کی نظروں میں آتے ہیں اور پسند کئے جاتے ہیں اس کی چند وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ بعض قلم کار تحریر کے ذریعے منفرد انداز پیش کرتے ہیں جو بڑے دالوں کو حاشا کرتا ہے بعض قلم کار تلخ حقائق کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑتے۔ اس طرح وہ حقیقت نگار کی حیثیت سے مقبول ہو جاتے ہیں۔ بعض صحافی اور حقیقت پسند قلم کار مختلف ذرائع اختیار کرتے ہیں اور اپنی آواز کو دور تک بلکہ اعلیٰ حکام تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

نکلنے پانے سے بھی مختلف ذرائع اختیار کرتی تھی۔ ہمیشہ عورتوں کے حقوق پر لکھتی تھی۔ اس کا خاص موضوع ایمگریشن ہوتا تھا وہ ان عورتوں کی نمائندگی کرتی تھی جو ایشیا کے مختلف ممالک میں اپنے شوہروں کا انتظار کرتے کرتے بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ جب بھی اس کا کوئی مضمون شائع ہوتا تو اس مضمون کی کئی نقلیں وہ مختلف اداروں میں مختلف ممالک میں ارسال کرتی تھی۔

جب مونا کا وہ مضمون شائع ہوا تو نکلنے سے سب سے پہلے اسے ایمگریشن کے

شعبوں سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ افسروں کے پاس بھیجا۔ اس کی ایک نقل وزارت خارجہ کے دفتر میں بھیجی۔ پھر اس کی کئی نقلیں اس نے سولہ ممالک کی خواتین اول کے پاس ارسال کیں۔ دنیا کے کئی ممالک کی سیاسی اور سماجی تنظیموں سے تعلق رکھنے والی خواتین کو بھی اس مضمون کی طرف متوجہ کر دیا۔ وہ دنیا کی ایسی تمام خواتین کو ایمگریشن کے مسئلے پر اپنا ہم خیال بناتی جاری تھی جو کسی نہ کسی شعبے سے تعلق رکھتی تھیں۔ کسی نہ کسی ملک کی خاتون اول یا سیاست دان تھیں، ڈاکٹر تھیں، اپنے ملک میں اور بین الاقوامی سطح پر بہت ہی معروف سماجی کارکن تھیں۔ وہ تمام مرد حضرات بھی ان خواتین کے ہم خیال تھے جو برسوں سے ایمگریشن کے مسئلے سے دوچار ہوتے چلے آ رہے تھے۔

مونا کا جو پہلا مضمون اخبار میں شائع ہوا، اس کا عنوان تھا، ہم اجازت چاہتے ہیں۔ اس عنوان کے تحت اس نے لکھا تھا۔ ہم اجازت اس لئے چاہتے ہیں کہ کوئی بھی شریف انسان کسی کی اجازت کے بغیر کسی کے گھر میں داخل نہیں ہو کہ برطانوی حکومت کو اپنے قانون میں اتنی لچک پیدا کرنا چاہیے کہ شریفوں اور بدعاشوں کی علیحدہ شناخت ہو سکے۔

قانون دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی جڑیں انسانی تہذیب میں بڑی گہرائی تک ہیں۔ اس کے باوجود انسان کی ذہانت یا اس کی مکاریوں کے آگے قانون بے بس ہو جاتا ہے۔ چاہے کتنے ہی سخت قوانین نافذ کرو، منشیات کے پیواری، عورتوں کے سواگر، سرکاری رازوں کو چرانے والے اور سیاسی سازشیں کرنے والے اپنی مکاریوں سے چور دروازے بنا کر ہمیشہ ہر ملک میں اور خصوصاً انگلینڈ میں داخل ہوتے رہے ہیں، صرف اپنے شوہروں سے وفا کرنے والیاں داخل نہیں ہو سکتیں۔

انگلینڈ میں اپنا وطن چھوڑ کر آباد ہونے والوں کے متعلق یہاں قانون کے محافظ پوری طرح چھان بین کرتے ہیں۔ ان کے پاس ایسے قواعد و ضوابط ہیں اور ایسی لائن آف ایکشن ہے جس کے ذریعہ وہ ان کی جانچ پڑتال کے بعد یہاں رہنے کی اجازت دیتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ غلط قسم کے لوگ تو آسانی سے ملک میں داخل ہو جاتے ہیں لیکن جو غلط نہیں ہوتے، جو قانون کا لحاظ کرتے ہیں، وہ سرحد کے باہر منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

فی صورتیں اور مرد اپنے اپنے مسائل بیان کرتے تھے۔ ٹکٹا لے کر۔ ”ان تمام لوگوں کے بچے ٹوٹ کرتی رہو“ ان سے رابطہ بھی قائم رکھو۔ ہم بہت جلد لندن کی شاہراہوں پر بہت بڑا جلوس نکالیں گے۔ اپنا مطالبہ منوانے کی کوشش کریں گے۔“

دوسری طرف کامران کئی وکیلوں سے ملاقات کر چکا تھا۔ کوئی اس کے مزاج اور مطلب کے مطابق نہیں تھا۔ ایک نے کہا۔ ”مسٹر کامران! پہلے تم یہاں کے باقاعدہ شہری بننے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد تمہاری وائف کے لئے کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔“ وہ اس وکیل سے مطمئن نہیں تھا۔ ایک ہفتے بعد ایک پاکستانی وکیل سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے تمام حالات سننے کے بعد پوچھا۔ ”میاں صاحب زادے! تمہیں انکلیڈ آنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا پاکستان میں روزی حاصل نہیں ہوتی؟“

”آپ بھی تو پاکستان سے یہاں آکر وکالت کر رہے ہیں۔“

”میں کر سکتا ہوں۔ میرے بیوی بچے یہاں موجود ہیں۔ تمہاری وائف کو یہاں رہنے کی اجازت نہیں مل سکتی، تم خود باقاعدہ شہری نہیں ہو تو پاکستان واپس چلے جاؤ۔“

”میرے پاکستان واپس چلے جانے سے کیا ان تمام لوگوں کے مسائل حل ہو جائیں گے جو امیگریشن کے سخت قوانین کے باعث مجسٹریٹس اٹھا رہے ہیں۔“

”میں مانتا ہوں، ہمارے ملک کے کتنے ہی لوگ یہاں بیوی بچوں سے چھڑ کر زندگی گزار رہے ہیں لیکن تمہیں دوسروں سے کیا ہمدردی ہے، جبکہ تمہیں اپنے ملک پاکستان سے محبت نہیں ہے۔“

کامران نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟“

”میں درست کہہ رہا ہوں۔ اگر تمہیں پاکستان سے محبت ہوتی، اس کی عزت کا خیال ہو تو اپنی وائف کو کسی دوسرے کے نام سے منسوب کر کے یہاں بھیج نہ دلاتے۔ یہ کتنی شرم کی بات ہے۔ کیا تم اسے سمجھ سکتے ہو؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اگر سمجھ سکتے تو کبھی ایسا قدم نہ اٹھاتے۔ مجھے تو یہ سوچ کر ہی شرم آتی ہے کہ پاکستان کے ایک جوان نے اپنی بیوی کو ایک دوست سے منسوب کیا۔ اگر یہ بات پریس تک پہنچے گی تو جانستے ہو ہمارے ملک کی کتنی بدنامی ہوگی؟“

اگر اس ملک میں داخلے کی اجازت ہو اور متعلقہ شعبہ جات کا عملہ اور افسران ذمہ دار نہ ہوں تو چور، قاتل، اسلحہ جیسے مجرم آجائے ہیں۔ یہاں بات صرف اجازت دینے پر ختم نہیں ہوتی بلکہ متعلقہ افسران کے محاسبے سے شروع ہوتی ہے۔

اگر اس ملک میں داخلے کی اجازت نہ ہو تو سیدھے سادے لوگ مجبور ہو کر غیر قانونی طور پر چور دروازے سے آتے ہیں۔ انسانی تہذیب کی ابتداء سے آج تک کسی بھی شریف آدمی نے صرف اتفاقی جرم کیا ہے جتنا حالات نے مجبور کیا، اگر وہ تین دن قاتلے کرتا ہے تب ایک روٹی چراتا ہے یعنی شریف آدمی ضرورت کے مطابق ایک قطرہ چراتا ہے اور قانون شکن پورا سمندر چراتے رہتے ہیں۔

اگر مرد کو اپنی بیوی سے اور بیوی کو اپنے مرد سے عمر بھر جدائی کی سزا دی جائے تب وہ چور راستوں سے ملنے آتے ہیں۔ یہ میاں بیوی کیا ہیں، یہ کچھ معصوم جذبوں کے اور کچھ رنگین و سنگین جذبوں کے اسلحہ ہیں۔ بیوی اپنے جذبوں کو، میاں اپنے جذبوں کو چھپا کر سلت سمندر پار اسلحہ کرتے ہیں اور ایسی اسلحہ نگاہ کے تمہارا قانون مجبور کرتا ہے۔ اگر تم بد معاشوں کو روکو گے تو نیکی کے علمبردار کسلاؤ گے کیونکہ بد معاشوں کا راست قانون کے شریف محافظ روکتے ہیں اور شریف آدمیوں کا راست ہمیشہ بد معاش روکتے آئے ہیں۔ اگر کوئی قانون شریفوں کا راست روکتا ہے تو وہ بد معاش ہو گا۔ بولو، تمہارا قانون شرافت پر مبنی ہے یا بد معاشی پر؟

اگرچہ موتا کی تحریر کا انداز جارحانہ تھا لیکن وہ اپنے حالات اور اپنے مزاج سے مجبور تھی۔ ہر قلم کار اپنے مزاج اور حالات کے مطابق ذرا گرم ہوتا ہے، ذرا نرم ہوتا ہے۔ ابھی موتا میں نرمی نہیں آسکتی تھی۔ ابھی وہ انکاروں پر چل رہی تھی، اس لئے شٹلے اگل رہی تھی۔

ایک ہفتے میں اس کے چار مضامین شائع ہوئے چاروں مضامین نے اچھی خاصی دھوم مچادی۔ ان کی اشاعت سے یہ ظاہر ہوا کہ ان کی طرح کتنے ہی لوگ امیگریشن کے سخت قوانین کے باعث پریشانیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ ٹکٹا کے پاس ایسے بے شمار لوگوں کے خطوط آیا کرتے تھے۔ اب موتا کے پاس بھی خطوط آنے لگے تھے۔ ان خطوط میں کتنی

کامران ہونٹوں کو سختی سے پیچھ کر چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے پوچھل "آپ نے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔ اب میری سنئے۔ کسی بھی ملک میں کسی بھی قوم میں کسی بھی برادری میں انسان بھی ہوتے ہیں شیطان بھی ہوتے ہیں۔ راہِ راست پر چلنے والے بھی ہوتے ہیں اور خطا کار بھی ہوتے ہیں لیکن ان خطا کاروں کے باعث پورا ملک 'پوری کی پوری قوم' پوری کی پوری برادری بدنام نہیں ہوتی۔ کسی کی ایک انگلی زخمی ہو جائے تو وہ مکمل طور پر اپنا چم نہیں کھاتا۔ میں صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ ہماری حکمران پاکستان ڈسکے چھپے کناہوں کو ختم نہیں کر سکتی تھی لیکن سرعام ہونے والے گناہوں کا سدباب کر سکتی تھی۔ لہذا بازار حسن بند کر دیئے گئے۔ اب وہاں سرعام جسم فروشی نہیں ہوئی لیکن چند شیطان صفت لوگ بچلے سے عورتیں لا کر وہاں فروخت کرتے ہیں۔ عورتوں کی خرید و فروخت کا مذموم دھندا چل رہا ہے۔ ان کا یقیناً حاسب کیا جا رہا ہو گا۔ ایک دن وہ ضرور گرفت میں آئیں گے لیکن ان کی وجہ سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں جسم فروشی کا کاروبار ہوتا ہے پورے ملک کو بدنام کرنا دانشمندی نہیں ہے۔ اگر میں نے اور مونا نے ایک خطا کی ہے تو اس سے پاکستان بدنام نہیں ہو گا۔"

دکیل نے میز پر مکہ ہاتھ ہونے کلمہ "لیکن اگر میری قوم میں بدنام کرتی ہے ہم پر ہنسی ہے۔ کتنی ہے ایشیائی لوگ ایسے ہی جرائم پسند ہوتے ہیں۔ اسی لئے انہیں یہاں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔"

"آپ اور ہم ان کی باتوں کا مقول جواب دے سکتے ہیں۔ صرف ایشیاء کے ممالک سے نہیں، یورپی ممالک سے بھی سکتے ہی چور، بدعاش، اسمگلر اس ملک میں آتے ہیں۔ یہاں کی جیلوں میں یورپ کے بڑے بڑے گناہکار مجرم نظر آئیں گے اور جو مجرم گرفت میں نہیں آتے، وہ بڑے بڑے گلیوں میں، بڑی بڑی تقریبوں میں شریف انسانوں کے روپ میں دکھائی دیں گے۔"

"تم دوسروں کی نہیں صرف اپنی اور اپنے ملک کی باتیں کرو یا ایشیاء کی بات کرو۔"

"میں اپنی بات کرتا ہوں۔ اگر ہم مجرم ہیں، اگر ہم غیر قانونی طور سے یہاں آئے

ہیں تو مونا کے وہ مضامین پڑھ لیجئے جو پچھلے دنوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ جو لوگ ایشیاء میں اپنے اپنے ملک کے منفرد شہری ہیں، ان کے ملک کی حکومت ان کے ملک کا سفارت خانہ، ان کا پناہ گزین ان کا اہلیتہ سرٹیفکیٹ اور کرکٹ سرٹیفکیٹ جب یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ ہر طرح سے بے دارغ ہیں، کسی جرم میں بھی ملوث نہیں رہے، معزز شہری ہیں تو پھر انہیں یہاں آنے کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی؟ ہم سیدھے سادے لوگ ہیں۔ ہم نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم نے عہدے سے مجبور ہو کر، دوری سے مجبور ہو کر، قوانین سے مجبور ہو کر حالات سے مجبور ہو کر ایک چور راستہ اختیار کیا۔ سیدھی سی بات ہے کہ سیدھا راستہ کھول دو۔ کوئی شریف آدمی میزمارا ست کبھی اختیار نہیں کرے گا۔"

دکیل نے کلمہ "سیدھی سی بات ہے" میں یہاں برطانیہ کے قوانین کو چیلنج کرنے نہیں دیکھنا چاہا۔

کامران مایوس ہو گیا۔ اس دکیل سے بھی بات نہ بن سکی۔ وہ مونا سے ملنے کے لئے ٹھیک پانچ بجے دریاے نمبر کے ساحل پر پہنچ گیا۔ مونا جیلی برج کے پاس اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ پیچھے ہوئے شوخ رنگوں کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ بالوں میں پھول لگا رکھا تھا۔ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ لباس کا رنگ اور پھول کی شکلیں بتا رہی تھی کہ وہ بہت خوش ہے۔ کامران نے کلمہ "ایک طویل عرصے کے بعد میں تمہیں کھل کر مسکراتے دیکھ رہا ہوں۔ کہیں میری نظر نہ لگ جائے۔"

اس نے کلمہ "میرا آج ساتواں مضمون اخبار میں شائع ہوا ہے اور اتنا اچھا پڑاؤ پاس مل رہا ہے کہ بیان نہیں کر سکتی۔"

"تم ایسے خوش ہو رہی ہو جیسے میری شریک حیات کی حیثیت سے یہاں رہنے کی اجازت مل گئی ہو۔"

"میں صرف اپنے متعلق نہیں سوچتی۔ ہزاروں عورتوں کے متعلق سوچتی ہوں جو اپنے شوہروں کے ساتھ رہنے کے لئے جانے کیسے عذاب سے گزر رہی ہیں۔ ان کے دن رات کیسے گزرتے ہوں گے یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میں جب دیکھتی ہوں کہ میرے مضامین کا جواب خاطر خواہ مل رہا ہے، لوگ پسند کر رہے ہیں اور اعلیٰ سطح تک ان مضامین

کا چرچا ہو رہا ہے۔ اخبارات میں اس کا رد عمل ظاہر ہوتا ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔“

اس نے موناکو بڑی محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم بہت زیادہ مصروف ہو گئی ہو۔ روزانہ پبلک سروس بلڈنگ میں چھ گھنٹے تک مصروف رہتی ہو۔ اس کے بعد مضامین لکھنے میں جانے تمہارا کتنا وقت صرف ہوتا ہے۔ ایٹائی عورتیں اور مرد تم سے آکر ملاقات کرتے رہتے ہیں۔ مجھے یاد کرنے کی ذرا بھی فرصت نہیں ملتی ہو گی۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”جو کچھ کر رہی ہوں تمہیں حاصل کرنے کے لئے مخالف حالات سے لڑ کر تمہیں جت لینے کے لئے، بیشیش بیشیش تمہارے پاس رہنے کے لئے۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ کامران نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ آج تم نے خود ہی اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا ہے۔ کیا اس بات کا خدشہ نہیں ہے کہ مراو کہیں چھپ کر دیکھ رہا ہو گا۔“

”اس نے فون پر کہا تھا کہ بہت بیاہ ہے۔ اپنے کانچے سے نکل نہیں سکے گا۔ لہذا آج میں چار بجے میں پمیلی برج کے پاس ملاقات کروں وہ کسی طرح یہاں پہنچے گا لیکن میں چار بجے سے انتظار کرتی رہی، وہ نہیں آ سکا۔“

وہ کتا کچھ سے کرا کچھ ہے۔ اگر اس نے بیماری کی بات کی ہے تو وہ اس قدر بیاہ نہ ہو گا کہ یہاں تک نہ آ سکے۔ یقیناً چھپ کر ہمیں دیکھ رہا ہو گا۔

”دیکھنے دو۔ میں نہیں ڈرتی۔“ وہ اس کے اور قریب آ گئی۔ اس لمحے جیسے تمام کی تمام گمشدہ سمرتیں قریب آ گئیں۔ دریائے نمبر کی لہروں کو تم صم بہتی رہتی تھیں، اس لمحے ان کے بواؤ میں ترن امیلیا ان لہروں میں مستی بھری روانی تھی، پلک تھی، رقص تھا، جیسے دریا لہرا لہرا گزرتی ہے رہا ہو.....

لیکن کیا ہو سکتا ہے دشمن محبت نے خوب سوچ سمجھ کر یہ شرط عائد کی تھی کہ وہ تینوں ایک دوسرے سے ملیں گئے تو کھلی فضا میں۔ کسی چار دیواری میں ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ محبت تو ایک خوشبو ہے۔ وہ گلدان میں یا پر نیوم کی بوتل میں بند ہو کر مل سکتی ہے لیکن کھلی فضا میں ہوا کی طرح دور نکل جاتی ہے۔ مہا کی طرح پاس نہیں رہتی۔

انہیں جان بڑھ کر آواز سنائی دی۔ وہ ان کے قریب آتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”مداخلت کی معافی چاہتا ہوں۔ میں ابھی مراد کے پاس سے آ رہا ہوں۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ مونا سے ملنے کے لئے یہاں آنا چاہتا تھا لیکن گھر کے دروازے سے نکلنے ہی پر بڑا مشکل سے واپس اپنے بڑے روم میں گیا۔ وہاں سے فون پر مجھے اطلاع دی۔ اگر میں جلد نہ پہنچتا تو وہ طبیعت خستہ کے بعد دوبارہ گھر سے نکلنے کی کوشش کرتا۔ میرے آنے کے بعد بھی ضد کر رہا تھا کہ دوادے دو میں فوراً اچھا ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد مونا سے ملنے جاؤں گا۔“

مونا نے کہا۔ ”میں نے دیوانوں کے متعلق بہت کچھ سنا تھا مگر یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا کوئی دیوانہ میرے پیچھے پڑ جائے گا۔“

”مسز مونا کامران! وہ دیوانہ سہی لیکن اسے صرف میرا مریض سمجھو، پلیز اس سے ملاقات کرو۔“

”اس سے ملاقات کا وقت گزر چکا ہے۔“

”وہ حساب آج نہ کرو۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ وہ بستر پر آرام سے لینا رہے گا تو میں تمہیں لے آؤں گا۔ اسی نے مجھے بتایا ہے کہ تم یہاں مل سکتی ہو۔“

”وہ انکار کرنا چاہتی تھی۔ کامران نے کہا۔ ”تم چلیں گے۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ انکار نہ کرو۔“

وہ تینوں وہاں سے چلتے ہوئے اس جگہ پہنچے جہاں ڈاکٹر نے اپنی گاڑی پارک کی تھی۔ پھر وہ گاڑی میں بیٹھ کر کالج کی طرف جانے لگے۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ ”مراو پہلا مریض ہے جو میرے دائرہ اثر سے نکلتا جا رہا ہے۔ مسز کامران کے یہاں آنے سے پہلے سائیکلو جیکل ٹریٹ منٹ کا خاطر خواہ اثر ہو رہا تھا۔ بس ایک امید تھی کہ کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لے گا تو نازل ہو جائے گا لیکن اب وہ شکست اور احساس محرومی کے ایسے ایسے پیر پر ہے جہاں انسان جنونی انداز میں سوچتا ہے، عمل کرتا ہے اور پاگل خانے میں بھیج دیا جاتا ہے۔“

وہ کالج کے سامنے پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے گاڑی سے اتر کر دروازے کو چابی سے

کھولتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اسے باہر سے لاک کر دیا تھا اور اسے سمجھا دیا تھا کہ ہمارے آنے پر بستر سے نہ اٹھے۔“

لیکن وہ دروازہ کھول کر اندر آئے تو وہ بستر سے اٹھ کر اپنے بیڈ روم کے دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ ان کی آواز سن کر آ رہا تھا۔ پھر مونا کو دیکھتے ہی دروازے کے سارے کھڑا ہو گیا۔ خوش ہو کر اسے یوں دیکھنے لگا جیسے وہ تے ہوئے بچے کو اس کا گم شدہ کھلونا مل گیا ہو۔

کامران اسے بست دونوں کے بعد دیکھ رہا تھا اور بہت حیرانی سے دیکھ رہا تھا کیونکہ اب وہ پہچانتا نہیں جا رہا تھا۔ اس کے گال پتک گئے تھے۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر گئی تھیں بلکہ جسمانی طور پر وہ ہڈیوں کا ڈانچہ بنتا جا رہا تھا۔ داڑھی بڑھ گئی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنسن گئی تھیں۔ وہ اتنا لاغر! اتنا بے جان نظر! آ رہا تھا کہ دروازے کا سہارا لے کر کھڑا نہ ہوتا تو شاید فرش پر گر پڑتا اور اس طرح گرنا کہ پھر کبھی اٹھ نہ سکتا۔

اس نے کہا۔ ”مونا! تم نے مجھے بتایا نہیں کہ مراد کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ تم تو روز ہی ملتی رہی ہو۔“

اس سے پہلے کہ مونا جواب دیتی، مراد نے چونک کر کامران کو یوں دیکھا جیسے اب تک حرف مونا نظر آ رہی تھی۔ ساری دنیا گم ہو گئی تھی۔ کامران کو دیکھتے ہی اس نے غصے سے کہا۔ ”تنت..... تم کیوں آئے ہو۔ چلے جاؤ یہاں سے“ میں تمہیں.....“

وہ بات پوری نہ کر سکا۔ قہر قہر کانپنے لگا۔ کامران نے آگے بڑھ کر اسے قہام لیا۔ نرمی سے کہنے لگا۔ ”غصہ بعد میں دکھالیا۔ تم نے مجھ سے بڑی دشمنی کی ہے لیکن میں اس حالت میں تم سے دشمنی نہیں کر سکتا۔ آؤ بستر پر لیٹ جاؤ۔“

وہ اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے اسے دوسری طرف سے پکڑ لیا۔ پھر وہ دونوں اسے زبردستی بیڈ روم میں لے گئے۔ اسے بستر پر بٹھانا چاہا۔ وہ بیٹھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ مونا سے دور رہنا نہیں چاہتا تھا۔ مونا نے کہا۔ ”مراد! میں کامران کے ساتھ آئی ہوں۔ ہم یہاں سے ساتھ جائیں گے۔ اس لئے کامران کو جانے کے لئے نہ کہو۔“

وہ غصے سے گرفتاریت سے چیخے ہوئے بولا۔ ”میں کون گم میں اسے بھگا دوں گا۔ یہ ہمارے درمیان ایک دیوار ہے۔ ڈاکٹر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ مجھے پھٹی کھانے کا شوق ہے لیکن یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ کتنا گلے میں انک سکتا ہے اور یہ میرے گلے میں انک گھسیا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ کامران کو پیچھے کی طرف دھکا دینا چاہتا تھا لیکن خود ہی اپنا توازن نہ مضبوط رکھ سکا۔ بری طرح کانپتے ہوئے گرنے لگا۔ ڈاکٹر اور کامران نے پھر اسے سنبھال لیا۔ زبردستی بستر پر لٹا دیا۔ وہ بستر پر چل رہا تھا۔ تڑپ کر ان کی گرفت سے لٹکا چاہتا تھا لیکن اس قدر تباہی تھی کہ پوری توانائی سے تڑپ بھی نہیں سکتا تھا۔

مونا نے بڑے ہی سخت الفاظ میں تنبیہ کی۔ ”اگر تم خاموشی سے بستر پر لیٹنا نہیں چاہو گے تو میں ابھی واپس چلی جاؤں گی۔“

یہ سننے ہی وہ تڑپا اور چلتا بھول گیا۔ بالکل ساکت ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ”مجھے چھوڑ دو۔ میں بستر پر لیٹا رہوں گا مگر تم میرے سامنے رہنا میں تمہیں دیکھنا نہیں گم کہ تم سے باتیں کرتا رہوں گا۔“

انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ چپ چاپ بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ مونا کو کھٹکے لگا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں ایک دوا دے رہا ہوں۔ اس کے اثر سے دماغ پر سکون رہے گا پھر تم آرام سے سو جاؤ گے۔“

”نہیں“ میں نہیں سونا نہیں چاہتا۔ میں.....“

مونا نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”میں یہاں تمام رات کھڑی نہیں رہ سکتی۔ تمہیں مطمئن ہے کیارہ بچے سے میری ڈیوٹی ہے۔ مجھے ہاسٹل جانا ہے پھر کھانے پینے کے بعد تیار ہو کر ڈیوٹی پر حاضر ہونا ہے اس لئے ڈاکٹر جو دوا دے رہے ہیں اسے کھا لو اور آرام سے سو جاؤ۔“

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ ڈاکٹر نے ایک دوا اس کی طرف بڑھائی، پانی کا گلاس بھی سہا۔ مونا نے کہا۔ ”تم نے مجھ پر پابندی عائد کی تھی کہ میں چار دیواری میں کسی سے ملاقات نہ کروں۔ اس کے باوجود تم سے ملنے آئی ہوں۔ کیا تم میری بات نہیں مانو گے۔“

دوا نہیں کھاوے؟

اس نے دوا لے لی۔ دوسرے ہاتھ سے گھاس تھام لیا۔ پھر اس دوا کو منہ میں ڈال کر پانی پیتے لگا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”شہناش تم اس طرح ہماری بات ماننے رہو گے تو جلد صحت یاب ہو جاؤ گے۔“

اس نے گھاس لے کر قریبی میز پر رکھ دیا۔ پھر کہا۔ ”مراوا! اب تم چاروں شانے چٹ لیت جاؤ، ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دو۔ اپنے دماغ میں صرف ایک خیال قائم کر دو وہ خیال یہ ہے کہ ایک شینے نے تمہیں اس حال کو پہنچایا ہے، تم مرد ہو، ایک عورت کے ہاتھوں شکست نہیں کھاؤ گے۔ مردوں کی طرح زندہ رہو گے اور مرد بھی ایک عورت کا انتقام دوسری عورت سے نہیں لیتا۔“

اس نے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا لیکن آنکھیں کھولے مونا کو دیکھے جا رہا تھا۔ مونا نے کہا۔ ”آنکھیں بند کر لو۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”آنکھیں بند کر کے بھی تم مونا کو دیکھ سکتے ہو، یقین نہ ہو تو آزا لو۔“

مراو نے آنکھیں بند کر لیں۔ یقیناً وہ بند آنکھوں کے پیچھے نظر آ رہی تھی اس نے اس نے آنکھ نہیں کھولی۔ ڈاکٹر نے اشارے سے مونا اور کامران کو دوسرے کمرے میں جانے کے لئے کہا۔ وہ دونوں دبے قدموں سے چلتے ہوئے بیڈ روم سے باہر نکل گئے اور دوسرے بیڈ روم میں پہنچ گئے۔ وہاں کامران نے کمرے کو بند کرتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر کہا۔ ”ہم کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ تمہیں یہاں بلائے وقت کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ہم یہاں ایک دوست نما دشمن کے سامنے بے بس ہو جائیں گے اور دشمن بھی ایسا ہے جس کے لئے ہم موت کی دعائیں مانگ سکتے۔ وہ خود ہی مرد رہا ہے مگر مرتے مرتے بھی پیچھا نہیں چھوڑ رہا ہے۔“

”کامران اس کا ذکر نہ کرو۔ میں تھک گئی ہوں۔ پریشان ہو گئی ہوں۔“

وہ ایک ہاتھ سے سر تھام کر بستر کے سرے پر بیٹھ گئی۔ کامران نے اسے ہمدردی اور محبت سے دیکھا۔ بے چاری کتنی پریشان ہو رہی تھی۔ اس پر کتنا ترس آ رہا تھا۔ کتنا

خوبصورت لباس پہنا ہوا تھا۔ اس پر خوب ج رہا تھا۔ اس کے بالوں میں جو پھول تھا، وہ ایک اشارہ تھا۔ اپنی زبان بے زبانی سے کہہ رہا تھا، کاش! میں ایک پھول ہوں۔ میری گفتگو تمہارے لئے ہے۔

باہر رات کی سیاہی پھیل رہی تھی۔ اندر خوابگاہ میں خاموشی تھی، تنہائی تھی اور دوسری خواب گاہ میں دشمن سو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔ پھر ”قریب ہی بستر کے سرے پر بیٹھ گیا۔ آہستگی سے بولا۔ ”تم بہت پریشان ہو۔“

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ کامران نے اس کے ایک ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ تب اس نے چوک کر پہلے تو اپنے ہاتھ کو دیکھا پھر سرگھما کر بند دروازے کو دیکھا۔ یکبارگی رُخپ کر اپنے ہاتھ کو پھراتے ہوئے دور کھٹک گئی۔ کامران نے حیرانی سے پوچھا۔

”کیا ہوا؟“

مونا نے جواباً پوچھا۔ ”تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

”مونا! کسی باتیں کرتی ہو۔ میں تمہارا شوہر ہوں۔“

”شوہر؟ کیسا شوہر؟ کیا نہیں جانتے کہ عورت بیوی بننے سے پہلے اپنے مرد کے لئے

دلہن بننا چاہتی ہے؟

میرے پاس آنا ہی چاہتے ہو تو جواب دو، مندی کی مک، سناگ کا جوڑا اور میری تھک کہاں ہے؟

دلہن کا وہ انتظار کہاں ہے جو سناگ کی سچ پر ہوتا ہے؟ دولہا کے قدموں کی پہلی اہٹ پر دلہن کا چوک جانے والا وہ لمحہ کہاں ہے؟

وہ گھونٹ کھل ہے جس کی اوٹ سے عورت پہلی بار مرد کے سامنے طلوع ہونا چاہتی ہے؟“

کامران نے بیٹھے ہی بیٹھے اس کی جانب ذرا کھٹکتے ہوئے کہا۔ ”اوہ گلاؤ تم کتنی

مناں اور جذباتی ہو۔“

وہ لکھت اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”میرا ہاتھ تھامنا چاہتے ہو تو پہلے دروازہ کھولو۔“

لکھ دیا ہے کہ بیدار ہوتے ہی وہ مجھ سے رابطہ قائم کرے۔"

وہ ڈاکٹر کی کار میں آکر بیٹھ گئے۔ کارمان نے کہا۔ "ہماری وجہ سے آپ کو بڑی زحمت ہوئی ہے ہم اگلی شاہراہ سے نیکی میں چلے جائیں گے۔"

"مجھے بھلا کیا زحمت ہوگی۔ میں اپنے مریض کے لئے پریشان رہتا ہوں۔ مجھے مراد کی بڑی فکر ہے۔ میں اپنے کسی مریض کا علاج کرتے ہوئے ٹاکہ نہیں چاہتا۔ کسی طرح اس کا کامیاب علاج کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ مجھ سے تعاون نہیں کر رہا ہے۔"

مونٹا نے کہا۔ "ڈاکٹر! میری وجہ سے یہاں پریشانی بڑھ رہی ہیں۔ سوچتی ہوں جب میں اپنے شوہر کی بیوی بن کر نہیں رہ سکتی تو یہاں کیوں رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے یہاں سے چلے جانا چاہئے۔"

مرز کارمان! پلیز ایسا فیصلہ نہ کریں۔ وہ بے موت مرجائے گا۔"

"وہ تو مری رہا ہے۔ ہم آپ کیا کر سکتے ہیں۔"

"ڈاکٹر مریض کی آخری سانس تک مایوس نہیں ہو۔ اے بچانے کی کوشش کرتا ہے میں بھی بچانے کی کوشش کروں گا بشرطیکہ تم تعاون کرتی رہو۔"

"مجھے انوس ہے" میں دو میں سے کوئی ایک راست اختیار کر سکتی ہوں۔ یا تو واپس چلی جاؤں یا قانون کے مخالفوں کے سامنے اس بات کا اقرار کر لوں کہ میں نے یہاں قانون کے خلاف قدم رکھا ہے۔ میں کسی ایسے کارمان مرتضیٰ کی بیوی نہیں ہوں جو پہلے رضا مراد تھا۔"

کارمان نے پوچھا۔ "یہ کیا غضب کرو گی؟ تمہیں جیل ہو سکتی ہے۔ تمہارے ساتھ میں اور مراد بھی فراڈ کے کیس میں دھرنے جائیں گے۔"

"اسی لئے تو کہتی ہوں، بیچ کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو بھولا نہیں کھلا۔ ہم نے جو غلطی کی، اس کی تلافی خود ہی کر لیں۔ میں یہاں سے چپ چاپ چلی جاؤں تو بہتر ہو گا جب میں نے ایگریمنٹ کے تحت قوانین کے خلاف فائٹ کرنے کا مناسب راستہ اختیار کر رکھا ہے تو یہ نامناسب راستہ کیوں اختیار کیا جائے۔ میں جلد سے جلد چلی جاؤں گی۔"

"نہیں مونٹا! تم نہیں جاؤ گی۔ میں یہاں تمہیں دیکھ کر رہا ہوں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھنے ہوئے بولا۔ "میں جانتا ہوں تم ازدواجی معاملات میں ایک حلیہ چاہتی ہو۔ عورت کا وہ مان چاہتی ہو جو دلن بن کر حاصل ہوتا ہے لیکن یہ تو سوچو خدا نخواستہ تمہیں یہاں سے واپس جانا پڑا تو میں تمہاری حسرت ہی کرتا رہ جاؤں گا۔"

"میں کچھ نہیں جانتی، میرے پاس آنا ہے تو پہلے عورت کا مان اور مرتبہ دینے آؤ۔ میں راستے میں پڑا ہوا مسک نہیں ہوں کہ اٹھا لیا۔"

میں بیک گارڈن میں کھلے والا پھول نہیں ہوں کہ چلتے پھرتے توڑ لیا۔ کای! میری زندگی کی ایک سب سے اہم رات مجھ سے بچھین لی گئی۔ مجھے وہ رات واپس لاؤ، واپس لاؤ، جب تک نہ لا سکو کسی چار دیواری کا دروازہ بند نہ کرو۔ کھول دو۔ خدا کے لئے اسے کھول دو۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چمپا کر رونے لگی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کارمان کا جھکا ہوا سر تسلیم کر رہا تھا کہ بیوی اپنے میاں کے قدموں تلے زمین کی طرح بھیج رہی ہے مگر اپنی سرشت میں آسمان ہوتی ہے۔ یوں تو اسے بڑی آسانی سے قدموں تلے روند ڈالو لیکن اس کی تمام تر انسانیت کے ساتھ اسے حاصل کرنا ہو تو آداب طلب سے مانگو زمین سے مانگو تو سر جھکا مانگو آسمان سے مانگو تو ہاتھ اٹھا کر مانگو۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے تک آیا۔ اسی وقت ہلکی سی دسک سنائی دی۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ ڈاکٹر جان بفر کھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مونٹا دوسری طرف منہ پھیر کر آنسو پونچھنے لگی۔ ڈاکٹر نے ان کی کچھ باتیں سن لی تھیں۔ باتیں سننا اور بات ہے سمجھنا اور بات ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیوں رو رہی ہے اپنے میاں کے ساتھ تو بیوی کو خوش رہنا چاہئے۔ اس نے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔ "سوری" میں نے پھر ڈسٹر کیا ہے۔"

کارمان نے کہا۔ "کوئی بات نہیں آئیے۔"

"اب ہمیں چلنا چاہئے" وہ گمری نیند سو رہا ہے۔"

وہ دے قدموں چلتے ہوئے کالج کے باہر آئے، ڈاکٹر نے بیرونی دروازے کو لاک کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی ایک چابی میں نے مراد کے سرہانے رکھ دی ہے۔ ایک پیغام

اس نے پوچھا۔ ”خاموش کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟“

اس کی ایک مہری سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ پھر اس نے کہا۔ ”کیا بولوں؟“
 ”نہیں مگر ہشتے سے روکوا؟“

”تمہیں کس دھڑے سے روکواؤ؟“

”کیوں ہمارے دریاں کوئی رشتہ نہیں ہے؟“

”ہم میاں پوی نہیں کاغذ کے پھول ہیں۔ ابھی ہمارے اندر ازواجی زندگی کی خوشبو نہیں ہے، میرے پاس وہ حقوق بھی نہیں ہیں جنہیں استعمال کر کے تمہیں جلنے سے روک سکوں۔“

”تمہارے پاس تمام حقوق ہیں لیکن میری مجبوری سمجھو۔“

”مجھ رہا ہوں اس لئے کچھ بول نہیں سکتا۔ اگر تم میرے نام سے، میرے رشتے سے آتمس، یہاں کا قانون تمہیں میری شریک حیات تسلیم کرنا تو میں تمہیں جس جالے نہ دیتا۔“

”میں خود نہ جاتی۔ کیا اپنی منزل پر پہنچ کر کوئی واپس جاتا ہے؟“

”بعض بیواں لڑ بھڑک کر جاتی ہیں۔ میں تمہیں لڑنے کا موقع بھی نہ دیتا۔ تمہیں محبت سے سمجھاؤ۔ محبت سے نہ سمجھیں تو لڑائی کرنا۔ ابھی تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ سنا ہے چاہنے والے کچھ دھاگے سے بندھے رہتے ہیں۔ میں تو کچا دھاگا بھی نہیں ہوں۔“

”ہمی تم ایسی باتیں نہ کرو۔۔۔۔۔ میں تمہاری بیوی ہوں تمہارے ایک حکم پر اپنی جان دے سکتی ہوں۔ کبھی تمہاری نافرمانی نہیں کر سکتی لیکن مجبوری کو سمجھو۔ کیا یہ اچھا لگتا ہے کہ میں ایک ایسے پاگل، جنونی شخص کے حوالے سے رہوں جو دن بہ دن ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہو۔ پھر یہ کہ ہم ایک غلطی کرنے کے بعد اس کی تلافی کیوں نہ کریں؟ حتیٰ ٹھوکریں کھانے کے بعد ہمیں سیدھا راستہ ڈھونڈنا چاہئے اور میں نے ڈھونڈ لیا ہے اسی لئے جا رہی ہوں۔ اور جا رہی ہوں تو کیا ہوا؟ تمہارے دل سے تو کبھی نہیں جاؤں گی۔“

”جس دل میں سے تم کبھی نہیں جاؤ گی“ وہ دل ہی نہیں مانا۔ میں حالات کو ابھی طرح سمجھتا ہوں۔ تم یہاں رہ کر بھی مجھے نہیں مل سکتیں۔ میں اپنے دل پر پتھر رکھنے کی کوشش کروں گا۔“

وہ ایک گمراہ سانس لے کر بولی۔ ”ہمارے مذہب میں اس لئے پردے کی اوجیت کا احساس دلایا گیا ہے کہ کسی کو نہ دیکھو، نہ سمجھو، نہ تو حصول کی جتنا مشقت اختیار کرنے گی۔ میں واپس چلی جاؤں گی۔ تمہاری نگاہوں سے پردہ کر لوں گی تو تمہیں بھی صبر آ جائے گا۔“

وہ ہاٹل کے سامنے گاڑی سے اتر گئی۔ ارادہ تھا کہ پاکستان جانے کے لئے طیارے میں سیٹ حاصل کرنے کے لئے فون سے معلومات کرے لیکن وہ ہاٹل میں پہنچی اور گفتگو کے سامنے اپنے فیصلے کا اظہار کیا تو وہ بولی۔ ”تمہارے جانے سے ہمارے لئے کوئی فرق نہیں پڑے۔ مگر جس انداز میں تم کہہ رہی ہو اور حساس دلوں کو متاثر کر رہی ہو یہ قلمی جناب پاکستان میں رہ کر بھی جاری رکھ سکتی ہو لیکن جانا ہے تو پرسوں کے بعد کسی دن بھی جا سکتی ہو۔ پرسوں ہم تمام ایشیائی باشندے ایسگریٹن کے سخت قوانین کے خلاف جلوس نکال رہے ہیں۔ تمہارا اس میں شریک ہونا ضروری ہے۔“

مونا کی مصروفیات بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ جلوس کو ترتیب دینے، ایشیائی ممالک کے سفارت خانوں اور برطانوی حکام تک اپنی آواز پہنچانے کے سلسلے میں نظم و ضبط قائم رکھنا ضروری تھا۔ اسی کے لئے لائحہ عمل تیار کیا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ مونا اور کھٹنکا سے ملے ہاسٹل آئے تھے۔ مونا رات کے دس بجے تک ان کے ساتھ مصروف رہی۔ پھر وہیں سے اپنا ڈیوٹی پر چل گئی۔ اس دوران اس نے فون کے ذریعے معلوم کیا جو تھے دن کی فلائیٹ میں اسے ایک سیٹ مل سکتی تھی۔ اس نے کھٹنکا کو اس سلسلے میں رقعہ دی تاکہ وہ اس کے لئے کنٹ لے کر رکھ لے۔ وہ اسپتال پہنچ کر کامران کو فون کے ذریعے اپنی روانگی کے متعلق بتانا چاہتی تھی۔ وہیں انکو ایڑی کا ٹنڈر پکڑنے پر پہنچا دیا چلا کامران کا فون ہے۔ وہ اسے پوچھ رہا ہے۔

اس نے ریسپور اٹھا کر کہل ”میں ڈیوٹی پر آگئی ہوں۔ ہمیں فون کرنا چاہتی تھی۔ اچھا ہوا تم نے ہی کر لیا۔ میں نے اپنے لیے سیٹ ریزرو کر لی ہے چوتھے دن کی فلائٹ سے جاری ہوں۔“

دوسری طرف خاموشی رہی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کامران پر سکتہ طاری ہو گیا ہو

وہ تھوڑی دیر تک باتیں کرتے رہے پھر مونا نے کہا ”گیارہ بجنے کے لئے دس منٹ ہیں۔ دس منٹ میں اپنی ڈیوٹی کے لئے تیار ہونا ہے۔ اس لئے اجازت چاہتی ہوں کل صبح رابطہ قائم کروں گی۔“

اس نے ریسپور دکھ دیا۔ دوسری طرف سے کامران ریسپور لئے بیٹھا سوچتا رہا..... خیالوں میں اسے دیکھتا رہا۔ ابھی وہ موجود تھی اور خیالوں میں اسے دیکھ رہا تھا۔ جب چلا جانے کی تب بھی خیالوں میں ہی اسے دیکھتا اور ملتا رہے گا۔ انگریزین کے قوانین نے بیوی کو وہ محمود عورت بنادیا تھا جو گناہ کی طرح صرف خیالوں میں آتی تھی۔ دوسرے دن مونا کا مضمون اخبار میں شائع ہوا۔ اس کا عنوان تھا ”بدنام سماگن“ اس نے لکھا تھا۔

”ہم وہ سماگن ہیں جن کے پاؤں تلے زمین نہیں : تی ہم کبھی انگلینڈ میں شوہر سے ملے آتی ہیں، کبھی بچوں کی پرورش کے لئے اپنے دیس میں رہتی ہیں۔ جس کے پاؤں تلے زمین نہیں ہوتی وہ کبھی نیک نام نہیں ہوتی۔ میں ایسی عورتوں کو جانتی ہوں جو انگلینڈ میں آتی ہیں تو اپنے سراج میں مٹھوک ہو جاتی ہیں۔ لوگ باتیں بناتے ہیں۔ آیا وہ عورتیں اپنے اپنے شوہر سے ملنے جاتی ہیں یا شوہروں کی آڑ میں کچھ اور ہی کل کھاتی رہتی ہیں۔ انسانی تہذیب کے خاص اصول و ضوابط ہیں جن پر عمل کر کے انسان غیر انسانی عمل سے دور رہتا ہے اور ایک دوسرے کے لئے مغبوطی اور تحفظ کی ضمانت بنتا ہے۔

تہذیب میں ازدواجی زندگی کے اصول یہ ہیں کہ میاں بیوی ایک گھریں اور ایک ملک میں رہیں۔ اگر روزگار حاصل کرنے کے لئے میاں دوسرے ملک میں جاتا ہے تو بیوی اس کی عزت کا اپنی آبرو کا اس کے نام کا اپنی نوسائیت کا اور اس کے اور اپنے خاندان کی شرافت کا بھرم رکھتی ہے لیکن پرانے ملک میں روزگار کی مدت پورتی جائے اور شوہر تنہا رہے اور بیوی اس کا انتظار کرتی رہے تو پھر یہ تہذیب کے مثالی ہے۔ جو اصول یا جو قانون میاں بیوی کو الگ کرتا ہے وہ گمراہی اور بے اعتمادی کے راستے ہموار کرتا ہے۔ ہمیں سے شیطانی تہذیب کے اصول کار فرما ہوتے ہیں۔ میں ایسی ہی عورتوں کو جانتی ہوں جو مدتوں اپنے دیس میں شوہروں کا انتظار کرتے کرتے گمراہ ہو گئیں۔ وہ سماگن کسی کے

ام سے تھیں“ بدنام کسی کے نام سے ہوئیں۔ یہی حال شوہر حضرات کا ہے وہ یہاں انگلینڈ میں اپنا غم غلط کرنے کے لئے شراب کا سارا لینے ہیں۔ گلیوں میں جاتے ہیں۔ تہذیب ایک بیوی کا ہاتھ انہیں پکڑاتی ہے۔ شیطانی تہذیب ان کے آس پاس عورتوں کا میلہ لگا دیتی ہے۔

اس کے باوجود شوہر حضرات بدنام نہیں ہوتے۔

بدنام تو سماگنیں ہوتیں ہیں خواہ وہ پارسا رہیں یا اپنی پارسی کو نہیں پہنچائیں۔ عیسٰی پہنچانے میں اس قانون کا ہاتھ ہے جو میاں بیوی کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے ہوس اقتدار یا سیاسی مصلحتوں کی بنا پر سرحدی لائن کھینچ کر ملکوں کو تقسیم کرنے والی باتیں تو سمجھ میں آتی ہیں لیکن میاں بیوی کے محبت بھرے رشتوں کے درمیان سرحدی لائن کھینچنے کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ قانون بے شک انسانی بھلائی کے لئے ہے پھر ایسا قانون کیوں بنایا جاتا ہے جو انسانوں کے درمیان برائیاں پیدا کرنا چلا جائے۔

اگر حکومت برطانیہ بیرونی ممالک سے اور خصوصاً ایشیاء سے آنے والوں کا تحفظ کرتی ہے، ان کی فلاح و بہبود کے لئے سوچتی ہے اور ان کے لئے قوانین مرتب کرتی ہے تو پک جھپٹے ہی یہ تمام برائیاں اور بدنامیاں ختم ہو سکتی ہیں۔ صرف انگریزین کے قوانین میں ذرا سی پگ پیکرادی جائے۔“

دوسری صبح مونا نے وعدے کے مطابق فون کیا۔ کامران نے پوچھا۔ ”کلت ہو گیا؟“

”جی تو میں ڈیوٹی سے آف ہوئی ہوں۔ میں سے فون کر رہی ہوں۔ کلنگلا کا فون آیا تھا۔ اس نے کلت کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ کہہ دی تھی میں ہاسل آؤں گی تو مجھ سے تفصیلی گفتگو کرے گی۔ ویسے میں نے، کلنگلا نے بلکہ یہاں کی بہت سی عورتوں اور مردوں نے ایک بنا منصوبہ بنایا ہے۔ اس منصوبے کے مطابق ہم حکومت برطانیہ کے سامنے یہ انکشاف کر رہے ہیں کہ انگریزین کے مخالفانہ قوانین کے باعث یہاں کتنی ہی عورتیں اور کتنے ہی مرد غیر قانونی طور پر آئے ہوئے ہیں۔ کل اخبارات کے ذریعے انکشاف ہو گا اور ہم جلوس میں بھی اسی قسم کے پلے کارڈز اٹھائے رکھیں گے۔“

کامران نے پریشان ہو کر پوچھا ”کیا تم خود کو ایکسپوز کرو گی کہ کسی فرضی کامران مرتضیٰ کے حوالے سے یہاں آئی ہو؟“
”بے شک میں اعتراف کروں گی۔“

”یہ کیا حماقت ہے۔ اس طرح تو مراد بیل چلا جائے گا۔ تمہیں بھی حراست میں لیا جائے گا۔ ہمارے ملک کے سفارتخانے کے افسران بھی ہمارا محاسبہ کریں گے۔“

”کاش! آدی ڈرتا ہے تو پھر ڈرتا ہی رہ جاتا ہے۔ پہلے میں ڈرتی تھی کہ اپنے ملک میں رہ کر تم سے کس طرح جدا رہوں گی لیکن یہاں آ کر تمہارے قریب رہ کر بھی تم سے الگ رہنے لگی تو حوصلہ پیدا ہو گیا۔ اب میں تم سے الگ ہوں، اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہی ہوں۔ اس طرح مجھ میں دواہں جانے کا حوصلہ پیدا ہو گیا ہے۔“

”تم کچھ زیادہ ہی حوصلہ مند ہوتی جا رہی ہو۔ چپ چاپ جانے کا فیصلہ کر لی لیا ہے تو یہاں اپنے بارے میں انکشاف کیوں کرو گی؟“

”اس لئے کہ ہماری غلطی آئندہ کوئی دوسری نہ دوہرائے۔ یہاں قانون کے محققین کو معلوم ہو جائے کہ ایسا بھی فراڈ ہوتا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دوسرے ایسیائیوں کے لئے راستہ بند کر رہی ہو۔“
”ایسا راستہ جو اخلاقی کمپنی کی طرف لے جاتا ہو، اسے بند کر دینا چاہئے۔“

”یہ راستہ یوں بھی بند کر سکتی ہو کہ چپ چاپ یہاں سے دواہں چلی جاؤ۔ وہاں جا کر اخبارات میں لکھو کہ میان یوی مجبور ہو کر..... فرضی میاں کا پتھر چلائے ہیں اور اس کے نام سے اس کے حوالے سے اپنی یوی کو لندن بلائے ہیں۔“

”تم مجھے دواہں جا کر تحریری طور پر جہاد کا مشورہ دے رہے ہو جبکہ یہاں ہزاروں عورتیں اور مرد عملی طور پر مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں باقی ہوں، تحریری جہاد بڑی اہمیت کا حامل ہے لیکن عملی جہاد کا موقع آئے تو غلہ کاروں کو بھی اس صف میں شامل ہونا چاہئے اور میں شامل ہو رہی ہوں۔“

”یعنی تم اپنی غلطی کی تشریح کر کے ہی رہو گی۔“
”یہ صرف میری یا تمہاری غلطی نہیں ہے، ایک مسلمان یا ایک پاکستانی کی غلطی

نہیں ہے، یہ انسانی غلطی ہے۔ ایسی غلطیاں ہندوستان کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ برہا، بنگلہ دیش اور سری لنکا کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایشیاء کے کتنے ہی ممالک کے لوگ۔ اس لئے ایسا کرتے ہیں کہ وہ انسان ہیں۔ کبھی نادانستہ یا بےحالت مجبوری کوئی غلطی ہو جائے تو وہ قاتل مسمانی ہیں۔ لہذا اس غلطی کے نقصان وہ نتائج کی تشریح کر جائے۔ لوگوں کو بتایا جائے کہ ہم نے جو کیا ہے اسے کوئی نہ دہرائے۔ اگر کوئی دہرائے گا اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہ کر غلطیوں کو چھپانے کا کہ چھپانے سے اپنی عزت اور اپنے ملک کا وقار قائم رہے گا تو یہ بڑی حماقت ہو گی۔ چھپانے سے بات نہیں بنتی۔ مجھے خبر ہے کہ میں پاکستانی ہوں اور یہ ہماری اعلیٰ طرفی ہے کہ ہم اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے اس کی نشاندہی کر رہے ہیں اور یہ راستہ بند کرنے کی حتی الامکان کوشش کر رہے ہیں۔“

دونوں میاں یوی کے درمیان دیر تک فون پر بحث ہوتی رہی۔ پھر کامران نے کہا۔
”شام کو ملاقات ہو گی تو ہم اس سلسلے میں اپنے اپنے دلائل پیش کریں گے اور کسی نتیجے پر پہنچیں گے۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ جب وہ بائبل میں پہنچی تو اپنے ٹائم ٹیبل کے مطابق فینڈ پوری نہ کر سکی۔ ٹھٹھکانے لے تپایا۔ ”ابھی پریس کلب میں ایک میٹنگ ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق جتنی عورتیں، مرد اور بچے انٹیکریشن قوانین سے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں، ان کے بیانات کل کے اخبارات میں شائع ہوں گے۔ ادھر ہم جلوس نکالیں گے۔ ادھر اخبارات میں دھماکہ خیز بیانات شائع ہوں گے۔ اس طرح ہماری تحریک بڑی کامیاب ہو گی۔“

مونانے کہا۔ ”جب تک ہزاروں کی تعداد میں بیانات شائع نہیں ہوں گے، اس وقت تک یہ تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔“

”ایسے ہزاروں سینکڑوں افراد ہیں جو بیانات کے لئے پریس کلب آ رہے ہیں۔ ہمارے پاس خطوط آتے رہے ہیں۔ ان خطوط میں عورتوں، مردوں اور بوڑھوں نے اپنے مصائب کا ذکر کیا ہے۔ ان مصائب کا تعلق انٹیکریشن قوانین سے ہے۔ لہذا ان کے خطوط بھی اخبارات میں شائع کئے جائیں گے۔“

شکلا نے پی، آئی، اے کا ٹکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری خواہش کے مطابق پہنوں رات کی فلائٹ میں ایک سیٹ ریزرو ہو گئی ہے۔“
 مونہ نے ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد رضا مراد سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ پہلے تو کھنٹی بجتی رہی۔ وہ سمجھ رہی تھی، مراد گھر پر ہی ہو گا لیکن اس قدر کمزور ہو گا کہ شاید بستر سے اٹھ کر ٹیلی فون تک نہ پہنچ سکے۔ اس کا خیال درست تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی کمزوری آواز سنائی دی۔ جب مونہ نے اپنا نام بتایا تو اس کی آواز میں ذرا سی زندگی کی چمک پیدا ہوئی۔ وہ کل کر بولا۔ ”مونہ؟ تم؟ تم مجھے یاد کیا ہے؟ کیا میری دعا قبول ہو رہی ہے؟“

”دعا ہو یا دوا“ اگر مناسب ہو تو اثر کرتی ہے چونکہ تمہاری دعا مناسب نہیں ہے“
 تم کسی کا حق چھیننا چاہتے ہو اس لئے دعا قبول نہ ہو سکی۔ میں واپس جا رہی ہوں۔“
 وہ جلدی سے بولا۔ ”نہیں نہیں، تم نہیں جا سکتیں۔ تم بھلا کیسے جا سکتی ہو؟“
 ”کیوں نہیں جا سکتی؟“
 ”میں بیمار ہوں، کیا مجھے چھوڑ کر جاؤ گی؟“

”اس شہر کے بے شمار اسپتالوں میں بے شمار مریض پڑے ہوئے ہیں کیا میں ان کی خاطر رک جاؤں۔ اتنی بڑی دنیا میں میرے لئے ایک ہی خاص مریض تھا۔ جو پچھلے دنوں زخمی ہو کر اسپتال پہنچا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب وہ صحت یاب ہے۔ میں مطمئن ہو کر جا رہی ہوں۔“

رضا مراد ہاتھ میں ریسپور لئے گم سم بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کاپٹا ہوا ریسپور اس بات کا غماز تھا کہ اسے اندر ہی اندر غصہ آ رہا ہے اور وہ برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس سے بڑی ہلکت اور کیا ہوتی کہ مونہ اسے چھوڑ کر چلی جاتی اور وہ اس کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔ دوسری طرف سے مونہ کی آواز سنائی دی۔ ”تم چپ کیوں ہو؟ میں پر سوں رات کی فلائٹ سے جا رہی ہوں۔ اگر تم اس قابل ہو سکو کہ ایئر پورٹ آ کر الوداع کو تو ضرور آتے میں انتظار کروں گی۔“

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ وہ انتظار کرنے لگا۔ سمجھ رہا تھا کہ مونہ نے ریسپور

رکھ دیا ہے۔ اب اس کی آواز سنائی نہیں دے گی اور پر سوں کے بعد وہ دکھائی بھی نہیں دے گی۔

اس نے ریسپور کو کریڈل پر بڑی کمزوری سے بٹھ دیا۔ اس سے زیادہ جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں اتنا دم نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے ہی ایک قد آدم آئینہ تھا۔ وہ اپنے عکس کو دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کیا میں یہاں سے چل کر مونہ تک پہنچ سکتا ہوں۔ کیا مجھ میں اتنی توانائی ہے؟

وہ اپنی ری سٹی قوت کا اندازہ کر رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آئینے کے سامنے پہنچا۔ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر دیکھی تو داڑھی کو اور دھنسی ہوئی آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ مونہ کے پاس جانے کے لئے حلیہ درست کرنا ضروری تھا۔ یہاں سے وہاں تک پہنچے ہوئے اس نے دو دن بار خود کو آزمایا۔ پتا چلا، کالج سے نکل کر کار میں بیٹھ سکتا ہے اور کار ڈرائیو کر کے مونہ کے پاس پہنچ سکتا ہے۔

لیکن وہاں پہنچ کر کیا کرے گا؟ کیا اسنے دنوں کا تجربہ کافی نہیں ہے کہ وہ صرف اپنے شوہر کی ہے۔ شوہر کی رہنے گی اور بڑی بات تو یہ کہ اپنے مجازی خدا کے پاس پہنچ کر اس سے دور ہو رہی ہے۔

مراد بھی سوچ کر جھنجھلا رہا تھا۔ اس کے دور جانے سے کیا ہوتا ہے۔ کامران پاکستان پہنچ کر اس سے مل سکتا ہے لیکن وہ نہیں مل سکے گا۔ جب تک یہاں ہے اس وقت تک اپنی گرفت کسی طرح مضبوط کر سکتا ہے تو کر لے۔

وہ بستر کے سرے پر آکر بیٹھ گیا۔ ریسپور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ ایک دیکل سے رابطہ قائم ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”میں رضا مراد بول رہا ہوں۔ آپ نے میرے کارڈ بار کے سلسلے میں اکثر میرا ساتھ دیا ہے۔ اب ایک ذاتی معاملے کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں لیکن اتنا بیمار ہوں کہ آ نہیں سکتا ہوں۔“

”کوئی بات نہیں، میں شام کو آپ کے ہاں آؤں گا۔“

”شام تک بہت دیر ہو جائے گی۔ میں فوری طور پر آپ سے منگھو کرنا چاہتا ہوں۔“

میں رہ سکتا ہے اختیار ملنے لگا ہے۔ وہ ملتا ہوا ستر کے آئینے کی طرف گلید پھر وہاں سے واپس آیا تو یقیناً خیال آیا کہ تیار ہے، کمزور ہے، تباہ ہے، پلٹے پھرنے کے قابل نہیں ہے۔ وہ دھپ سے بستر پر بیٹھ گیا۔ یوں ہانپنے لگا جیسے دور سے دوڑتا آ رہا ہو۔ تھوڑی دیر تک وہ یوں ہی ہانپتا رہا اور سوچتا رہا میں بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ اس طرح غصہ کھا کر اسے زور زبردستی سے روک نہیں سکتا۔ مجھے عقل سے کام لینا چاہیے۔

اسی وقت ملازم نے آکر کہا۔ ”جناب! آپ کے لئے سوپ تیار ہے لے آؤں؟“
وہ جھنجھلا کر جواب دینا چاہتا تھا پھر چپ ہو گیا۔ اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔
”میں ابھی نہیں بیوں گا۔“

”جناب! ڈاکٹر صاحب نے تاکید کی ہے، آپ کو ضرور کچھ کھانا پینا چاہئے ورنہ آپ پلٹے پھرنے کے قابل.....“

اس نے گھور کر ملازم کو دیکھا۔ وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا لیکن مراد سوچ رہا تھا۔ یہ اور بات کہتا ہے۔ مجھے پلٹے پھرنے کے قابل ہونا چاہئے۔ زیادہ سے زیادہ کھانا پینا چاہئے۔ پھر اس نے کہا۔ ”اچھی بات ہے، لے آؤ۔“

اس نے فون کے ذریعے ڈاکٹر ستر سے رابطہ قائم کرنے کے بعد پوچھا۔ ”کیا تم چلتے ہو کہ وہ جاری ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔ کیا واقعی؟“

”ہاں، ابھی اس نے فون پر بتایا ہے۔ اس انداز میں جیسے چیلنج کر رہی ہو کہ میں اسے روک سکتا ہوں تو روک لوں.....“

”تم اسے روک نہیں سکو گے۔“

”میں کبھی شکست تسلیم نہیں کرتا۔“

”تم تسلیم کرتے ہو۔ تم آج تک ٹینس سے کھائی ہوئی شکست کو بھول نہیں پائے۔“

”وہج ہے کہ مونا کے ساتھ الجھ رہے ہو اور اس حال کو پہنچ گئے ہو۔“

”پلیز اگر تم اسے کسی طرح روک سکتے ہو تو میں تمہاری دوستی کو ساری عمر نہیں بھول سکتا۔“

”آپ نہایت مختصر طور پر بتائیں، معاملہ کیا ہے؟“

”میری بیوی میری مرضی کے خلاف پاکستان واپس جانا چاہتی ہے۔ میں اسے کس طرح روک سکتا ہوں۔ میں تیار ہوں۔ کیا وہ قانوناً مجھے چھوڑ جاسکتی ہے؟“

”آپ کی بیماری کے دوران جانے کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے درمیان کشیدگی ہے لہذا یہ کشیدگی باہمی سمجھوتے سے دور ہو سکتی ہے۔ اگر معاملہ طویل پکڑے تو پھر یہ بات عدالت تک پہنچے گی۔“

”اس وقت تک وہ جا چکی ہوگی۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے۔ مقدمہ چلے گا تو اسے پیشی پر حاضر ہونا پڑے گا۔“

”میں اسے یہاں کی عدالت میں نہیں بلا سکتا۔“

”کیوں نہیں بلا سکتے۔ آپ مجھے صاف صاف بتائیں۔“

”وہ کسی دوسرے کی بیوی ہے۔ میں اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں۔ وہ میرے نام اور حوالے سے یہاں آئی ہے لیکن پاکستان چلی جائے گی تو قانونی اور مذہبی لحاظ سے صرف اس کی بیوی ہوگی جس سے اس کا نکاح کر دیا گیا ہے۔“

”پھر تو بات ختم ہو گئی۔ آپ اسے کسی طرح نہیں روک سکیں گے۔ اگر آپ نے زبردستی کی اور اس نے آپ کے خلاف بیانات دیئے تو آپ اپنی سلاخوں کے پیچھے ہوں گے۔ کیونکہ آپ نے پرانی بیوی کو اپنے نام اور حوالے سے بلا کر یہاں کے امیگریشن قوانین کی نفی کی ہے۔“

وہ غصے سے بولا۔ ”آپ مجھے ہی مجرم ٹھہرا رہے ہیں۔ میں صرف اتنا پوچھ رہا ہوں کیا آپ کسی طرح بھی قانون کا سہارا لے کر میری بیوی کو جانے سے روک سکتے ہیں؟“

”سوری میں نہیں روک سکتا۔“

وہ غصے سے پھٹ پڑا۔ ایک دم سے دھاڑ کر بولا۔ ”تم بکواس کرتے ہو۔ تم وکالت نہیں کرتے۔ گھاس کاٹتے ہو۔ ٹوٹیل دودھ پیتے۔“

اس نے پھر ریسیور ہٹ دیا۔ اور تو کچھ اس کے آس پاس نہیں تھا۔ سارا غصہ ریسیور پر اتار رہا تھا۔ یہ فطری امر ہے کہ آدمی غصے کی حالت میں کھڑا ہوا تو ساکت

”مراد! جو ڈاکٹر ہمارا علاج کر رہا ہے“ وہ کہتا ہے تمہاری حالت بڑی تشویش ناک ہے۔ تمہارا دل اس قدر کمزور ہو گیا ہے کہ کسی وقت بھی دھڑکنابند کر سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں، شکست اور احساسِ محرومی نے تمہیں غصے اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا کرتے کرتے جوں کے اس مرحلے پر پہنچا دیا ہے، جنہاں انسانِ دماغی اور جسمانی طور پر بالکل کمزور ہو جاتا ہے۔“

وہ ناگوار سی بولا۔ ”تم اسے روک نہیں سکو گے خواہ خواہ مجھے نصیحتیں کرتے رہو گے؟“

اس نے ریسپور کریٹیل پر رکھ دیا۔ ملازم اس کے لئے نرے میں سوپ لے آیا تھا۔ اسے ایک چھوٹی سی میز پر رکھ کر جا رہا تھا۔ وہ ملازم کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا نام رشید تھا مگر شیدے کہلاتا تھا۔ چغاب سے سات برس پہلے آیا تھا۔ دو برس یہاں کام کرنے کے بعد ابھی خاصی رقم جمع کرنے کے بعد پاکستان گیا تھا۔ وہاں اپنی برادری کی ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔ شادی کے بعد جب سے آیا تھا پانچ برس ہو گئے تھے، مگر وہاں نہیں جاسکا تھا۔ ایک تو گھر والوں کے خرچ کے علاوہ پیوی کے بھی ذاتی اخراجات کے لئے کچھ نہ کچھ بھیجتا تھا۔ پھر منگلی دن بدن بوجھتی جا رہی تھی۔ پانچ برس پہلے وہ ایک ہزار روپے بھیجتا تھا۔ دو برس بعد ڈیڑھ ہزار روپے بھیجنے لگا۔ اب پانچ برس ہو گئے تھے، ملازم ڈھائی ہزار روپے بھیجنے کے باوجود وہاں کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شیدے یہاں جو کچھ کماتا تھا، اپنے لئے بچا کر نہیں رکھ سکتا تھا یعنی اپنی رقم نہیں بچتی تھی کہ وہ یہاں سے پاکستان جاتا۔

مراد سوچتے سوچتے چونک گیا۔ شیدے اس سے پوچھ رہا تھا۔ ”جناب! آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟“

اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”ایک بار تم نے کہا تھا کہ پانچ برس سے اپنی پیوی کے پاس نہیں گئے۔ تمہارے پاس رقم نہیں بچتی ہے۔“

”یہ بہت پرانی بات ہو چکی ہے۔ اب تو سات برس ہو گئے ہیں۔“

”یعنی سات برس گزر گئے اور تم ایک بار بھی اپنی پیوی سے نہیں مل سکے۔“

”صاحب! مجبوری ہے۔ اب تو یوں لگتا ہے جیسے اسی طرح زندگی گزر جائے گی اور وہ ایک بچی کی پرورش کرتے ہوئے میرے نام پر بیٹھی رہے گی، ایک بار میں نے جھنجھلا کر خط میں لکھ دیا تھا میں نہیں آسکتا، مگر وہ چاہے تو مجھ سے نجات حاصل کر لے۔ وہاں کسی شریف آدمی سے شادی کر لے۔ اس بات پر وہ ناراض ہو گئی تھی۔ بہت غصے میں خط لکھا۔ وہ غصہ دکھانے میں حق بجانب ہے۔ جب عورت اپنے نام بیٹھی ہو اور ہمارے انتظار میں جوانی کے سالوں بھادوں گزار رہی ہو تو اس کے غصے پر بھی غر محسوس ہوتا ہے۔“

”تم چاہو تو اپنی پیوی سے مل سکتے ہو۔ تمہارے آنے جانے کے جو بھی اخراجات ہوں گے وہ میں پورے کروں گا۔“

شیدے نے اسے حیرانی اور بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ مراد نے پوچھا۔ ”کیا یقین نہیں آ رہا ہے؟“

”آ رہا ہے مالک! آپ پر یقین نہیں آئے گا تو کس پر آئے گا لیکن بڑے اخراجات ہیں۔“

”میں نے کہا نا، میں پورے کروں گا۔ اس کے عوض تم میرے لئے کیا کر سکتے ہو؟“

”آپ حکم کیجئے، آپ کے لئے جان کی بازی گا دوں گا۔ برس گزر گئے۔ آپ میری پیوی سے، میری بچی سے، میرے والدین سے ملانے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ ایک بار مجھے میری پیوی سے مل کر آنے دیجئے، میں آپ کے لئے جان دے دوں گا۔“

”مگر میں کون، تمہاری جگہ کی نہیں، میری جان لینے کی بات ہے۔ کیا تم مجھے قتل کرنا پسند کرو گے؟“

وہ چونک کر اسے یوں دیکھنے لگا جیسے کسی پاگل کو دیکھ رہا ہو، اس نے کہا۔ ”جہیں یہ بات مضحکہ خیز لگے گی لیکن میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ کیا تم مجھے زہر لا کر دے سکتے ہو؟“

وہ دم صم کھڑا اسی طرح منہ تکتا رہا۔ مراد کہہ رہا تھا میں مجبور ہوں۔ یہاں سے جا

میں انسان کیا کرے گا؟ کتنے لوگ ہیں جو شرافت کا دامن تھامے رہیں گے، کتنے لوگ ہیں جو قانون کا پاس کریں گے، آج مجھ پر جو کچھ بیت رہی ہے، اس کے پیش نظر یقین سے کہتا ہوں کہ انسان اتنا کمزور نہیں ہوتا جتنا قانون کمزور ہوتا ہے اور یہی کمزور قانون انسان کو کمزور بنا دیتا ہے۔“

”بائیں کم کرو، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آج شام تک میری مطلوبہ چیز لے آؤ..... میں چھبیس تین ہزار پاؤنڈ اسی وقت ادا کر دوں گا۔ یہ تقریباً تیس ہزار پاکستانی روپے ہوں گے۔ اتنی رقم میں تم آنے جانے کے علاوہ اپنی بیوی اور بچی اور والدین کے لئے اچھی خاصی شاپنگ بھی کر سکو گے۔“

وہ سر جھٹکا کر جانے لگا۔ مراد نے ریسپور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے۔ پھر رابطہ قائم ہوتے ہی کہا۔ ”میں سسر موٹا کامران سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”مورنی“ وہ سوری ہیں۔ سمجھو۔ آپ چار بجے دوبارہ فون کر لیں۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ ہاتھ میں ریسپور تھامے سوچنے لگا۔ موٹا کو وعدے کے مطابق چار بجے سے پانچ بجے تک اس سے ملنا چاہئے کیونکہ وہ جاری ہے، اس لئے اس کی پروا نہیں کرے گی۔ اس نے گھڑی دیکھی، دو بج کر پچپن منٹ ہوئے تھے۔ وہ ریسپور رکھ کر اٹھ گیا۔ کمرے میں ٹھنکے لگا۔ اس کا خیال تھا سوپ پینے کے بعد اچھی خاصی توانائی پیدا ہو گئی ہو گی لیکن وہ جلدی ہی ٹھک کر بستر پر آ بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک ہاتھ رہا۔ اب وہ کامران کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کیا وہ موٹا کے جانے پر خوش ہو گا؟ ”یقیناً نہیں“ وہ کبھی خوش نہیں ہو سکتا۔ اپنی بیوی کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ بھی پریشان ہو گا۔

اس نے ریسپور اٹھا کر یکے بعد دیگرے کئی نمبر ڈائل کئے۔ ہر جگہ رابطہ ہونے پر کامران کے متعلق پوچھتا رہا۔ پھر ایک نمبر پر کامران کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو مراد! خیریت تو ہے۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

”جی رہا ہوں۔ سنا تھا آخری وقت انسان روشن ضمیر ہو جاتا ہے۔ اب مجھے اپنی موت نظر آ رہی ہے۔ اپنی غلطی کا بھی احساس ہو رہا ہے۔ میں نے تمہارے جیسے دوست کو دشمن بنا لیا ہے۔ صرف چھبیس ہی نہیں بلکہ تمہاری شریک حیات کو بھی بے انتہا

پریشان کیا ہے۔ میں کس منہ سے معافی مانگوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“

”مراد! جو کچھ ہو گیا ہے اسے بھول جاؤ۔ تمہارے لیے کئی چھائی تمہارا بچہ تیار رہا ہے کہ تم صدق دل سے اپنے کئے پر نادم ہو۔ میں موٹا سے کوں گا کہ وہ صاف دلی سے چھبیس معاف کر دے۔“

”کیا تم مجھ سے ملنے آؤ گے؟“

”ابھی آ رہا ہوں۔“

وہ ریسپور رکھ کر دانت پیسنے لگا۔ ذر دور سامنے ہی آئینے میں عکس نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے کھنکھانے لگا۔ ”وہ آ رہا ہے، کمینہ بد ذات، میرا دوست ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ کیا یہی دوستی ہے میں نے اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں دیں۔ وہ ایک عورت کی قربانی نہ دے سکا۔“

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آئینے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”وہ کیا سمجھتا ہے۔ کیا میں ایک بار مینے سے شکست کھانے کے بعد، دوسری بار پھر کسی عورت سے شکست کھاؤں گا؟ ہرگز نہیں۔ وہ یہاں سے کبھی نہیں جاسکے گی۔ وہ میرے لئے ذہن پر مبنی ہے۔ میں اس کے لئے میٹھا ذہن بن جاؤں گا۔“

اس نے فاتحانہ انداز میں قلعہ لگانے کی کوشش کی۔ ذرا ہستے ہستے پیچھے گیا پھر یکبارگی چکرا کر گر پڑا۔ کمزوری غالب آ گئی تھی۔ شیدے اپنے مالک کی ہنسی سن کر دروازے کے پاس آیا تھا تاکہ ہنسنے کی وجہ معلوم کر سکتے۔ جب اسے فرش پر پڑا دیکھا تو دوڑ کر آیا۔ اسے سارا دے کر اٹھانے لگا۔ اس کا سراپ بھی پکرا رہا تھا۔ بڑی کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بیٹھ گیا۔ پھر جھکے ہوئے انداز میں بولا۔ ”میرا دوست کامران آ رہا ہے۔ خبردار کسی کے سامنے زہر کا ذکر نہ کرنا۔“

وہ سارا لے کر اٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا بستر پر آ کر گر پڑا۔ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر بولا۔ ”کامران آئے تو دروازہ کھول دینا۔ اس کے بعد چھٹی لے کر چلے جائے۔ شام کو میرا کام کرنے کے بعد اپنی مطلوبہ رقم لے کر چلے جائے۔ کل ہی کسی فلائینٹ سے جانے کی کوشش کرو۔ کسی وجہ سے نہ جاسکو تو پوسٹوں رات تک میرا کامران اور اس کی

بیوی مونا کا ہرگز سامنا نہ کرے۔

شید نے اس کے حکم کی قہقہہ کی۔ جب باہر سے کال بلی کی آواز سنائی دی تو اس نے دروازہ کھولا۔ مراد کے بیان کے مطابق کامران تھا، مونا بھی ساتھ آئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مراد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کامران نے کہا: ”آرام سے لیٹے رہو۔ تم نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے“ اس نے مونا کو ساتھ لے آیا ہوں۔ اب ہمارے درمیان کوئی رنجش، کوئی کشیدگی نہیں رہے گی۔“

مراد نے سر جھکا کر غصہ سے کہا: ”مونا کے آنے پر مجھے خوشی ہو رہی ہے لیکن اسے نہ لاتے تو بہتر ہو کہ میرا سر غصہ سے جھک رہا ہے۔ میں کیا کروں۔ کس زبان سے اپنی زیادتیوں کی معافی مانگوں۔“

مونا نے بڑے غور سے اسے دیکھ کر پھر بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھنے ہوئے بولی۔ ”مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے، جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”میں کوشش کروں گا تو بھول جاؤں گا لیکن تم نہیں بھول سکو گی۔“

”تم میرے دل کی بات کیسے جانتے ہو۔ میں نے کہا میں بھول گئی ہوں۔“

”اگر ایسا ہے تو واپس نہ جاؤ۔“

وہ کچھ کٹا چاتی تھی۔ کامران اس کے قریب ہی بستر کے سرے پر بیٹھنے ہوئے بولا۔ میں بھی یہی سمجھا رہا ہوں۔ اب اسے واپس نہیں جانا چاہئے۔ تم پھر ہمارے دوست بن گئے ہو۔ ہمارے ساتھ تعاون کرتے رہو گے تو اسے میرے پاس ہی رہنا چاہئے۔“

”کاش! تم سے کہہ چکی ہوں“ مجھے اپنے پاس بلانا چاہئے ہو تو اپنے نام سے اپنے حوالے سے بلاؤ۔ ایک طرح سے مراد صاحب نے ہم سے دشمنی نہیں کی ہے۔ دوستی کی ہے ہمیں اچھا سبق پڑھایا ہے۔ قانون سے کیلئے کا انجام بتایا ہے۔ لہذا ہمیں سبق حاصل کرنا چاہئے۔ اینگریشن کے قوانین میں پکب پیدا ہو یا نہ ہو، میں واپس جاؤں گی اور اس کے لئے جدوجہد کرتی رہوں گی۔“

مراد اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتیں سن رہا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

”کبکشت اپنی ضد سے باز نہیں آئے گی۔ نہ یہاں رہے گی، نہ میں اسے قابو کر سکوں گا۔“ اس نے تنبیہ میں سر ملاتے ہوئے کہا۔ ”مونا درست کہتی ہے، ہمیں قانون سے کھیلنا نہیں چاہئے بلکہ یہاں جائز طریقے سے بلانے کے لئے ہم سب کو مل کر جدوجہد کرنا چاہئے۔“

مونا خوش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ کامران نے حیرانی سے پوچھا: ”کیا تم بھی یہی چاہتے ہو۔ تم میرے دوست ہو، میری حمایت کرو تو شاید ہم مونا کو روک لیں۔“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”ہرگز نہیں“ مونا کو یہاں سے جانا چاہئے اور ضرور جانا چاہئے۔ میں نے ابھی تو حویلی دیر پہلے ایک پیالہ سوپ پیا ہے۔ اب پرسوں تک خوب کھاؤں گا، پیوں گا اور اس قابل ہو جاؤں گا کہ مونا کو الوداع کہنے ایئر پورٹ تک جا سکوں۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں مونا کو ایک شاندار الوداعی پارٹی دوں گا۔“

کامران نے بے بسی سے مسکراتے ہوئے کہا: ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے تم مجھ سے دشمنی کر رہے تھے اب مونا کے ساتھ مل کر کر رہے ہو۔“

اس کی بات پر مونا اور مراد ہنسنے لگے کامران نے کہا: ”ویسے میں پہلے ہی اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ مونا کو سمجھانا مشکل ہے۔ جب اس نے جانے کی ضد کر لی ہے تو یہ ضرور جانے گی اور مجھے الوداعی پارٹی دینی پڑے گی۔“

مراد نے کہا: ”ہرگز نہیں تم دونوں کھانا میرے ساتھ کھاؤ گے اور یہاں سے ایئر پورٹ ساتھ چلو گے۔ اس وقت سے میری گاڑی تمہارے پاس رہے گی۔ پرسوں تک تم مونا کو لندن کی سیر کراتے رہو۔“

کامران نے کہا: ”میرے پاس میں تم بھی ساتھ رہو گے۔“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”کبھی نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے درمیان میرا یا کسی اور کا سایہ بھی پڑے۔ تم دونوں کو پرسوں تک بالکل تنہا رہنا چاہئے۔ مونا کی روانگی سے پہلے دونوں میرے پاس چلے آؤ۔ ہم کہیں رات کا کھانا کھائیں گے پھر مونا کو ایئر پورٹ لے جائیں گے۔“

”تم تیار ہو۔ کہیں اور جا کر کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں کھانے کا انتظام کر سکتے ہو۔“

مراد نے مونا کو دیکھا۔ پھر کہل ”یہ پہلی بار میرے گھر آئی تو میں نے دھوکا دینا چاہا۔ اس کی کافی میں خوب آور دوا ڈالنے کی کوشش کی۔ میں نہیں چاہتا کہ جہاں دھوکا دے چکا ہوں وہاں پھر مونا کو دھوکا کھائے کا شبہ ہو۔“

مونا نے کہل ”ایسا نہ کہو۔ اب میں تم پر شبہ نہیں کروں گی۔ کافی ٹھیک کتے ہیں“ تم بیمار ہو۔ ہمیں دُور کے لئے دوسری جگہ نہیں چاہئے۔ تم یہیں سادگی سے کچھ کھائے کا انتظام کرا لو۔“

”انتظام دو طرح سے ہو سکتے ہیں۔ یا تو کسی ہوٹل سے کھانا منگو لیا جائے یا کسی باورچی کی خدمات حاصل کی جائیں۔ کامران! اگر ہم بکثرت آہنی سرلا دیوی کی خدمات حاصل کریں تو کیا رہے گا؟“

”ہاں! سرلا دیوی بہترین ڈشیں تیار کرتی ہیں۔ میں ایک بار ان کے ہاتھوں کا پکوان کھا چکا ہوں۔ وہی مناسب رہیں گی۔“

مونا نے کہل ”مسٹر مراد! کل صبح میں ایک ایسا قدم اٹھا رہی ہوں جس کے بعد ہم تینوں کو قانون کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔“

”میں نہیں سمجھا؟“

کامران نے کہل ”میں سمجھا ہوں۔ مونا اخبارات کے ذریعے یہ بیان شائع کرا رہی ہے کہ یہ امیگریشن قوانین کے خلاف آئی ہے۔ شوہر کوئی ہے“ حوالہ کسی اور کا ہے۔“

مراد نے کہل ”اوہ گاڈ! اس طرح مجھے جیل ہو جائے گی۔ مونا کو بھی حراست میں لے لیا جائے گا۔ آخر اس انکشاف کی ضرورت کیا ہے؟“

”میں اس کے جواب میں بہت کچھ کہہ سکتی ہوں۔ صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ ہمیں امیگریشن کے موجودہ قوانین سے شکایت ہے۔ ہم ان قوانین میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ یہ کوشش اچھی ہے لیکن موجودہ قوانین سے کھینچے رہنے کی کوشش نہایت ہی غلط ہے۔ لہذا جو بات غلط ہے اس کا اعتراف کرنا چاہئے اور یہ ثابت کرنا چاہئے کہ شریف لوگ مجبور ہو کر قانون سے کھینچے ہیں پھر ان کا ضمیر انہیں ملامت کرتا ہے اور وہ زیادہ

عرسے ایسا نہیں کر سکتے۔ قانون کی پلا دہی کو تسلیم کرتے ہیں۔ خواہ وہ قانون ہمارے ہی خلاف کیوں نہ ہو۔ جب تک وہ نافذ ہے اس کا احترام کرنا“ اس پر عمل کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس کی تبدیلی لانے کے لئے دوسرے مناسب رستے اختیار کئے جانے چاہئیں۔“

مراد یہ سننے ہی پہنے لگا۔ پھر ہنسنے ہنسنے ہی بستر پر لیٹ گیا۔ وہ دونوں اسے قیج سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے کہل ”مجھے حیرانی سے نہ دیکھو۔ میں اس بات پر ہنس رہا ہوں کہ میری طرف سے ہونے والی الوداعی پادلی گئی۔ اب ہم جیل کا کھانا کھائیں گے“ ہاں اگر زندگی رہی“ مقدمہ جیت کے اور قانون نے ہمیں معاف کر دیا اور ہم واپس آئے تو میری دعوت کو نہ بھولا۔ الوداعی پادلی صرف میری طرف سے ضرور رہے گی اور تم میرے ساتھ کھانا کھانے کے بعد ہی یہاں سے پاکستان واپس جاؤ گی۔“

مونا نے مسکراتے ہوئے کہل ”کون مجھے یا تمہیں جیل میں ڈالے گا۔ اگر خلا کار ایک دو یا دس ہوں یا سو ہوں تب انہیں جیلوں میں ٹھونسا جا سکتا ہے لیکن ہزار ہوں تو انہیں کتنی جیلوں میں ٹھونسا جائے گا۔ کتنوں کو سزائیں دی جائیں گی؟“

مراد نے حیرانی سے پوچھا۔ ”تم کیا کہنا چاہتی ہو؟ کیا ہمارے علاوہ بھی کچھ لوگ ہیں؟“

”کچھ نہیں“ ہزاروں میں۔ انگلینڈ میں تقریباً پچاس ساٹھ ہزار ایٹھیا کی پشتہ سے ہیں جو امیگریشن قوانین کے باعث سخت پریشانی میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض غیر قانونی زندگی گزار رہے ہیں لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو قانون کا احترام کرتے ہیں اور وہی قانون انہیں طرح طرح کے مصائب میں مبتلا رکھتا ہے۔ کل لندن سے شائع ہونے والے بیشتر اخبارات میں اس موضوع کے متعلق ایسے دھماکہ خیز انکشافات ہوں گے جو دنیا والوں کو سوچنے پر مجبور کر دیں گے۔“

مراد اس کی بات سن رہا تھا اور سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ ہوائی قلعے بنا رہی ہے؟

خیالی محل بنانے کے دوران دلائل مستحکم ہوں تو ایک دن صبح ایک مستحکم محل تعمیر ہو جاتا ہے۔ وہ درست کہہ رہی تھی۔ اگر کسی قانون کی مخالفت میں دو چار یا دس یا

اگر کامران کو جگ آنٹی کی اصلیت کا پتا چلتا تو وہ کبھی مراد کو اس سے قریب نہ ہونے دیتا۔ مراد بھی جانتا تھا کہ کامران جگ آنٹی کے ذریعے ٹینے سے انتقام لینے والی بات کبھی گوارا نہیں کرے گا۔ بہر حال آنٹی نے اس سے کہا تھا۔ ”مراد! تم موجودہ حالات پر اچھی طرح غور کرو۔ تمہیں فائدہ کس طرح پہنچے گا۔ خودکشی کرنا چاہو گے تو بیٹھ کے لئے دنیا سے چلے جاؤ گے۔ میں تمہیں منع نہیں کروں گی۔ میرا تو کام یہی ہے۔ میں مقتول معاوضہ لے کر تمہیں بڑے آرام سے دوسری دنیا میں پہنچا دوں گی لیکن تمہارا بھائی اس دنیا سے اٹھ جائے گا تو تمہیں دو ہزار فائدہ ہو گا۔ ایک تو تمام کاروبار اور جائیداد کے مالک بن جاؤ گے، دوسرے باری ہوئی ٹینے کو جیت لو گے۔“

لیکن مراد اپنے بھائی جان کے خلاف کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس کے انتقام کا مرکز ٹینہ تھی۔ اکثر یہی ہوتا ہے، مرد سونے چاندی کی چمک دکھا کر عورت کو جیت لے تو سوال نہیں کیا جاتا کہ تم نے بے وفائی کی طرح کیوں ڈالی؟ عورت سے پوچھا جاتا ہے، ”تم نے بے وفائی کیوں کی؟“ حالانکہ دونوں طرف سے پیش قدمی ہوتی ہے۔ اسے ٹینے کی پیش قدمی پر غصہ آ رہا تھا اور وہ اسی سے انتقام لینا چاہتا تھا۔

انسان چاہتا کچھ ہے لیکن اس کے لاشعور میں کوئی اور خیال پکنا رہتا ہے۔ وہ ٹینہ کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اس کا گاگا اپنے ہاتھوں سے دلوچنا چاہتا تھا اور اگر نہ دلوچ سکے تو خود مرجانا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود وہ کچھ نہ کر سکا۔ اس کے لاشعور میں یہ خیال پک رہا تھا کہ شاید ٹینہ اس کی طرف بھر جائے۔ بھائی جان کی موت کے بعد یہ خیال مستحکم ہو گیا۔ ٹینہ بھی اسے ایسی باتوں سے دیکھنے لگی تھی جیسے ڈوبتے ہوئے سہارا چاہتی ہو۔

ایسے ہی وقت وہ انتقام اس سے نفرت کرنے لگا۔ اسے طے دینے لگا۔ دھکارتے لگا لیکن اندر جو محبت تھی وہ بہت مستحکم تھی۔ وہ ٹینہ کو چاہتا تھا۔ دل و جان سے چاہتا تھا پھر اسے اپنا لینا چاہتا تھا لیکن وہ ایک بچے کی ماں بننے کا غرور حاصل کرتے ہوئے مر گئی۔ نہ بچہ رہا نہ وہ رہی۔

یہ محرومی تھی۔ انتقام سے محرومی تھی۔ وہ نہ تو انتقام لے سکا نہ اسے اپنا سکا۔ اسے احساس شکست تھا کہ ایک عورت اسے مات دے کر چلی گئی اور وہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

کے لئے ملازمین فراہم کرتی تھی۔

اگرچہ لندن میں معزز اور پُر اس خیروں کی اکثریت ہے اس کے باوجود یہ شہر گناہوں اور جرائم کی بین الاقوامی منڈی ہے۔ یہاں ایسے عجیب و غریب گناہ اور جرائم ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر یا جن کے متعلق سن کر حیرت ہوتی ہے کہ انسان صرف سائنس اور ٹیکنالوجی میں نہیں بلکہ گناہوں اور جرائم میں بھی نت نئے تجربے کرتا جا رہا ہے۔

جگ آنٹی سرلا دیوی جرائم کے جس شعبے میں مہارت رکھتی تھی وہ تھا خودکشی کا شعبہ۔ اگر کوئی دنیا سے بیزار ہو گیا ہو، مرنا چاہتا ہو اور مرنے سے ڈرتا بھی ہو تو جگ آنٹی اس کی موت کو آجھان بنا دیتی تھی..... مرنے کے ڈر نہ والا کتنا تھا۔ ”وہ چاقو سے نہیں مرے گا، بتدق کی گولی سے نہیں مرے گا، زہر سے نہیں مرے گا، پھنڈے سے نہیں لٹکے گا مگر آرام سے مرنا چاہتا ہے۔“

جگ آنٹی بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ بھیر کر پچکارتے ہوئے کہتی تھی۔ ”فکر نہ کرو۔ بس اتنا بتا دو کہیں مرنا چاہتے ہو؟ کسی ہرے بھرے گلشن میں یا سمندر کے ساحل پر؟ پھولوں کی تاج پر یا ریشمی ہاتھوں میں؟ یا پھر اس کی آغوش میں؟ جہاں بھی مرنا چاہو گے موت بڑی سہولت سے بڑے پیار سے آئے گی۔“

جگ آنٹی سے مراد کی دوستی ان دنوں ہوئی تھی جب وہ ٹینہ کی بے وفائی کے باعث ذہنی انتشار میں مبتلا رہتا تھا۔ اکثر غصے کی حالت میں کہتا تھا کہ ٹینہ کو مار ڈالے گا یا خود مر جائے گا۔ کامران اسے سمجھاتا رہا تھا۔ کامران کے علاوہ بھی مراد کا ایک شناسا تھا۔ اس نے اسے جگ آنٹی سے یہ کہہ کر متعارف کرایا۔ ”آنٹی بڑی صلاحیتوں کی مالک ہیں۔ تم جیتنا چاہو گے تو یہ تمہاری زندگی کو ٹینہ سے زیادہ حسین بنا دیں گی۔ مرنا چاہو گے تو موت کو بھی آسان بنا سکتی ہیں۔“

کامران جگ آنٹی سرلا دیوی کے متعلق اتنی گہرائی سے نہیں جانتا تھا۔ بس اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ ضرورت مند عورتوں اور مردوں کے لئے ملازمتوں کا انتظام کرتی ہے اور کہیں جرحہ ڈے یا میرین پارٹی ہو یا کسی طرح کی تقریبات ہوں تو بڑی خوش اسلوبی سے ان تقریبات کا انتظام کرتی ہے اور اس سلسلے میں مقتول معاوضہ لیتی ہے۔

جبک آنٹی سرلا دیوی اپنے وعدے کے مطابق آگئی۔ اس نے مراد کو دیکھتے ہی حیرانی سے کہل۔ ”اوہ مائی گڈنس“ یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔ تم تو مرنے سے پہلے ہی مر رہے ہو اور جب مری رہے ہو تو پھر مجھے کیوں بلایا ہے؟ اچھا سمجھ گئی۔ عورتوں کو دیکھتے ہی بعض مردوں کی جان نکل جاتی ہے شاید تم نے مجھے دیکھنے کے لئے بلایا ہے۔“

وہ بستر کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ مراد نے کہل۔ ”میں ایک دوسری عورت کو غینہ کے روپ میں دیکھ رہا ہوں۔ تم درست کہتی ہو“ کسی کو دیکھ لو اور وہ پسند آ جائے تو اس کے لئے جان جاتی ہے مگر آدمی جاتی ہے۔ آدمی انکی رہتی ہے۔ یہی پھانس نکالنے کے لئے تمہیں یاد کیا ہے۔“

”بڑے آرام سے نکال دوں گی۔ قصہ کیا ہے؟“

وہ قصہ سنائے لگا۔ بوڑھی خراثن سن رہی تھی اور طنزیہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ پھر اس نے کہل۔ ”جس طرح تم مونا کے متعلق بتا رہے ہو“ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ غینہ تمہیں مار نہ سکی“ یہ بار ڈالے گی۔ کیا میں یہ سمجھ لوں کہ پرسوں اس کے جاتے ہی تم خودکشی کرنا چاہو گے اور اس کے لئے میری ضرورت ہے؟“

”میں اسے جانے نہیں دوں گا۔“

”دیکھو روکو گے؟“

”موت روکے گی“ میں اسے کسی صورت میں جانے نہیں دوں گا۔ وہ میرے ساتھ زندہ رہتی تو کیا ہی اچھا ہوتا لیکن اس کی ضد نے سمجھا دیا ہے کہ اسے مار کر ہی جانے سے روک سکتا ہوں۔ لہذا وہ میرے گھر میں میرے ساتھ جان دے گی۔“

”اور اس کا شوہر کامران؟“

”گیبوں کے ساتھ کھن بھی ہیں جاتا ہے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ مرے گا۔“

”یعنی تین جائیں ایک ساتھ“ ایک وقت میں جائیں گی۔“

”ہاں“ اور اس کا معاوضہ بھی تمہیں گنا لے گا۔“

”معاوضہ چھ گنا ہو گا۔“

”وہ کیوں؟“

”یہ ٹینے کے دقت تمہیں بتا چکی ہوں۔ میں قاتل نہیں ہوں“ کسی کو جبراً نہیں مارتی۔ اس کی مرضی ہو تو خودکشی کے سلسلے میں مشکل آسان کرتی ہوں۔ ٹینے کے کیس میں“ میں نے کہا تھا“ اگر اپنے بھائی جان کو یا ٹینے کو مارنا چاہتے ہو تو میں کسی دوسرے سے یہ کام لوں گی۔ اس کا معاوضہ دو گنا ہو گا۔ ہاں اگر خودکشی کرنا چاہو تو تمہاری مشکل آسان کرنے کے لئے کم سے کم معاوضہ لے کر یہ کام کر سکتی ہوں۔“

وہ چپ چاپ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ بوڑھی سرلا دیوی نے کہل۔ ”موجودہ کیس میں بھی تین افراد ہیں جن میں سے ایک تم ہو“ جان بوجھ کر اپنے آپ کو مارنا چاہتے ہو۔ اس کا مطلب ہے خودکشی کرنا چاہتے ہو“ میں تمہاری مشکل آسان کر سکتی ہوں۔ یہ میرا پنا کیس ہے لیکن کامران اور مونا کو جبراً ہلاک کرنا ہو گا۔ ان کی نادانستی میں انہیں ملک عدم پہنچانا ہو گا۔ یہ کیس میرا نہیں میرے بزنس پارٹنر کا ہے میں اس کے ذریعے یہ کام کرا سکتی ہوں۔“

”میں اس سلسلے میں کسی کو راز دار بنانا نہیں چاہتا۔ صرف تم یہ کام کرو گی اور اس کا معاوضہ چھ گنا لے گا۔“

وہ سوچنے لگی۔ مراد نے پوچھا۔ ”اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔“

وہ بولی۔ ”اپنے مزاج کی بات ہے۔ میں کبھی کسی کی مرضی کے بغیر اسے ہلاک نہیں کرتی۔ یہ کام قاتلوں کا ہوتا ہے۔ جلاوطن کا بھی ایک مزاج ہوتا ہے۔ اگر وہ موت کی سزا پانے والے مجرموں کو پھانسی پر چڑھاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنے کسی دشمن کو بھی پھانسی پر چڑھا سکتے ہیں۔ وہ قاتلانہ مزاج نہیں رکھتے صرف اپنے پیسے کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اسی طرح میں اپنے کسی دشمن کو ہلاک کرنے کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتی۔ یہ میرا مزاج ہی نہیں ہے۔ ہاں کسی کی مشکل آسان کرنا ہو“ وہ بے چارہ مرنا چاہتا ہو اور مرنے سے ڈرتا ہو یا کوئی دشواری پیش آتی ہو تو میں ان دشواریوں کو ختم کر دیتی ہوں۔ اس کے لئے آسانیاں فراہم کر دیتی ہوں۔“

”یعنی تم میرا کام نہیں کرو گی۔“

”میں کروں یا میرا پارٹنر کرے“ ایک ہی بات ہے۔“

”بات ایک نہیں ہے۔ میں نے پرسوں شام انہیں کھانے پر بلایا ہے۔ کھانے کا اہتمام تم کرو گی۔ تمہارا پارٹنر نقل کرتا ہو گا لیکن تمہاری طرح وہیں تیار نہیں کر سکتا۔“

”تمہاری پلاٹنہ کیا ہے؟“

”میں نے زہر منگوایا ہے۔ تم اسے سوئٹ ڈش میں ملا کر ہم تینوں کو کھلاؤ گی۔“

وہ تعجب سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ جب تم نے زہر منگوایا لیا ہے، یہاں انہیں بلا کر کھلا سکتے ہو تو زہر بھی ملا سکتے ہو۔“

”یہی نہیں کر سکتا۔ تمہیں یہ نہیں بتایا ہے کہ مونہا جب پہلی بار میرے ہاں آئی تو میں نے اس کی کافی میں خواب آور دیا ملائے کی کو شش کی تھی لیکن اس نے دیکھ لیا تھا۔ میری چال کو سمجھ گئی تھی۔ اس بار بھی مجھ سے بھول چک ہو سکتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ان کے سامنے پکڑ میں جاؤں۔ ان کی موجودگی میں کھانے کو ہاتھ لگاؤں گا۔ جو کرو گی، تم کرو گی۔“

وہ چپ رہی۔ مراد نے کہا۔ ”پھر سوچنے لگیں۔“

”پلیز مجھے سوچنے کی مہلت دو۔“

اس نے اپنے پرس میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ اس میں سے ایک سگریٹ سلگایا۔ اس کا ایک سش لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹک گئی۔ آہستہ آہستہ دھواں چھوڑنے لگی۔ مراد ہزار ہو رہا تھا۔ بے چین ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ”جب مرنا ہی ہے تو بے چینی کیسی؟ اطمینان رکھو۔ میں ہی تمہارا کام تمام کروں گی مگر یہ بتاؤ، یہاں تمہارا اچھا خاصا کاروبار ہے تم نے خوب دولت کمائی ہے، تمہارے بعد ان کا کیا ہو گا؟“

”میں دنیا سے بھاگنا چاہتا ہوں، دولت اور کاروبار کی پروا کیا کروں گا۔“

وہ ہنسنے لگی پھر ہنستی چلی گئی۔ مراد اسے سوائے نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں کام ایسا کرتی ہوں کہ مجھ پر قتل کا یا جبر کا الزام نہ آئے۔ ایک طرح سے تمہارے جیسے لوگوں کی مشکل آسان کر کے نکل کاتی ہوں۔ خوب سوچ سمجھ کر کسی کی خود کشی کے معاملے میں ہاتھ ڈالتی ہوں۔ اس میں میرا اتنا فائدہ ہے جتنا کسی قاتل اور چھوٹے موٹے اسٹیکر کو بھی نہیں ہوتا۔“

”میری خود کشی سے تمہیں کتنا منافع حاصل ہو گا؟“

”تمہارا بینک بیلنس کیا ہے؟“

”عورت اپنی صحیح عمر اور مرد اپنا صحیح بینک بیلنس کسی کو نہیں بتاتا۔ تاہم مرنا ہی فہمیرا تو بتا دیتا ہوں۔ میرے اکاؤنٹ میں اس وقت بارہ ہزار پونڈ ہیں۔“

”بینک میں پچاس پونڈ چھوڑ دو۔ باقی لے آؤ۔“

”میں سودا نہیں کروں گا کیونکہ میرے بعد یہ رقم بینک میں پڑی رہے گی۔ تمہارے ہی کام آ جائے۔ میرا کیا جائے گا؟ کل بارہ بیچے تک تمہاری مطلوبہ رقم تمہیں مل جائے گی۔ اور کچھ؟“

”مونہا اور کامران کون سی ڈش زیادہ پسند کرتے ہیں۔“

”کامران تو وہی کھائے گا جو مونہا کھائے گی اور مونہا کو سوئٹ ڈش پسند ہے۔“

”کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو؟“

”وہ میرے ساتھ ایک بار بیچ اور دو بار ڈنر کھا چکی ہے ہر بار اس نے کھانے کے بعد بڑے شوق سے سوئٹ ڈش کھائی ہے لیکن تم جو میٹھی ڈش تیار کرو گی اس میں کڑواہٹ لازمی ہو گی۔“

”مرکز نہیں، بلکہ سی کڑواہٹ ایسی ہو گی جو بھلی لگے گی۔ تم خود کھاؤ گے اور اعتراف کرو گے کہ میٹھا ذرا سی کو کھتے ہیں۔ جو انسانی جسم میں یا اس کے مزاج میں تحلیل ہو جائے۔“

”میں یہی چاہتا ہوں۔ مونہا اور کامران کو شبہ نہیں ہونا چاہئے۔“

”نہیں ہو گا۔ اب میرے تحفظ کی بات کرو۔ جہاں خود کشی کا کیس ہوتا ہے وہاں میں اپنی موجودگی کا نشان تک رہتے نہیں دیتی۔ یہ میرا پسلا کیس ہے، میں پرسوں تمہارے ڈونر آف ڈیوٹ (موت کا عشاہت) میں موجود ہوں گی۔ یہاں کے لوگ اور پڑوسی مجھے دیکھ سکتے ہیں۔ لہذا میرے سامنے ابھی خود کشی کا اعتراف نامہ لکھو۔“

”کیا لکھوں؟“ وہ سر ہالے والی میز کی دراز کھول کر اپنا لیر پیڈ اور قلم نکالنے لگا۔

جگ آنتی سرلا دیوی نے مشورہ دیا۔ ”پہلے تو مختصر آٹاکام عبت کی درداد لکھو۔ پھر

اپنے مزاج کے متعلق لکھو کہ کسی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اور کسی کے ساتھ مرنے کا عزم کا کرچے ہو۔ کیوں مر رہے ہو؟ خود کشی کی تحریک کیوں پیدا ہوئی؟ پھر تمہیں خود کشی پر کس نے مجبور کیا؟ اگر مجبور نہیں کیا تو خود کشی کے ذمہ دار تم خود ہو یا مونا بالواسطہ ہے اور وہ بھی تمہارے ساتھ مر رہی ہے۔“

اس نے لیٹر پینڈ کو کھول کر اپنے سامنے رکھا۔ قلم کو منجھلا پھر سوچ سوچ کر انگریزی زبان میں لکھنے لگا۔

”میں مسمی کارمان مرتضیٰ سابقہ نام رضا مراد ولد شاد مراد پوری طرح ہوش و حواس میں رہ کر یہ اعتراف نامہ لکھ رہا ہوں تاکہ میری خود کشی کا الزام کسی اور پر نہ آئے۔“

اگرچہ میں نے ایک دوست سے دوستی نبھانے کی خاطر اپنا نام تبدیل کیا۔ رضا مراد سے کارمان مرتضیٰ بن گیا۔ تاہم اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک ناکام اور نامراد انسان ہوں۔ اس لئے میرا نام رضا مراد نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے پہلے شینہ نامی ایک حسین لڑکی کو چاہا لیکن وہ بے وفائی۔ دوسری بار میں نے مونا کو دیکھا تو مجھے وہ ساری باتیں نظر آئیں جو شینہ میں تھیں۔ یہ الفاظ دیگر مونا شینہ کی کپی پوری کر سکتی تھی۔ اس لئے میں نے اسے دل و جان سے اپنانے کی کوشش کی۔ کبھی محبت سے، کبھی غصے سے، کبھی جبر سے، کبھی صبر سے، لیکن میری کوئی کوشش بار آور نہیں ہو رہی ہے میں ناکام ہو رہا ہوں میں پہلے بھی نامراد تھا اب بھی نامراد ہوں۔

مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ شینہ کی طرح مونا دولت کی چمک دکھ کی طرف مائل کیوں نہ ہوئی۔ اگر مائل ہو جاتی تو میں عورت کی لالچی طبیعت اور اس کی بے وفائی پر اسے خوب گالیاں دے کر آرام سے زندہ رہتا۔ اصل صدمہ اسی بات کا ہے شینہ جو بے وفائی وہ بھی میری نہ ہو سکی مونا جو وفا کر سکتی ہے وہ بھی میری نہیں ہو سکتی۔ میں نے بار بار خوابوں میں دیکھا۔ خیالوں میں دیکھا۔ میرے تصور میں بار بار شینہ آئی اور طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہتی رہی، میں مونا کے روپ میں آئی ہوں۔ دوسری بار تمہیں گلست دے رہی ہوں۔

اگر شینہ خواب ہے، خیال ہے تو پھر مونا مجھے گلست کیوں دے رہی ہے۔ وہ میری کیوں نہیں بن جاتی۔ وہ مجھے جھوڑ کر جا رہی ہے یعنی مجھ سے اتنی نفرت ہے کہ اپنے شوہر کو بھی میری وجہ سے جھوڑ رہی ہے۔ وہ میرے شرمسار رہتا نہیں چاہتی۔ میرے گھر میں رہنا نہیں چاہتی اور میرے دل میں تو رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ میں اسے جانے نہیں دوں گا۔ وہ میرے ساتھ جی نہیں سکتی میرے ساتھ مروت سکتی ہے۔

میں اس سلسلے میں ایک دعوت کا، ام کر رہا ہوں۔ میں نے مونا اور کارمان کو ذرا پر بلایا ہے۔ وہ آئیں گے۔ میرے ساتھ بیٹھ کر کھائیں گے۔ میں ان کی لاعلمی میں انہیں زہریلی سوئٹ ڈش کھلاؤں گا۔ ان کے ساتھ خود بھی کھلاؤں گا۔

نفرت کی جنگ ہو تو ہم مقابل کو مار کر زندہ رہتے ہیں۔ محبت کی جنگ میں کوئی مقابل نہیں ہوتا۔ ہوتا بھی ہے تو اس کے ساتھ خود مرنے پند کرتے ہیں۔ میں شینہ کے بعد پاگلوں جیسی زندگی گزار رہا۔ مونا کے بعد پاگل خانے جانا گوارا نہیں کروں گا۔ اس سے بہتر موت ہے لہذا میں مونا کے ساتھ جان دینے جا رہا ہوں۔

میرے بعد میرے کاروبار کا کیا ہو گا۔ میں نہیں جانتا۔ مرنے والے کو اس سے کیا غرض کہ اس کے بعد دنیا کا کیا ہو گا۔ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ اعتراف نامہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں پوری طرح ہوش و حواس میں ہوں۔ میری خود کشی کی ذمہ داری کسی پر عائد نہ کی جائے۔ میں خود اس کا ذمہ دار ہوں۔ فقط بقلم خود کارمان مرتضیٰ سابقہ رضا مراد ولد شاد مراد۔“

اس نے لکھنے کے بعد اس کاغذ کو پینڈ میں سے الگ کیا۔ پھر جگ آٹنی کی طرف بڑھا دیا۔ سرلا دیوی اسے پڑھنے لگی۔ پڑھنے کے بعد مطمئن ہو کر سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ میں اسے اپنے پاس رکھوں گی۔ اس کی ایک اور نقل تیار کروں گی۔ نقل ہمیشہ میرے پاس رہے گی۔ تمہاری خود کشی کے بعد یہ تحریر تمہاری جیب میں چھپ جائے گی۔ تاکہ پولیس والے تلاشی لیں۔ تمہارے بارے میں معلوم کرنا چاہیں تو یہ اعتراف نامہ تمہاری جیب سے برآمد ہو سکے۔“

وہ اعتراف نامے کو اپنے پرس میں رکھنے لگی۔ اسی وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ جگ آئی نے چونک کر ادھر دیکھ لیا پھر پوچھا۔ ”تمہارے پاس کون آ سکتا ہے۔ کیا ڈاکٹر؟“

”ہو سکتا ہے ڈاکٹر جان بشر ہو۔ میرا ملازم بھی ہو سکتا ہے۔“

وہ اٹھ کر کمرے سے باہر گئی۔ پھر بیرونی دروازے کو کھول دیا۔ وہاں شیدے کھڑا ہوا تھا۔ کسی اجنبی عورت کو دیکھ کر ذرا گھبرا گیا۔ جیسے چوری کرتا ہوا پکڑا گیا ہو۔ بوڑھی آئی نے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“

”جی میں صاحب کا ملازم ہوں۔“

”اندر آ جاؤ۔“

وہ جگ آئی کے ساتھ مراد کے بیڈ روم میں آیا۔ مراد نے پوچھا۔ ”کیا تم نے میرا کام کیا ہے؟“

شیدے جگ آئی کو دیکھ کر ہلکپکچانے لگا۔ مراد نے کہا۔ ”یہ خاتون میری راز دار ہیں۔ ان سے نہ چھاؤ۔ زہر لائے ہو تو مجھے دے دو۔“

اس نے جھپٹتے ہوئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پھر ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔ اس شیشی کے لیبل پر ایک انسانی کھوپڑی بنی ہوئی تھی۔ کھوپڑی کے نیچے دو انسانی ہڈیاں ایک دوسرے کو کراس کر رہی تھیں۔ نیچے لکھا ہوا تھا۔ ”پوائزن (زہرا)“

شیدے نے کہا۔ ”جو کچھ میں کر رہا ہوں اس پر میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے۔

اس سے پہلے کہ آپ اسے استعمال کریں میں یہاں سے جانے کا انتظام کر چکا ہوں۔ میرا ایک دوست کل صبح کی فلائٹ سے پاکستان جانے والا تھا۔ میں نے اس سے گڑگڑا کر التجا کی تو وہ اپنا ٹکٹ مجھے دینے پر راضی ہو گیا ہے۔ اگر آپ مجھے رقم عینیت کریں تو میں ٹکٹ اسی سے لے لوں گا اور کل یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

مراد نے کنبے کے نیچے سے چاہیوں کا گچھا نکالا پھر ایک چابی کو دکھاتے ہوئے کہا۔

”اس سے الماری کھولو۔“

اس نے حکم کی قییل کی۔ چاہیوں لے کر گیل۔ پھر اس نے الماری کھولی۔ مراد نے

کہا۔ ”اب اس کی چابی دراز کھولو۔“

اس نے دوسری چابی سے اس دراز کو کھولا۔ وہاں نوٹوں کی کچھ گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ مراد نے کہا۔ ”اس میں سے تین ہزار پونڈ نکال لو۔“

اس نے ہدایت کے مطابق اپنے لئے رقم نکالی۔ دراز اور الماری کو بند کیا پھر چابی واپس کر دی۔ مراد نے کہا۔ ”میں بھی یہی چاہتا تھا۔ تم جلد سے جلد چلے جاؤ۔ یاد رکھو صبح تک کسی سے میرے بارے میں ذکر نہ کرو۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی بھٹک کسی کے کان میں پڑگئی اور مجھے معلوم ہو گیا تو میں بری طرح پیش آؤں گا۔“

اس نے دونوں کان پکڑ کر قسم کھائی کہ وہ اپنے سامنے سے اور گونگی دیواروں سے بھی نہیں کے گا۔ چپ چاپ یہاں سے چلا جائے گا۔ پھر وہ چلا گیا۔

بوڑھی آئی نے اس کے جانے کے بعد دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر بیڈ روم میں آکر پوچھا۔ ”تمہیں ایک ملازم کو راز دار بنانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”جب مجھے معلوم ہوا کہ صوٹا پاکستان جا رہی ہے تو میں بالکل اپ سیٹ ہو گیا۔ یوں ہاتھ پاؤں مارنے لگا جیسے ڈوب رہا ہوں۔ کسی کا سارا تلاش کر رہا ہوں۔ میرے سامنے یہی شیدے آیا۔ میں نے اس کا سارا لے لیا۔ دیے یہ وہ نقادار ہے۔ کسی سے کچھ نہیں کے گا۔ چپ چاپ چلا جائے گا۔“

”کیا وہ نقادار ملازم ایسے ہی بھوتے ہیں کہ مالک کو مار ڈالنے کے لئے زہر لا کر دیں؟“

”وہ مجبور تھا۔ اس کی دفعہ داری اگرچہ میرے لئے ہے لیکن برسوں سے اپنی بیوی اور بچی سے بچھا رہا ہے۔ ان سے ملنے کے لئے تڑپ رہا ہے۔ وہ جدائی کے اس مرحلے پر پہنچ گیا ہے جہاں انسان تمام پابندیوں کو توڑ کر جائز اور ناجائز قانونی اور غیر قانونی باتوں کو نظر انداز کر کے کسی بھی طرح اپنی بھیتوں تک پہنچ جانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنی بیوی تک پہنچنے کے لئے میرے لئے زہر لے آیا۔ انسان تمام تر فرشتہ نہیں ہو کہ اس میں کچھ خامیاں ہوں تو اسے معاف کر دینا چاہئے۔“

جگ آئی اچانک ہی قہقہہ لگانے لگی۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہو مہی؟“

”جب ٹینے نے دولت کی خاطر بے وفائی کی تو اس وقت تم نے یہ نہیں سنا۔ وہ تمام تر فرشتہ یا حور صفت نہیں ہے اس نے ایک غلطی کی ہے اسے معاف کر دینا چاہئے لیکن نہیں انسان کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ وہ ایک ہی غلطی پر کسی کو سزا دیتا ہے اور کسی کو معاف کر دیتا ہے۔“

مراد نے حیرانی سے کہا۔ ”تعب ہے‘ میں تمہیں اپنا تمام ٹینک بیلنس دے رہا ہوں اور تم مجھے طے دے رہی ہو۔ کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں ٹینے کی بے وفائی کو بھول جاؤں‘ زندہ رہوں‘ تم سے خود کشی کے سلسلے میں کوئی معاہدہ نہ کروں اور تمہیں ایک کوڑی نہ دوں۔“

”میں لالچی نہیں ہوں۔ اگر تم زندہ رہنا چاہو گے تو معاہدہ منسوخ ہو جائے گا۔ میں تمہارے ڈینک بیلنس سے ایک تنکا بھی نہیں لوں گی بلکہ تمہیں نئی زندگی کی مبارکباد دوں گی۔“

وہ غصے سے جھنجھلا کر بولا۔ ”تم مجھے نصیحت کر رہی ہو۔ کیا موت کو نصیحت کر لے جانے سے روک سکتی ہو؟“

”کسی کو میں آنے سے روک سکتی ہوں نہ جانے سے۔ زندہ رہنے سے روک نہیں ہوں نہ مرنے سے۔ میں تو صرف اپنے اصول کی بات کر رہی ہوں۔ میں لالچ میں آکر کسی کو قتل نہیں کرتی۔ کوئی خود کشی کرنے والا میرا سہارا لیتا ہے تو میں اس کی مشکل آسان کرتی ہوں۔ تمہاری بھی مشکل آسان کروں گی لیکن پر سوں تک بروا وقت ہے۔ اگر زندہ رہنے کا فیصلہ کرو تو مجھے اطلاع دے دینا ورنہ میں تمہارے کام کے لئے حاضر ہو جاؤں گی اور کل بارہ بجے میری مطلوبہ رقم مجھ تک پہنچا دینا۔ میں جا رہی ہوں۔“

مراد ابھی تک ہاتھ میں وہ زہری شیشی پکڑے ہوئے تھا۔ جگ آٹنی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھالیا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا اسے بھی ساتھ لے جاؤ گی؟“

”میں معلوم کروں گی کہ یہ کس نوعیت کا زہر ہے اور مٹھی دُش میں اس کی کتنی مقدار حل کرنی چاہئے۔“

اس نے شیشی کو ہاتھ میں لے کر دیکھا‘ اس مضی سی شیشی کے باہر زندگی تھی اور

اندروں موت۔ دیے حرام موت مرنے والا کسی لئے بھی اسے کھول سکتا تھا لیکن موت کے لئے وہ پرسوں کھلنے والی تھی۔

جگ آٹنی نے اسے پرس میں رکھا۔ پھر مسکراتے ہوئے الوداعی انداز میں ہاتھ ملائے ہوئے رخصت ہو گئی۔

☆-----☆-----☆

فاروق رانھور صاحب کے ہاں پچھا دوں گا۔ چلو مونا!

وہ سب کار میں بیٹھ گئے۔ مونا کو گیارہ بجے ڈیوٹی پر جانا تھا۔ اس وقت تک کامران کے ساتھ تنہائی نصیب ہو سکتی تھی۔ وہ سیر و تفریح کر سکتی تھی، اس کے ساتھ کہیں لہنا کھا سکتی تھی لیکن یہ وقت ایک اہم میٹنگ میں گزر گیا۔ وہ گیارہ بجے سے کچھ پہلے اسپتال کے سامنے گاڑی سے اترتے ہوئے ہوئی۔ ”تم کل بریڈ فورڈ اپنے گھر لے جانے کے پتے دیکھ رہے ہو، آج دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ جو تفریح کا وقت تھا، اسے ایک اہم مقصد کے لئے قربان کرنا پڑا۔ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔“

”جو بھی ہو گا میں اپنے طور پر یہی کوشش کروں گا کہ اپنی دہلیں کو اپنے گھر لے جاؤں۔“

وہ اتر کر جانے لگی۔ اس نے کہا۔ ”ڈیوٹی سے آؤ۔ ہونے کے بعد میرا انتظار کرنا۔ میں گاڑی لے کر آؤں گا۔ بھریم چلیں گے۔“

وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا، مسکراتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو سیدھی طرح سیٹ پر بیٹھ گیا، گفتگو ہونے دوبارہ کار اشعار کی، پھر اسے ڈرائیو کرتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”مونا کل صبح سے شام تک جلوس، جلے وغیرہ میں مصروف رہے گی۔ اس وقت تک میں بریڈ فورڈ جاؤں گا اور وہاں اس کے اشتعال کی تیاری کروں گا اپنے کمرے کو دہلیں کی طرح جلا دوں گا۔ یہ سچ ہے کہ عورت اپنی ازدواجی زندگی کے پہلے سرخ جوزے کو کبھی نہیں بھولتی۔ اگر وہ جوڑا کسی کام نہ آیا ہو تو اسے اور نہیں بھولتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شادی کا سرخ جوڑا ساتھ لائی ہے۔“

وہ مسکراتے اور گفتگو ہونے سوچ رہا تھا۔ ”میں وہ سرخ جوڑا اسے پہننے کے لئے کھوں گا۔ میری رہائش گاہ کے اطراف بیٹھے ایشیائی خاندان آباد ہیں جب انہیں معلوم ہو گا کہ میں دہلیں لایا ہوں تو ان کی عورتیں خود ہی مونا کو دہلیں کی طرح ہناسنوار کر میرے کمرے میں لے آئیں گی۔ مونا کو اور کیا چاہئے! وہ سوچ رہا تھا، ڈرائیو کر رہا تھا اور سستی میں گفتگو جا رہا تھا۔

دوسرے دن کے اخبارات نے چھوٹی بڑی سرخیوں کے ساتھ انگریزیشن کے متعلق کچھ خبریں شائع کی تھیں۔ ان میں گفتگو پڑے اور فاروق رانھور کا بیان بھی شامل تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔ انگریزیشن کے قوانین میں اہم ترین یک کی ضرورت ہے۔

یہ سطر جلی حرفوں میں شائع کی گئی تھی۔ ”تقریباً ساٹھ ہزار ایشیائی خاندانوں کو انگریزیشن کے قوانین سے تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔“

اس کی تفصیل یوں بیان کی گئی تھی۔ ”وہ قانون انتہائی غیر انسانی ہے جو انسان کو انسان سے الگ کر دے۔ بیوی کو شوہر سے اور والدین کو ان کے بچوں سے اس طرح جدا کرے کہ برسا برس گزر جائیں اور وہ ملنے نہ پائیں۔ میاں بیوی کی طویل جدائی سے اس کی آئندہ نسلیں دوطبی تنہا سے دوچار ہو رہی ہیں۔ اگر بچے دیس میں اپنی ماں کے پاس ہیں یا پردیس میں اپنے باپ کے پاس ہیں وہ سب کچھری تنہا کو زہر مار کر رہے ہیں۔ میاں انگریزی تعلیم پانے والے انگریزی معاشرے میں زندگی گزارنے والے اپنے آپ کو اجداد کے دین و دھرم سے بیگانے ہوتے جا رہے ہیں۔“

لندن میں جو ایشیائی بچے جوان ہوتے ہیں، وہ اپنے آباؤ اجداد کی تہذیب کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ جوان لڑکیاں مشرقی شرم و حیا کا لباس پہننے کی بجائے چست جینز، کپلے مگر بیان کی بنیان اور بلاؤز پہنتی ہیں۔ جوان لڑکے ایک ہی وقت میں کئی کئی لڑکیوں سے دوستی کرتے ہیں اور ماں باپ کے سامنے اتنی بے حیائی کی باتیں کرتے ہیں کہ والدین اپنا منہ پھیر لیتے ہیں یا اپنا سر پھٹ لیتے ہیں۔

لندن میں جوان ہونے والی بے ایشیائی نسلیں ماں باپ کی پسند کی شادی اور ارسنڈ صریح کو تسلیم نہیں کرتیں جس کی وجہ سے بے شمار مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ لندن میں روزنامہ جنگ کے نمائندہ معروف صحافی جناب ظہور نیاز صاحب لکھتے ہیں۔

”بریڈ فورڈ میں پاکستانیوں کی اتنی بڑی تعداد آباد ہے کہ وہ تنہا پاکستان کہلاتا ہے۔ اس کے باوجود پاکستانی برادری اپنے بچوں کے خصوصاً لڑکیوں کے معاملے میں بے حد متشکر

چک اور ذرا سی ترمیم کر دی جائے تو بے شمار انسانی، سماجی اور اخلاقی مسائل حل ہو جائیں گے۔

ایک ہی مسئلے کے کئی فریادی تھے۔ جب اخبارات میں ان کے بیانات شائع ہوئے تو چچا چلا، صرف مسز مونا کا مران ایسی نہیں تھی جو کسی دوسرے کو شوہر بنا کر اپنے شوہر سے ملے لندن آئی تھی۔ اخبارات میں کئی عورتوں نے بیان دیے۔ ان میں سے کچھ نے اپنا نام ظاہر کیا، کچھ اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ یہ عورتیں پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، افغانستان، ایران، ترکی، مصر اور لیبیا جیسے ملکوں سے آئی تھیں اور دہری زندگی گزار رہی تھیں۔ ان کا اپنا شوہر کوئی اور تھا لیکن برطانوی قانون کے کھاتے میں کسی اور کا نام درج تھا۔

مونا نے بیان دیا تھا، ”ہمارے جیسی اور درجنوں عورتیں اس شہر میں ہیں جو اخبارات میں بیان دینے سے گریز کر رہی ہیں۔ میں ان بھائیوں اور بہنوں سے کہتی ہوں، غلطی چھپانے سے کبھی اصلاح نہیں ہوتی۔ ہمیں ایسے عوامل کی نشاندہی کرنا چاہئے جو ہماری غلطیوں کا سبب بنتے ہیں۔ کسی بھی ملک کے میاں بیوی سے ایسی غلطیاں ہو سکتی ہیں کیونکہ وہ انسان ہیں۔ زدئے زمین پر کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں صرف فرشتے بستے ہوں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کسی بھی ملک کا قانون میاں بیوی کو ایک طویل جدائی کی آگ میں جلا کر انہیں اس قدر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ ملنے کے لئے چور دروازے اختیار کرنے لگتے ہیں۔“

اخبارات میں یہاں کے والدین نے جوان لڑکیوں اور لڑکوں نے بھی اپنے بیانات دیئے تھے۔ تمام بیانات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ برطانیہ میں امیگریشن کا موجودہ قانون انسانی حقوق کو پامال کر رہا ہے۔

سینکڑوں طویل اور مختصر بیانات شائع ہوئے تھے۔ اخبارات امیگریشن کے موضوع سے بھرے پڑے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام سے لے کر حکام تک اس جلوس کا چرچا ہونے لگا جو اب شاہراہوں پر نکل آیا تھا۔ جلوس میں شریک ہونے والے ہزاروں افراد تھے۔ ان میں عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے، کبھی شامل تھے۔ سینکڑوں افراد نے اپنے اپنے

نظر آتی ہے۔ پاکستانی مختلف شہروں، علاقوں اور ملکوں میں اس طرح بے ہوشی میں کر باہمی رابطے کا قاعدہ ہے چنانچہ نوجوان لڑکیوں کے لئے رشتے نہیں آتے۔ جو آجاتے ہیں وہ معیار پر پورے نہیں اترتے۔ پھر خاندان، قبیلوں، برادر یوں اور مسلکوں کا قصہ بچ میں آ جاتا ہے۔

یہ بے چارے والدین پاکستان جا کر لڑکا تلاش کرتے ہیں تو برطانوی حکومت اس کی برطانیہ میں آمد روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ امیگریشن حکام انہی کیلبرنس سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کرتے ہیں۔

یہ حکام سمجھتے ہیں کہ پاکستان سے لڑکا آئے گا اور یہاں برطانوی شہریت رکھنے والی پاکستانی لڑکی سے شادی کر لے گا تو پھر قانوناً ہمیں کا ہو جائے گا۔

اگر امیگریشن قوانین سے مجبور ہو کر یہاں کے والدین اپنی لڑکی کو پاکستان لے جا کر کسی لڑکے سے بیاہنا چاہتے ہیں تو لڑکی کو پاکستان کا ماحول پسند نہیں آتا۔ صرف لڑکیاں نہیں لڑکے بھی یہاں شادی کے لئے لائے جائیں تو پاکستانی لڑکیوں کو کمتر سمجھتے ہیں۔ بہت مجبوری شادی کر بھی لی تو لڑکی پاکستانی دلدلا اور لڑکا پاکستانی دولسن کو ہمیشہ احساس کمتری میں جلا رکھتے ہیں۔“

جناب قلمور نیازی صاحب لکھتے ہیں۔ ”میں اکثر والدین کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ وہ معاشی آسودگی کے حصول میں اس قدر منہمک رہے کہ بچوں کو قرآن نماز اور اردو زبان تک نہ سکھا سکے۔ ننھے بچوں کے لئے تو ان دنوں مساجد اور ہفتہ وار تعلیمات کے دوران خصوصی مدرسوں میں قرآن اور اردو کی تعلیم کا انتظام کر دیا گیا ہے لیکن جو جوان ہو چکے ہیں، ان کے لئے اب کیا کیا جاسکتا ہے؟

چنانچہ میں نے والدین اپنے پوتوں اور پوتیوں کے لئے ایسی ماں تلاش کرنا چاہتے ہیں جو انہیں اپنی تہذیب اور تمدن سے روشناس کرا سکے۔ قرآن اور نماز سکھا سکے چنانچہ ایسی ماں کے لئے ان کی نفرس پاکستان کی طرف اٹھتی ہیں۔“

لیکن ایسی ماںیں پاکستان سے حاصل کرنے کے لئے بھی امیگریشن قوانین سے گزرنا پڑتا ہے۔ سارا دار و مدار انہی امیگریشن قوانین پر ہے اگر اس میں ذرا سی نرمی، ذرا سی

ہاتھوں میں پہلے کارڈز اور بڑے بڑے بیڑا اٹھا رکھے تھے۔

ایک بیڑ پر لکھا ہوا تھا۔ ”ہم انسانیت کے نام پر اپیل کرتے ہیں“ انگریزوں نے موجودہ قانون کے ذریعے انسان کو انسان سے اور محبت کو محبت سے الگ نہ کیا جائے۔ ”
مونا جیسی عورتوں نے اپنے اپنے ہاتھوں میں جو پہلے کارڈز اٹھا رکھے تھے۔ ان پر لکھا ہوا تھا۔ ”میاں بیوی لائف پارٹنر (شریک زندگی) ہوتے ہیں۔ انہیں الگ رکھنے کا قانون نہ بناؤ۔“

ایک بیڑ پر لکھا ہوا تھا۔ ”ہم ایشیائی لوگ یہاں کی معیشت پر بوجھ نہیں ہیں۔ ہم انجینئرز، ڈاکٹر ہیں، اکاؤنٹنٹ ہیں۔ یہاں کے بیشتر اداروں میں بہترین منتظم سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں کی لوں اور کارخانوں میں مزدور بھی ہیں اور بہترین کارگر اور ہنرمند بھی۔ ہماری محنت ہماری ہنرمندی، ہماری وفاداری، حکومت برطانیہ کے لئے ہے ہم یہاں کے قانون کا احترام کرتے ہیں۔ پھر قانون ہماری قدریں نہیں کرتا؟“

دنیا میں جہاں کہیں بھی تحریک چلتی ہے، اس سے آواز کرنے کے لئے مخالف قوتیں اپنا زور لگاتی ہیں۔ ایشیائی لوگوں میں ایسے افراد زیادہ تھے جو اس تحریک کے خلاف تھے ان کا کہنا تھا۔ اگر حکومت برطانیہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ کتنے لوگ چور و دروازے سے آتے ہیں اور کتنے لوگ بلینڈ ٹرپ کے بھانے اپنی بیوی سے یا اپنے میاں سے ملاقات کرتے ہیں اور مختلف جہلوں بھانوں سے بیس رہ جانے کی کوششیں کرتے ہیں پھر ریش پائے سے عیاش لوگ تھے جو بظاہر شکشا جیسی بیویوں کے سامنے تو کچھ نہیں بولتے لیکن ان کے پیچھے بھی کوشش ہوتی تھی کہ تحریک کا سیلاب نہ ہونے پائے۔ وہاں ہی بھر کر عیاشی کرنے والے یہ نہیں چاہتے تھے کہ سوسائٹی میں ان کی بدنامی ہو چور و دروازوں سے آنے والے خود کو ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سیاسی پناہ لینے والے بھی اسی بات پر جمبھلا رہے تھے کہ حکومت برطانیہ نے انگریزوں کے سخت قوانین کے مطابق اقدامات کئے تو انہیں مزید سیاسی پناہ نہیں ملے گی۔ انہیں اس ملک سے باہر جانا پڑے گا۔

وہ جلوس نہایت ہی منظم اور پرامن طریقے سے مارچ کرتا ہوا پارلیمنٹ اسٹریٹ تک پہنچا۔ وہیں اچانک اشتعال انگیزی شروع ہو گئی۔ پتا نہیں کہاں سے کس نے کسے

بھڑکا دیا۔ کسی نے ایک پولیس والے پر ایک چھری سے حملہ کر دیا وہیں سے ہنگامہ مچا ہوا۔ دونوں طرف غلطی فنی پیدا ہوئی۔ پولیس والوں نے سمجھا جلوس میں شریک ہونے والوں نے ان کے ساتھ زیادتی میں پہل کی ہے اور جلوس میں شریک ہونے والوں نے یہ سمجھا کہ قانون انہیں جبراً حقوق کا مطالبہ کرنے سے روک رہا ہے۔ اس لئے اب یہ لوگ جلوس کو منتشر کر رہے ہیں۔ اس کے لئے ہر وہ حربہ استعمال کر رہے ہیں جو قانون کے خلاف کرتے آئے ہیں۔

جلوس میں اتحاد اور تنظیم برقرار رکھنے والے پریشان ہو گئے۔ شکشا پائے، فاروق رائفور، مونا اور کتنے ہی سرکردہ افراد اوہر سے اوہر بھاگتے پھر رہے تھے۔ پولیس والوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اپنے لوگوں کو مشتعل ہونے سے باز رکھ رہے تھے لیکن بات بگڑ چکی تھی اس لئے ایسی بھگدڑ مچی کہ کبھی پولیس والے پیچھے ہٹ رہے تھے، کبھی جلوس کے شرکا پیسا ہو رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس والوں کے لئے مزید ملک پہنچ گئی اور جلوس اس طرح منتشر ہوا کہ سب رفتہ رفتہ فرار ہو گئے۔ کوئی وہاں ٹھہر نہ سکا صرف جلوس کے منتظمین رہ گئے تھے۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار ہونے والوں میں مونا اور کامران بھی تھے۔

وہ ہنگامہ دن کے ایک بجے ہوا تھا۔ دو بجے تک وہ لوگ جیل کی سلاخوں کے پیچھے پھنچائے گئے۔ پھر ایک اور تقریر دی۔ لوگ اوہر سے اوہر ٹیلی فون کے ذریعے اطلاعات پہنچاتے رہے کہ جلوس کی قیادت کرنے والے کتنے گرفتار ہوئے ہیں اور ان کی ضمانت کے کیا انتظامات کئے جاسکتے ہیں۔

فاروق رائفور، شکشا پائے اور مونا وغیرہ کی ضمانت لینے کے لئے صرف ایشیائی معززین ہی نہیں، وہاں کے انگریز اعلیٰ عہدیدار اور کچھ سیاسی لوگ آئے آئے۔ شام تک ان کی ضمانت ہو گئی۔ مونا اور کامران کی ضمانت لینے والوں میں ڈاکٹر جان ہنر بھی شامل تھا۔ انہیں ان شرائط پر رہا کیا گیا کہ وہ عدالتی فیصلوں تک لندن کی حدود میں رہیں گے۔ یہاں سے باہر نہیں جائیں گے۔

دوسری شرط یہ تھی کہ گرفتار ہونے والوں میں اگر کوئی خود جلا وطن ہونا پسند

کرسے یا چور دروازے سے آنے والا خود ہی یہاں سے جانا چاہے تو قانون کے خلاف ۱۔
ایئر پورٹ یا بندرگاہ تک لے جائیں گے اور خودی جہاز پر سوار کر دیں گے تاکہ اس ملک
کے قانون کے خلاف کوئی جیسے کرنے والا، جلوس نکالنے والا یا چور دروازے سے آنے والا
نہ رہے۔

مونا وغیرہ نے ایک بار درست کہا تھا۔ یہاں پولیس والے کتنے لوگوں کو گرفتار کر
سکتے ہیں کتنے لوگوں کا عہدہ کر سکتے ہیں۔ ایک دو ہوں، دس ہوں، سینکڑوں ہوں تو شاہ
انہیں جیلوں میں غنوں دیا جائے لیکن ہزاروں کی تعداد میں ہوں تو حکام یہ سوچنے پر مجبور
ہو جاتے ہیں، انہیں نکلنے کا موقع دیا جائے ایسے لوگوں کو گرفتار کئے بغیر، ان پر مقدمہ
چلائے بغیر ان سے چشم پوشی کر کے نجات مل جائے تو بہتر ہے
رضا مراد گھر سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اس نے ریڈیو کے ذریعے خبر سنی کہ ایمگریشن
کے انتہائی جلوس میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ پولس والوں سے تصادم ہوا جس کے نتیجے میں
جلوس کے منتظمین گرفتار کر لئے گئے ہیں۔

گرفتار ہونے والوں کے نام نہیں بتائے گئے تھے لیکن رضا مراد سمجھ گیا، مونا اس
معاے میں پیش پیش تھی۔ یقیناً وہ بھی گرفتار کی گئی ہوگی۔ اس نے فوراً ہی ریسپورڈر اٹھا کر
ڈاکٹر ہنزے سے رابطہ قائم کیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں نے بھی یہ خبر سنی ہے۔ میں بھی یہی سوچ
رہا تھا۔ ابھی جا کر معلوم کر رہا ہوں۔ اگر مونا کو گرفتار کیا گیا ہو گا تو میں ضمانت پر رہا کرانے
کی کوشش کروں گا۔“

”ڈاکٹر ضمانت کے لئے خواہ کتنی ہی رقم کی ضرورت ہو۔ میں اپنا سارا کاروبار داؤ پر
لگا دوں گا لیکن مونا کو رہا ہونا چاہئے۔ میری زندگی بہت تھوڑی ہے۔ میں مرنے سے پہلے
کل رات اس کے ساتھ ڈنر کھانا چاہتا ہوں۔“

ڈاکٹر نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”تمہاری خواہش بھی عجیب ہے۔ اول تو ہم تمہیں مرنے
نہیں دیں گے۔ خدا نخواستہ موت کا وقت آ ہی گیا ہو تو یہ کیا بات ہوئی کہ اس کے ساتھ
ڈنر کھانا لازمی ہے؟“

”ہاں ڈاکٹر! میں سمجھتا ہوں، جسے حاصل نہ کر سکا اس کی روانگی سے پہلے اس کے

ساتھ ایک بار کھانا کھالوں۔ اس طرح میرا دم آسانی سے نکلے گا۔“
”بھئی تمہاری بات سمجھ میں نہیں آئی لیکن امید ہے کہ کل رات تم اپنی خواہش
پوری کر سکو گے وہ تمہارے ذہن میں شریک ہو گی۔ میں اس کی ضمانت کے لئے جا رہا
ہوں۔ اوکے بائی۔“

دوسری طرف سے ریسپورڈر رکھ دیا گیا۔ مراد نے بھی ریسپورڈر رکھتے ہوئے ایک
ہاتھ سے اپنے دل کو تھام لیا۔..... دل کی دھڑکن ست ہو رہی تھی، دل ڈوب رہا تھا۔
وہ چنگ پر بیٹھا ہوا تھا لیکن نیچے ہی نیچے دھوتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے پستی میں دھنسا جا
رہا ہو۔

اسے ایک خیال ستا رہا تھا۔ اگر مونا کو جیل ہو گئی، وہ کل رات کو نہ آ سکی، زندگی
نے ساتھ نہ دیا اور وہ مر گیا تو حسرت دل میں ہی رہ جائے گی۔ ایک بار شکست کھانے کے
بعد وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ دوسری بار شکست دینے والی کو ساتھ لے ڈوبے گا۔ جیسے گا تو
اس کے ساتھ، مرے گا تو اس کے ساتھ۔

اس وقت کالج کے باہر ایک گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ کان لگا کر سننے لگا۔ ڈرا دیے
بھدی کال تیل کی آواز سنائی دی، ٹوکی آیا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کمزوری محسوس کرنے
کے باوجود آہستہ آہستہ چلتے چلتے لگے بھجے بسز کا سمارا لے کر بھی دیوار کا سمارا لے کر بیرونی
دروازے تک پہنچا۔ کال تیل کی آواز پھر سنائی دی تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ باہر
جگ آئی سرلا دیوی نظر آئی۔

وہ اندر آ کر دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے افسوس ہے تمہیں اس حالت
میں آنا پڑا۔ تم میرا سمارا لے کر چل سکتے ہو۔“

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر چلتے لگا۔ اتنی کمزوری محسوس کر رہا تھا کہ سمارا
لے کر چلتے ہوئے بھی ہانپ رہا تھا۔ چنگ کے قریب پہنچ کر۔ دم سا ہو کر بستر پر پڑا۔
تھوڑی دیر تک چاروں شانے چت لیٹا، مری مری سانس لیتا رہا۔ جگ آئی اسے یوں
دیکھ رہی تھی جیسے اس پر ترس آ رہا ہو۔ پھر وہ بولی۔ ”تمہارے اس ملازم نے تمہارے
ساتھ فراڈ کیا ہے۔ کیا تمہاں اس کا جو زہر کے عوض تم سے تین ہزار پونڈ لے گیا ہے؟“

وہ مٹکل خود کشی سے پہلے ہی مر گیا تو یہ انکشاف ہوا کہ کوئی موت کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا اور کوئی موت سے پہلے مر نہیں سکتا۔

وہ پلٹ کر جانے لگی۔ مراد نے کہا۔ ”مٹکل اس کا مطلب کیا ہوا؟“

”میں نے اپنے تجربے کی ایک بات کہہ دی ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ تم بھی کسی تجربے سے گزرنے کے بعد کچھ سیکو۔ دو سروں کا تجربہ بہت کچھ سکھاتا ہے۔ ہم اکثر یہ دیکھتے آئے ہیں کہ انسان قانون قدرت کے خلاف حرکتیں کرتا ہے اور اس کا نتیجہ اس کی توقع کے خلاف ہوتا ہے۔“ زندہ رہنا چاہتے ہیں، موت ہمیں زندہ رہنے نہیں دیتی اور ہم مرنا چاہتے ہیں تو قدرت ہماری موت سے انکار کرتی ہے اور موت بھی ہمیں زندگی سے چیننا نہیں چاہتی۔“

”کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں اپنی پلاننگ کے مطابق اس کے ساتھ مر نہیں سکوں گا؟“

”میں نے کب انکار کیا ہے۔ میری تو پوری کوشش ہو گی۔ اکثر لوگ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتے ہیں کیونکہ قدرت کے فیصلے کے مطابق وہی موت کی گزری ان کے لئے ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری موت موتا اور کارماں کی موت ایک ساتھ لکھی ہو اور کل ایک ساتھ تینوں کی زندگی کا آخری فیصلہ ہو جائے۔“

”ضرور فیصلہ ہو گا اور میری پلاننگ کے مطابق فیصلہ ہو گا۔ اس سے پہلے نہ میں مروں گا نہ موتا اور کارماں کو قانون مجھ سے دور لے جائے گا۔ میں انہیں کل تک اپنے قریب لے آؤں گا اور وہ میرے ساتھ زندگی کا آخری لکھا کھائیں گے میں بیٹھ ٹھکت کھانے کے لئے پیدا نہیں ہوا ہوں۔ یہ میری زندگی کی پہلی اور آخری جیت ہو گی۔“

جب آہنی نے ہاتھ اٹھا کر اسے آگے کھینچے روکتے ہوئے کہا۔ ”تم اگر اسی طرح آندھی اور طوفان کی مانند سوچتے رہے اور بیجان میں جتا ہوتے رہے تو کل تک بولنے کے قابل نہیں رہو گے۔ موتا کے ساتھ مرنا چاہتے ہو تو اپنے اندر کے طوفان کو دبائے رکھنے کی کوشش کرو۔ سہولت سے رہو، سہولت سے سوچو، سہولت سے بولو تاکہ مقررہ وقت تک بیچے رہنے والے ریکارڈ کی طرح کل شام تک بیچے نہ رہو۔“ وہ چلی گئی۔ مراد

اس نے ہانپتے ہوئے حیرانی سے کہا۔ ”کیا وہ زہر نہیں ہے؟“

”بھئی ایک کڑوی سی دوا تھی۔ میں نے اسے پیئیک دیا ہے۔ میں ایسے کھیلوں میں مات نہیں کھاتی۔ خود کشی کو آسان بنانے سے پہلے ہر پہلو کا جائزہ لیتی ہوں۔ اگر میں اس زہر کو چپک نہ کرتی تو تم مجھ پر الزام دیتے کہ میں نے معاہدے کے مطابق اپنا کام نہیں کیا۔“

”مجھے یقین ہے، تم میرا کام ہر حال میں کرو گی۔“

”کیوں نہیں کروں گی۔ کیا زہر حاصل کرنا کوئی مشکل کام ہے۔ تم نے خواہ مخواہ ملازم کو اس معاملے میں ملوث کیا تھا۔“

”مجھ سے ایک غلطی ہو سکتی، اس کا ذکر نہ کرو۔ کام کی باتیں کرو۔“

”میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔ میری مطلوبہ رقم مجھے اپنے پائرنر کے ذریعے مجھے مل گئی ہے۔ جب تم لین دین میں اتنے کھڑے ہو تو میں کب پیچھے رہ سکتی ہوں۔ ہمارے زبانی معاہدے کے مطابق کل تمہارا کام ہو جائے گا۔“

یہ مراد کے دل کی بات تھی اور جو دل کی بات ہوتی ہے وہ حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ ہمارا کو بھی ہسترے اٹھا کر بٹھا دیتی ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جب آہنی نے اسے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آج سے دو برس پہلے تمہارے جیسا ایک مٹکل میرے پاس آیا تھا۔ وہ خود کشی کرنا چاہتا تھا۔ جانتے ہو کیا ہوا؟“

”کیا ہوا؟“

”وہ خود کشی نہ کر سکا۔ اس سے پہلے ہی مر گیا۔ طبعی موت مر گیا۔“

وہ مٹھیاں ہینچ کر بولا۔ ”میں نہیں مروں گا۔ میں کل تک زندہ رہوں گا۔“

”میں تمہارے لئے دعا کروں گی۔“

”تم دعا کرو، میں حوصلہ کرتا ہوں۔ کل مروں گا تو اس کے ساتھ ہی مروں گا۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں۔“

جب آہنی سرلا دیوی نے ایک مہری سانس لی۔ پھر وہاں سے جانے لگی۔ مراد اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دروازے کے پاس بیٹھ کر رک گئی۔ پھر وہاں سے پلٹ کر بولی۔ ”جب میرا

ایسے چپ ہو گیا جیسے اچانک طوفان ختم کیا ہو۔ جگ آگئی کی بات دل کو لگی تھی۔ اسے سہولت سے رہنا چاہئے، سہولت سے سوچنا چاہئے، سہولت سے بولنا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ دیوار کے کان ہوں اور وہ اس کی پلاننگ کو سن کر دوسری دیواروں تک یہ بات پہنچا دے۔

رات کے آٹھ بجے ڈاکٹر جان بنظر اس کے پاس آیا۔ اس نے خبریت، پوچھی۔ مراد نے کہا۔ ”پہلے مونا کی بات کرو۔“

”میں نے ضمانت لے لی ہے۔ وہ کل چلی جائے، یہی بہتر ہے۔ قانون اس کا راستہ نہیں روکے گا نہ ہی اس پر مقدمہ چلے گا۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”اس کا مطلب ہے، وہ کل رات میرے ساتھ کھانا کھائے گی۔“

”تجب ہے صرف تمہارے ساتھ کھانا کھانے کی بات ہے اور تم اس قدر خوش ہو رہے ہو۔ شاید میں تمہاری خوشی کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔“

مراد نے چونک کر پوچھا۔ ”آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟“

”یہی کہ تم نے دل کی گھڑائیوں سے مونا کے ساتھ سمجھوتہ کیا ہے۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتے ہو مگر افسوس۔“

مراد نے بھیر لانی سے پوچھا۔ ”افسوس کس بات کا؟“

”کامران اسے بریٹ فورڈ لے جانا چاہتا تھا۔ آج لے جا کر مونا کو دلہن بنائے گا۔ ان بے چاروں نے شادی پاکستان میں کی، ازدواجی زندگی کی ابتداء یہاں سے کرنا چاہتے تھے لیکن آج گرفتار ہونے والے جتنے افراد ضمانت پر رہائے گئے ان کے ساتھ یہ شرط ہے کہ وہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ لہذا مونا اور کامران بریٹ فورڈ نہیں جاسکیں گے۔ وہ بے چاری آج رات بھر باہل میں رہے گی۔“

”ڈاکٹر! وہ احمق ہیں۔ جب میں انہیں اپنی کار دے سکتا ہوں تو کیا اپنا کالج انہیں ایک رات کے لئے نہیں دے سکتا ہوں تو تیار ہوں، ایک کمرے میں پڑا رہوں گا۔“

دوسرے کمرے میں وہ میاں بیوی.....

ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”مونا ایک اینیٹیل عورت ہے۔ وہ یہ بات نہیں مانے گی۔“

مراد خلا میں نکلنے لگا۔ اس کے کانوں میں شادیانے بج رہے تھے۔ وہ خود کو دہلانا کے ہوش میں دیکھ رہا تھا۔ سناگ کی بیج پر مونا دلہن بنی بیٹی تھی اور وہ گاہک بن کر نہیں ظالم بن کر نہیں، بلکہ دو دلہن بن کر اس کے پاس جا رہا تھا۔

”چھامیں جا رہا ہوں۔“

ڈاکٹر بنظر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس کے خواب اچانک منتشر ہو گئے۔ وہ گھر سے جا رہا تھا۔ مراد چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ذرا دیر میں باہر کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد گاڑی کے اشارت ہونے اور دور جانے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر سنا چھا گیا۔

سنا اس کے آس پاس قلم سنا اس کے دل میں، اس کے دماغ میں تھا۔ جب آدھی کا ضمیر مرجاتا ہے تو اس کے اندر اور باہر جیتے جی مڑوں جیسا سنا چھا جاتا ہے۔

آدھی کسی کی موت پر ضرور روتا ہے لیکن ضمیر کی موت پر کبھی نہیں روتا۔ آدھی کبھی کسی خورے کو زندہ نہیں کر سکتا لیکن اسے یہ قدرت حاصل ہے کہ

مردہ ضمیر کو زندہ کر سکے۔ تجب ہے وہ یہ کیا عمل نہیں کرتا؟

رات ہو گئی، اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ خواب آدھ ختم ہو چکی تھی۔ اگر ہوتی کبھی وہ اسے استعمال نہ کرتا۔ وہ جاگنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے اعمال سے جو فکریں غریب کی تھیں ان میں جلا رہنا چاہتا تھا۔ اسے یہ فکر ستا رہی تھی کہ رات کیسے گزرے گی۔ دن کیسے نکلے گا پھر وہ دن بھی کیسے گزرے گا اور مونا کے ساتھ بیشک کی نیند سونے کا وقت کب آئے گا۔

اسے یہ فکر ستا رہی تھی، اگر مونا کسی وجہ سے نہ آئے یا اس کے ساتھ کھانے سے انکار کر دے۔ کسی بات سے ناراض ہو جائے تو کیا ہو گا؟

اسے یقین نہیں تھا کہ رات گزرے گی۔ کل آئے والی شام ضرور آئے گی، اس کے ساتھ کھانے والی ضرور کھائے گی۔ اسے یقین نہیں تھا، اس لئے وہ بے چین ہو رہا

تھل لٹ جاتا تو کروٹیں بدلتا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ جاتا تو بستر سے اتر کر ٹہلنے رہنے کو ہی چاہتا تھا لیکن ٹہلنے کی ہمت نہیں تھی۔

اس نے ریمپور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ قائم ہونے پر پوچھا۔ ”کیا مونا ہے؟“
”وہ موجود نہیں ہے۔“

”کیا بتا سکتی ہو وہ کہاں گئی ہے کس کے ساتھ گئی ہے؟“

”کہاں گئی ہے یہ نہیں جانتی۔ ہاں شوہر کے ساتھ گئی ہے۔“

اس کے اندر کلہلی سی میچ گئی۔ اس نے پوچھا۔ ”کب تک واپس آئے گی؟“

دوسری طرف سے جواب ملا۔ ”عورت شوہر کے ساتھ جانے کے بعد تینکے نہیں

آتی ہاٹل کیا آئے گی۔ آپ اپنا نام اور پیغام نوٹ کرا دیں۔ ہو سکتا ہے“ وہ آجائے۔“

مراد نے ریمپور رکھ دیا۔ بے چینی اور بڑھ گئی۔ اگرچہ اس نے اپنی کار دے دی

تھی، انہیں کھوٹنے کی آزادی دے دی تھی، اس کے باوجود جانتا تھا، انہیں خاطر خواہ تھالی

نصیب نہیں ہوگی۔ ڈاکٹر کے سامنے اپنی فراخ دلی کا ثبوت پیش کرنے کے لئے کہہ دیا تھا کہ

وہ دونوں اس کالج کے کمرے میں رہ سکتے ہیں اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ مونا اس کالج

میں رات نہیں گزارے گی خواہ شوہر کے ساتھ ہی کیوں نہ گزارنا پڑے۔ وہ انکار کر دے

گی اور ڈاکٹر نے بھی اپنے الفاظ میں اس کی تصدیق کر دی تھی۔

اب اس کے اندر سوالات گونج رہے تھے، ”دور دور سے جیج رہے تھے۔“

رات کو کامران کے ساتھ کہاں گئی ہے؟

ہاٹل نہیں آئی۔ کیا وہ لندن کی سیر کر رہے ہیں۔

رات کے ایک بجے ہی جی میں آیا کہ پھر فون پر مونا سے رابطہ قائم کرے۔ معلوم

کرے وہ ہاٹل آئی ہے یا نہیں؟

لیکن وہ ریمپور کی طرف ہاتھ نہ بڑھا سکا دل میں ایک طرح کا ڈر تھا۔ اگر وہ

نہیں آئی ہوگی تو اضطراب اور بڑھ جائے گا۔ اندر ایسی کلہلی مچے گی کہ غبارہ کی طرح

پھٹ پڑے گا۔ اپنے آپ کو نوٹے کھوٹنے لگے گا اور شاید پاگل ہو جائے گا۔

رات کے دو بج گئے، پھر چار بج گئے۔ پھر صبح ہونے لگی۔ وہ اچانک ہی پاگلوں کی

طرح قہقہے لگانے لگا اور اپنے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”مگر مکی، رات گزر

چکی۔ ان کی رات بھی گزر گئی میری رات بھی گزر گئی۔ وہ دونوں مجھے کلاٹوں کے بستر پر

ملا کر خود چھوٹوں کے بستر پر نہ سو سکے۔“

اچانک اس کے قہقہے رک گئے۔ یکبارگی اس نے سوچا۔ ان فراق کے مہلوں کا کیا

آگہاؤ؟ وہ اپنی اپنی رات بھر جاتے رہے ہوں گے اور جدائی کی آگ میں جلتے رہے

ہوں گے۔ پھر بھی آرام سے ہوں گے لیکن میں کیوں جاتا رہا؟ میں کیوں غریب رہا؟ میں

نہ کیوں چلا اور مرنے رہا؟

سامنے قد آدم آئینے میں اسے اپنا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ داڑھی کچھ اور بڑھ گئی

تھی۔ گل چپک چپکے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنسن گئی تھیں۔ چہرہ یوں زور پڑ گیا جیسے

رات بھر مونا اور کامران مل کر اس کا لونچوڑے رہے ہوں۔ میں مر نہیں سکتا۔ میں شام

تک زندہ رہوں گا۔“

اس نے گھبرا کر کہہ ”نن“ نہیں۔ کوئی میرا لونچوڑے نہیں چھوڑ سکتا۔ میں مر نہیں سکتا۔

میں شام تک زندہ رہوں گا۔“

وہ بستر سے اٹھ گیا۔ لیکن میں جا کر کچھ کھانا چاہتا تھا اپنے اندر توانائی پیدا کرنا چاہتا

تھا لیکن اٹھ کر کھڑے ہوتے ہی سر پھرانے لگا۔ وہ بستر کا سہارا لے کر تھوڑی دیر تک جھکا

کھڑا رہا۔ پھر سیدھا ہو کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے سے باہر آیا۔ وہاں سے چلا ہوا

فریج کے پاس پہنچا۔ اسے کھول کر کھانے کے لئے کچھ نکالا۔ اس نے دو چار تھکے کسی طرح

مٹھی سے اتارے، انہی وقت بیرونی دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ وہ آہستہ آہستہ چلا ہوا

دروازے پر پہنچا۔ اسے کھول کر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ دروازے کے پاس دودھ کی بوتلی

رکھی تھی۔ کوئی دودھ والا بھی وہاں سے گزر رہا تھا۔

وہ چاہتا تھا، ناشتہ کرنے اور دودھ وغیرہ پینے تک شام ہو جائے۔ وقت تیزی سے

گزر جائے۔ جب وہ اپنے بیڈ روم میں واپس آکر بستر پر بیٹھا تو بیڈ نہ سکا چھوٹوں شلے

چٹ ہو گیا۔ بہت زیادہ تھک گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ریمپور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے

رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے کہہ ”میں مونا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز اسے فون

پر بلائیں۔

دوسری طرف سے انتظار کرنے کے لئے کہا گیا۔ وہ بڑی بے چینی سے انتظار کرنا لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایک ایک پل ایک ایک صدی کی طرح گزر رہا ہو۔ پھر کسی کی نواسی آواز سنائی دی۔ ”آپ کون ہیں۔ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟“

”میں مراد ہوں، مونہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں ٹھیکسا پاڑے بول رہی ہوں۔ مونہ سوری ہے۔ رات کے دو بجے آئی تھی۔ تنہی ہوئی ہے۔ اسے جگنا مناسب نہیں ہے۔ کوئی ضروری پیغام ہو تو میں اسے پہنچا دوں گی۔“

”اس سے اتنی ہی کہہ دینا“ میں رات کے کھانے پر انتظار کروں گا۔ ہو سکے تو کامران کے ساتھ شام کو جلد چلی آئے۔“

اس نے ریسور رکھ دیا۔ پھر مراد اصرار دیکھنے لگا۔ جیسے وقت گزارنے اور اپنے آپ کو بھلانے کے لئے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ وہ زیادہ ٹھنکا بھی نہیں چاہتا تھا اور مصروف بھی رہتا چاہتا تھا۔ دن کے ایک بجے اس نے شیوہ کیا، غسل کیا، لباس پہن کر اپنے آپ کو دیکھلے سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ بہت بیمار نظر آ رہا تھا، اس کے بل بوتہ صاف تھرا ہونے کے بعد اگلے لباس میں کچھ ڈھنگ کا لگ رہا تھا۔

دوسرے کو بج آئی ایک عورت کے ساتھ کھانے پکانے کا سامان لے آئی۔ وہ مصروف ہوئی تو مراد کا وقت بھی آسانی سے گزرنے لگا۔ شام کے پانچ بجے مونہ اور کامران پہنچ گئے کامران نے آتے ہی کہہ ”میں اس لئے جلد آیا کہ تم تنہا ہو گے، تمہارا دل بیلے گا۔“

وہ کامران کی باتیں سن رہا تھا اور مونہ کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ آج کے بعد کوئی کئی کو دیکھ نہیں سکے گا۔ اگر موت کے بعد زندگی ملتی ہے تو صرف مجھے اور مونہ کو ملے گی۔ کامران مڑو ہی رہے گا۔

جگ آئی سرلا دیوی نے آکر پہنچا۔ ”مزمز مونہ کامران! آپ کو کون سی ڈش سب سے زیادہ پسند ہے میں ہر طرح کے ہندوستانی کھانے پکائی ہوں۔“

مونہ نے مسکراتے ہوئے کہہ ”جو مل جائے گا کھاؤں گی۔“

”کیا سوٹ ڈش زیادہ پسند ہے؟“

کامران اور مراد نے ایک ساتھ کہہ ”ہاں زیادہ پسند ہے۔“

جگ آئی نے دونوں کو گھور کر کہہ ”میں مونہ سے پوچھ رہی ہوں۔“

کامران نے کہہ ”میں مونہ کے ہی بارے میں کہہ رہا ہوں۔“

مراد نے بھی کہہ ”میں بھی مونہ کی پسند کو سمجھتا ہوں کیوں مونہ کیا یہ لفظ ہے؟“

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”کھانے کے بعد کوئی میٹھی سی چیز کھ لیتا ہمارے مہربان میں ہے۔ اس لئے میں میٹھی ڈش پسند کرتی ہوں۔“

مراد اور جگ آئی نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھلے پھر آئی وہاں سے کچن کی طرف چلی گئی۔ وہ تینوں باتیں کرنے لگے۔ باتوں سے مراد کا دل نہیں بسل رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے تک جاتا تھا۔ دور کچن کی طرف دیکھتا تھا پھر پوچھتا تھا۔ ”کتنی دیر میں کھانا تیار ہو جائے گا۔“

کامران نے کہہ ”تم اتنے بے چین کیوں ہو بھی وقت پر تیار ہو گا۔ ہم کھا کر ہی جائیں گے۔“

وہ پھر کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔ ”میں چاہتا ہوں جلد ہی کھانے سے فارغ ہو کر مونہ کو ذرا اندن کی سیر کراتے ہوئے ایئر پورٹ لے چلیں۔“

ٹھیک آٹھ بجے جگ آئی نے سبز پر کھانا جن دیا۔ کھانے کی خوشبو دوزر تک آ رہی تھی۔ وہ تینوں میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ کامران نے کہہ ”یہاں کبھی کبھی مشرقی کھانا نظر آتا ہے“ تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے پیاسے کو بڑی دعاؤں اور منتوں کے بعد صحرا میں دو گھونٹ پانی مل گیا ہو۔“ جگ آئی نے کہہ ”یہ دو گھونٹ نہیں چار بہترین ڈشیں ہیں۔ اس کے علاوہ میٹھی ڈش ہے اگر اسے کھ لے تو چھوڑو گے نہیں۔ کھاتے ہی چلے جاؤ گے۔“

مراد نے کہہ ”آئی! تمہاری زبان سے تعریفیں سن کر مٹی چاہتا ہے پہلے میٹھی ڈش سے ہی کھانا شروع کریں۔“

”کیا ہرج ہے۔ بیٹے سے ہی سی۔“

کامران نے کلمہ ”لیکن یہ الٹا دستور ہو گا۔ بیٹھا آخر میں کھایا جاتا ہے جیسا کہ مونا نے کہا تھا۔“

مونے نے کلمہ ”بات اصل میں یہ ہے کہ تم مجھے تمام دن گھماتے پھرتے رہے اور خوب کھاتے رہے۔ میرا بیٹ بھرا ہوا ہے۔ مراد صاحب نے اتنے غلصے سے کھانے کا اہتمام کیا ہے۔ نہیں کھاؤں گی تو شکایت ہو گی ورنہ میں صرف بیٹھی ڈش پر اکتفا کرتی ہوں۔“

مراد نے جواباً کلمہ ”لوگ اپنی زندگی میں کتنی ہی ایسی چالیں چلتے ہیں۔ ہم بھی پہلی ڈش کی بجائے آخری ڈش سے کھانا شروع کر سکتے ہیں۔ تم بیٹھا کھاؤ کی تو ہم بھی یہی کھائیں گے بعد میں تمہیں ڈش چک لی جائے گی۔“

جب آئی نے کلمہ ”واہ یہ کوئی بات ہوئی۔ میں نے بڑی محنت سے پکایا ہے۔ تم ایسا کرو، تھوڑا تھوڑا ہر ڈش کو چکھ لو۔ اس کے بعد بیٹھا کھالینا۔“

سب نے جب آئی کے مشورے کو قبول کیا اور تمہیں ڈش چکھنے لگے۔ مراد کن انہیں سے جب آئی کو گھور رہا تھا۔ اس نے بظاہر اس کا مشورہ تسلیم کر لیا تھا لیکن چاہتا تھا جلد ہی تینوں بیٹھی ڈش تک پہنچ جائیں۔ جو ہونی ہے وہ فوراً ہو جائے۔

وہ کب سے اس گھڑی کے انتظار میں تھا۔ وہ گھڑی آئی گئی۔ مونے نے جب بیٹھی ڈش کو ہاتھ لگایا تو مراد کے دماغ میں سنسناہٹ ہی ہونے لگی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مونے کے بعد مراد اور کامران نے بھی اس ڈش سے اپنے لئے چند تھپے لئے اور اسے چکھنا شروع کیا۔ پہلے انہوں نے چکھ کر دیکھا، بیٹھا بڑا لذیذ تھا۔ وہ تعریفیں کرنے لگے۔ مراد نے معنی خیز نظروں سے آئی کو دیکھتے ہوئے کلمہ ”واقعی یہ لاجواب ہے لیکن ہلکی سی کڑواہٹ ہے ایسا کیوں؟“

مونے نے بھی تائید کی۔ ”ہاں ہلکی سی کڑواہٹ ہے مگر ہٹا نہیں کیوں اچھی لگ رہی ہے۔“

جب آئی سرلا دیوی نے ہنسنے ہوئے کلمہ ”میاں بیوی کے درمیان لڑائی نہ ہو ہلکی

سی سختی پیدا نہ ہو تو ازدواجی زندگی کی مجلس میں ملو نہیں آگے۔ یہی ہے تمام سچی اس میں ہے۔“

کامران نے کلمہ ”آئی! آپ نے بڑی مہم سورت بات کہہ دی لیکن ہم اسے بد نصیب ہیں کہ ہماری ازدواجی زندگی میں لڑنے والی ہلکی سی بیٹھی سی، سچی سی نہ ہو سکی۔ اس کا موقع ہی نہیں ملا۔“

مونے نے بیٹھے کا لقمہ بچھ میں لیا۔ پھر کلمہ ”زندگی رہی تو یہ بھی موقع مل جائے گا لیکن زندگی کا کیا مجرور ہے؟“

اس نے زہریلی ڈش کا وہ لقمہ منہ میں رکھ لیا۔ مراد نے خوش ہو کر دیکھا۔ جیسے دنیا جہاں کی خوشیاں مل گئی ہوں۔ پھر اس نے بھی لقمہ منہ میں رکھ لیا۔ وہ کھا رہا تھا مگر مونا کو دیکھا جا رہا تھا کن انہیں سے کبھی کبھی کامران کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ جب مونا ایک بچھ کھاتی تو وہ بھی ایک بچھ منہ میں رکھتا تھا گویا اس کے ہر تھپے کا حساب کر رہا تھا اور اسی حساب کے ساتھ خود کھاتا جا رہا تھا۔ جیسے موت کے آخری سبک میل تک پہنچنے کے لئے مونا کے ساتھ ایک ایک قدم ملا کر چل رہا ہو۔

جتنا بیٹھا انہوں نے اپنی اپنی پلیٹ میں نکالا تھا، اس کے ختم ہونے تک مراد کو پسینہ آنے لگا۔ بیٹھا محسوس ہونے لگی۔ آنکھیں ذرا سی دھندلا رہی تھیں۔ اس نے غور سے مونا کو دیکھا، وہ آٹھن سے اپنے چہرے کو لپوچ رہی تھی گویا اسے بھی پسینہ آ رہا تھا۔ مراد نے کانپتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے بیٹھی ڈش کو قہقہہ لیا۔ پھر اس کے سامنے پیش کرتے ہوئے کلمہ ”تھوڑی سی اور بچھ لو۔“

وہ سنجیدگی سے مسکرائی۔ پھر بولی۔ ”واقعی جب آئی نے کمال کی ڈش تیار کی ہے۔“

کامران نے کلمہ ”بھئی میں تھوڑا اور کھاؤں گا۔“

مونے نے کلمہ ”میں کب انکار کروں گی۔“

وہ ہنسنے لگی، ہنسنے ہنسنے گویا پھر موت کا سامنا کرنے لگے۔ وہ تھوڑا اور کھانا چاہتے تھے لیکن کھانا کوئی سا ہو، اگر لذیذ ہو تو کوئی حد مقرر نہیں ہوتی۔ تھوڑا کہہ کر زیادہ کھا لیا

جاتا ہے۔ یہی حال ان کا تھا۔ ان تینوں نے اپنی پلیٹ میں کچھ زیادہ ہی میٹھا لیا۔ جب آئی نے خالی ڈش اٹھا کر ہونے لگا۔ "میں اور لے آئی ہوں۔"

مونا نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "میں اور نہیں۔"

جب آئی نے فاتحانہ نظروں سے مراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جو چیز زود اثر ہو، اسے زیادہ کھانا ضروری نہیں ہے جتنا کھایا، اتنا ہی کافی ہے یہی ہمیشہ یاد رہے گا۔"

وہ تینوں کھا رہے تھے۔ اب مراد کا ہاتھ ٹاپ رہا تھا۔ وہ بچ سے میٹھا اٹھا کر منہ تک لے تو آتا لیکن صحیح طور پر لقمہ منہ تک نہیں پہنچاتا تھا۔ مونا اور کارمان نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہاری طبیعت پھر خراب ہو رہی ہے؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس میرا دل بھر گیا ہے لیکن تم لوگوں کا ساتھ دے رہا ہوں۔"

مونا نے کہا۔ "کوئی ضروری نہیں ہے ہم نے اپنی پلیٹ میں جتنا نکل لیا ہے، اتنا ضرور کھائیں گے۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کمزوری میں میٹھا زیادہ کھایا جائے تو سر پھرانے لگتا ہے۔"

وہ مراد کو مزید زہر کھانے سے منع کر رہی تھی۔ واقعی اس کا سر پھرا رہا تھا۔ اس نے جیج کو پلیٹ پر رکھ دیا۔ اسے کھاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ کارمان کی پردا نہیں تھی، وہ تو صرف مونا کے ساتھ بیٹھا جتنا تھا۔ جیج نے اس کا ہاتھ مارا تھا۔

جب مونا نے اپنے جیج میں بیٹھے کا آخری لقمہ اٹھا لیا تو وہ ہنسنے لگا۔ مونا اس آخری لقمے کو منہ تک لے جاتے لے جاتے رک گئی۔ حیرانی سے سواہی نظروں سے اسے دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی تھی، اس فنی کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟

وہ ہنسنے ہنسنے ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکل۔ وہ دل کو تمام کر میز پر جھٹکے لگا۔ پھر ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "پلیز میرا ہاتھ تمام لویا اپنا ہاتھ مجھے دو۔"

مونا نے حیرانی سے کچھ پریشان ہو کر کارمان کو دیکھا۔ وہ بھلا اپنا ہاتھ مراد کے ہاتھ میں کیوں دیتی۔ کارمان نے پوچھا۔ "مراد کیا ہے؟ کیا ہم جسے سہارا دے کر بیٹھ رہے ہیں

لے چلیں؟"

"نہیں۔ اب تو ہمیشہ کے لئے سنا ہے اور ابدی نیند کی ابتداء اسی سے ہو گی۔ پلیز، مونا آخری خواہش پوری کر دو۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔ ہم سب آرام سے جا رہے ہیں۔ اس دنیا سے جا رہے ہیں۔"

مونا نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں دھماکے نہیں تمہارے شر سے جا رہی ہوں۔ بہت مجبور ہو کر اپنے کارمان سے جدا ہو رہی ہوں۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "نہیں۔ نہیں۔ ہم دنیا سے جا رہے ہیں۔ میں بتا رہی ہوں۔ بہت زیادہ کمزور ہوں اس لئے زہر مجھ پر جلد اثر انداز ہو رہا ہے۔ تم دونوں صحت مند ہو۔ اس لئے آرام سے رک رک کر، ٹپ ٹپ کر مرنا گھر مجھے اپنا ہاتھ دے دو تاکہ میں آرام سے مر سکوں۔ یہ حسرت تو نہ رہے کہ آخری وقت تم میرے ساتھ نہیں تھیں۔ تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہونا چاہئے پلیز مونا پلیز۔"

مونا گھبرا کر کارمان کو، پھر ایک آئی کو دیکھنے لگی۔ اپنے حلق پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "کیا؟ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیا ہم نے زہر کھلیا ہے؟"

وہ اور کارمان اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کارمان نے کہا۔ "میں نے آئی ایسا نہیں ہو سکتا کھانا تم نے تیار کیا ہے۔ کیا مراد تمہارے پاس بگن میں آیا تھا۔ کیا وہ ایسی کوئی حرکت کر سکتا ہے؟"

مونا دوڑتی ہوئی کارمان کے پاس آئی، پھر اس کے بازو سے لگ کر بولی۔ "ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ ایسا کر سکتا ہے، جب کافی میں خواب آور دوا ملا سکتا ہے تو زہر بھی کھلا سکتا ہے۔ پلیز کارمان۔ فون کرو۔ ہمیں فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت ہے۔"

مراد قہقہہ لگنے لگا لیکن اب اسے افسوس نہیں کہہ سکتے تھے۔ مراد ہی فنی تھی۔ قہقہے کے طور پر کھٹکنا چاہتی تھی لیکن اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ قہقہے رک رہے تھے جس سے آواز آتی تھی۔ پہلے اس کی فنی مرنے سے وہ میز پر اونچا ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیر یوں پھیل گئے جیسے وہ ساری زندگی دوڑتے دوڑتے تھک کر بے دم ہو کر گر پڑا ہو۔ وہ دونوں پھیلے ہوئے بازو گویا دروازے کے لئے پر تول رہے تھے لیکن موت کے ان

دیکھتے ہاتھ ان پردوں کو کھتر رہے تھے۔

چند لمحوں تک گہری خاموشی چھائی رہی۔ پھر کامران اس کی طرف بڑھتا چاہتا تھا لیکن رک گیا۔ جب آئی کہ رہی تھی۔ ”مراد بت ہو چکا۔ اب اٹھ جاؤ۔ نہ تم مرو گے نہ تمہارے مصلحت۔ میں انسان ہوں۔ خود زندہ رہنا چاہتی ہوں اور دوسروں کو زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔“

جب آئی نے دل میں کلمہ ”لیکن تمہیں اس لئے زندہ رکھنا چاہتی ہوں کہ ابھی اور مصلحت حاصل کرنا ہے تم نے جو خود کشی کے سلسلے میں تحریری بیان دیا ہے وہ عدالت تک پہنچ جائے تو اقدام خود کشی کے جرم میں سزا ہو سکتی ہے تمہارے کاروبار کو ضبط کیا جا سکتا ہے اور تمہیں اس ملک سے نکالا جا سکتا ہے۔“

وہ مراد کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نہیں چاہتی کہ تمہیں ارادہ خود کشی کے جرم میں سزا سنائی جائے میں چاہتی ہوں تم زندہ رہو خوش رہو اور اپنے کاروبار کو دن و رات چمکاتی رہتی دو۔“

اس نے دل میں کلمہ ”تمہارا کاروبار زیادہ سے زیادہ منافع بخش ہو گا تو مجھے بھی مصلحت حاصل ہو گی۔ تم مجھے میرا حصہ دینے سے انکار کر دے تو میں تمہارا وہ تحریری بیان قانون کے حوالے کر دوں گی۔“

اس نے مونا اور کامران کو سناتے ہوئے کلمہ ”مراد تم نے پہلے اپنے ملازم سے زہر منگوایا جو زہر نہیں تھا۔ پھر مجھ سے توقع کی کہ میں ان مصلحوں کو تمہارے ساتھ زہر کھلاؤں گی تم خود کشی کر دے گے اور میں ان کی ہلاکت کا سبب بنوں گی۔ میں نادان نہیں ہوں۔ دیکھ لو یہ زندہ ہیں۔“

اس نے دل میں کلمہ ”اور تمہیں بھی زندہ رکھا ہے تاکہ بلیک میل کرتی رہوں۔ میں خود کشی کرنے والوں کی مشکل آسان کرتی ہوں تو میرا طریقہ یہی ہوتا ہے جب وہ تعاقب میں خود کشی کرنے کا اعتراف کرتے ہیں تو چپکے سے ان کی آواز ریکارڈ کرتی ہوں یا ان کا تحریری بیان لیتی ہوں۔ جب میرے منگوں پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ میں دراصل بلیک میلر ہوں تو وہ اپنی جان پر کھیل جاتے ہیں اور جو جان پر کھیلنے سے ڈرتے ہیں وہ

میرے ہاتھوں بلیک میل ہوتے رہتے ہیں۔ تم پر تو دہرا الزام ہے ایک تو خود کشی کرنا چاہتے تھے دوسرے مونا کو اپنے ساتھ مارنا چاہتے تھے۔ مجھے مونا سے دلچسپی نہیں ہے میں تو صرف اپنا منافع دیکھتی ہوں۔“

اس نے پھر زبان سے کلمہ ”مونا عورت ہے۔ میری بیٹی جیسی ہے میں بھلا اسے ہلاک کر سکتی ہوں؟ یہ یہاں سے بغیر پاکستان جانے کی۔ اپنے شوہر کے لئے زندہ رہے گی اور ایک دن یہ دونوں ضرور ملیں گے۔“

مونا اور کامران بڑی عقیدت سے جب آئی کو دیکھ رہے تھے۔ کامران نے کلمہ ”آئی! یو آر گرئٹ“ تم ایک عظیم خاتون ہو۔ آج تم نے میری اور مونا کی جان بچائی ہے۔“

مراد میز پر اسی طرح اونٹ سے منہ ”دونوں بازو پھیلانے پڑا ہوا تھا۔ اس کا دل تقریباً ڈوب چکا تھا۔ دماغ بھی تاریکی میں ڈوب رہا تھا۔ اس کے گلن اس دنیا کی آواز نہیں سن رہے تھے لیکن کچھ مردہ سی آواز کانوں میں آ رہی تھی۔ وہ زندگی اور موت کے درمیان تھا۔ لیکن وہ مر چکے سکا تھا۔ اس نے بھی تو زہر نہیں کھلا تھا۔

کیا اس کی شکست اسے بہت پہلے سے مارتی آ رہی تھی۔ کیا احساس محرومی اسے آہستہ آہستہ قتل کر رہا تھا یا وہ نفسیاتی مریض بہت عرصے سے اندر ہی اندر کھوکھلا ہوتا چلا آ رہا تھا۔ اور اب انتہا کو پہنچ گیا تھا۔

ایسے ہی وقت اسے جب آئی کی دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”مراد میں پہلے ہی تم سے کہ چکی تھی۔ کوئی شخص موت سے پہلے نہیں مر سکتا۔ اور کوئی موت کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا۔ مونا بھی موت سے پہلے کبھی نہیں مرے گی۔“ یہ بات مراد کے کانوں میں دھماکا بن گئی۔ ”مونا موت سے پہلے کبھی نہیں مرے گی؟ مونا نہیں مرے گی؟“

پھر جیسے دیا آخری بار بھڑکتا ہے ”اسی طرح مراد نے بھڑک کر گردن اٹھائی۔ ”مونا نہیں مرے گی؟“

اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کر پھر اس کی گردن دھچک گئی۔

مراد کا دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ کوئی تو اس نے بھی کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔ ایک کامران جیسا دوست تھا اسے بھی دشمن بنا چکا تھا۔ آخر وقت بھی دوستی کا قریب دے کر جان لینے کی کوشش کی تھی۔ ایسے میں بھلا کامران اور مونا اس کی تجویز و تحفین تک کیسے رک سکتے تھے۔ انہوں نے اس کی آخری رسومات کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ انہوں نے ملازمین پر چھوڑ دی۔ مونا پہلے ہی ہاسٹل سے اپنا سامان لے آئی تھی۔ وہاں سے انہوں نے ٹیکسی لی، مراد کی کار اس کے کالج کے سامنے ہی چھوڑ دی۔ پھر ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ وہاں بھی قانونی کارروائیوں میں بڑی دیر ہو گئی چونکہ وہ حیات پر رہا کی گئی تھی اس لئے قانوناً کچھ خاندان پر ہی لازمی تھی۔ مونا نے ضبط نہیں ہو رہا تھا۔ وہ آنسو بھری آنکھوں سے کبھی قانون کے مجاہدوں کو دیکھتی تھی کبھی کامران کو۔ وہ چاہتی تو فرضی کامران کی بیوی بن کر ہو سکتی تھی اور اپنے کامران کے ساتھ زندگی گزار سکتی تھی لیکن اس سے پہلے ہی اس نے حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔ جھوٹ اور فریب سے توبہ کر تھی۔ وہ انگریزوں کے ایک دفتر میں تھی۔ وہاں کے ایک آفیسر کو آنسو بھری

”جو لوگ اپنے ہی ملکوں میں اپنے حقوق حاصل نہیں کر سکتے وہ ہمارے ملک میں اپنے حقوق کی باتیں کیوں کرتے ہیں؟“

”اور منصف اعلیٰ تم ہو کہ ضمیر کی باتیں کرتے ہو“ ضمیر کی باتیں۔ ا ا ا ا ا

پھر چاروں طرف سے قہقہے بلند ہوئے گئے۔ منصف اعلیٰ بے بسی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ انہیں تاریکی سے روشنی میں نہیں لاسکتا تھا۔ وہ ہنسنے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ”ضمیر؟ کیسا ضمیر؟ سرحدی قوانین بنانے والوں کے سینوں میں تو دل نہیں ہو کہ تم ضمیر کی بات کرتے ہو۔“

پھر قہقہے بلند ہوئے گئے۔ قہقہوں کی گونج میں آواز آرہی تھی۔ ”ضمیر مُردہ پاؤ“ ضمیر مُردہ پاؤ، ضمیر کی عدالت کا پانچاٹ کرو۔ اگر یہ ضمیر سرحدوں تک پہنچ گیا تو پھر کسی ملک کی کوئی سرحد نہیں رہے گی۔ ہر جگہ ضمیر روشن رہے گا اور جہاں ضمیر روشن ہو گا وہاں انسانیت رہے گی اور جہاں انسانیت رہے گی وہاں سرحدیں نہیں رہیں گی۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے تک ایک ہی ملک، ایک ہی برادری، ایک ہی انسانیت کے ظہور وار لوگ ہوں گے۔ اس لئے ضمیر مُردہ پاؤ، ضمیر کی عدالت کا پانچاٹ کرو۔ توڑو، پھوڑو، مارو، منصف اعلیٰ کو زندہ نہ چھوڑو۔“

پھر وہاں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ منصف اعلیٰ کے چہرے پر کیلے کے جھلکے، ٹمٹماتے اور گندے اٹلے سے آکر ٹوٹ رہے تھے، بکھر رہے تھے۔ روشن ضمیر کو آلودہ کر رہے تھے اور منصف اعلیٰ کی آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ان آنسوؤں میں منظر وحشتاں رہا تھا۔

مونا کارمران کے بازو سے لگ کر رونے لگی۔ وہ اسے سارا دوسے کر ایئر پورٹ کی عمارت کے اس حصے میں آگیا جہاں اسے جدا ہونا تھا۔ ان کے پاس بولنے کے لئے بہت کچھ تھا لیکن جب کچھ ہو نہیں سکتا تھا تو وہ کیا بولتے۔ پرواز کا وقت ہو رہا تھا۔ کارمران نے صرف اتنا ہی کہا۔ ”میں آؤں گا بہت جلد آؤں گا اور دو لہجیاں کر آؤں گا۔“

وہ جھکیاں لے کے کر رونے لگی۔ اس کے حلق سے چیخیں نکلتا چاہتی تھیں اس لئے دوپٹے کے سرے کو منہ میں ٹھونس لیا۔ فوراً ہی وہاں سے پلٹ کر تیزی سے جانے

پہلے کہہ کر وہ سامنے کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ عدالت کے کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ وہاں بیٹے لوگ کھڑے ہوئے تھے، وہ سب سامنے کی طرح نظر آ رہے تھے کسی کا چہرہ واضح نہیں تھا۔ وہ مُردہ ضمیر کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ منصف اعلیٰ نے اپنے باوقار لہجے میں کہا۔ ”میں ضمیر کی عدالت میں روشنی کا پیاہر ہوں، جو اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہیں انہیں روشنی دیتا ہوں۔ روشن ہو جاؤ، اسے لوگو، روشن ہو جاؤ، اس کو پیٹنے سے بہن کو بھائی سے بچی کو باپ سے اور بیوی کو شوہر سے الگ رکھنا سب سے بڑا جرم ہے۔ ایسا قانون بھی نہ بناؤ جو انسان کو انسان سے الگ کر دیتا ہو۔“

اس کے جواب میں خاموشی رہی۔ وہ تاریکی میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو روشن کرنا چاہتا تھا۔ انہیں روشنی میں لانا چاہتا تھا لیکن وہ بدستور تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس نے پھر قانون کے ہتھوڑے کو میز پر بجاتے ہوئے کہا۔ ”میں خدا کے نام پر انسانیت کے نام پر تمہاری ماؤں بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں کے نام پر التجا کرتا ہوں، اپنے ضمیر کو روشن کرو اور انسان کے لئے انسانی قانون بناؤ۔“

جواب میں اچانک ہی قہقہے بلند ہوئے گئے۔ تاریکی میں جتنے سامنے کھڑے ہوئے تھے، وہ سب قہقہے لگ رہے تھے۔ عدالت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ان کے بے شک قہقہے یوں گونج رہے تھے جیسے وہ منصف اعلیٰ کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ پھر وہ تاریک سامنے کیے بلند دیکر سے پوچھنے لگے۔

”کیسا ضمیر؟“

”کس کا ضمیر؟“

”آج تک کسی بھی سرحد کے اطراف کسی نے ضمیر کی آواز نہیں سنی۔ شاید کسی نے ضمیر کا نام بھی نہیں سنا۔“

”ہاں، نہیں سنا اگر نہ سنا ہے تو اے منصف اعلیٰ جواب دو۔ کیا فلسطینی باشندوں کو اپنے ہی ملک میں آنے، رہنے اور بسنے کی اجازت ہے؟“

”اے منصف اعلیٰ! جواب دو۔ کیا ایک سابقہ پاکستان کے ہمارے لوگو اپنے ہی پاکستان میں آکر آباد ہونے کی قانونی اجازت ہے؟“

گئی۔

پھر وہ جانے والی چلی گئی۔ اس کے آنسو اور آپیں اس کے تصور میں رہ گئے۔
 ”اے ضمیر! یہ اچھی بات ہے کہ تو ایک ہی بار نہیں مرتا۔ کبھی مرتا ہے کبھی زندہ
 ہوتا ہے جب تک انسان کے دم میں دم ہے، جب تک مونا اور کامران کے دم میں دم
 ہے وہ قانون سازوں کے ضمیر کو بیدار کرنے کے جدوجہد کرتے رہیں گے۔“

☆-----☆ ختم شد ☆-----☆